باب 1

اُردو زبان کا آغاز وارتقا

13085CH01

زبان سماجی زندگی میں اظہار وترسیل کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ضروریاتِ زندگی نے زبان پیدا کی۔زبان نے تہذیبی عمل کوایک خاص سمت مہیا کی۔ ہرجغرافیائی علاقے میں کوئی نہ کوئی زبان ضرور پروان چڑھی اسی لیے ایک ہی ملک میں کئی زبانیں اور بولیاں وجود میں آئیں۔ ہندوستان میں چھوٹی بڑی تقریباً 600 زبانیں بولی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کو'زبانوں کا گھر' بھی کہا جاتا ہے۔کوئی بھی زبان یکا یک وجود میں نہیں آتی۔اس کے بننے کے پیچھے صدیوں کا تاریخی اورتہذیبی عمل کارفرما ہوتا ہے۔جس طرح کوئی تہذیب بے میل نہیں ہوتی اسی طرح دنیا کی کسی زبان کو بے میل نہیں کہاجا سکتا۔ اردو زبان بھی مخلوط یا ملی جلی زبان ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان بھی صدیوں میں بنی ہے اوراس کی بناوٹ میں کئی بولیوں اور زبانوں نے حصہ لیا ہے۔آٹھویں صدی عیسوی سے دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی تک جو مسلمان ہندوستان آئے،اُن کا تعلق مختلف علاقوں سے تھا۔ان میں عرب،ایرانی، افغانی اورترکی تھے جن کی زبانیں الگ الگ تھیں۔ایک ہی مذہب کے پیروکار ہونے کے باوجود فکروخیال اور آدابِ زندگی کے لحاظ سے اِن میں کافی فرق تھا۔مسلمانوں کی آمد کے وقت یہاں پراکرت زبانیں بولی جاتی تھیں۔ سنسکرت اعلیٰ طبقے تک محدود ہوگئی تھی۔ پراکرتوں نے عوامی میل جول کی زبان کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں جو پراکرتیں مقامی بولیوں کے طور پر رائج تھیں،انھی نے آگے چل کر ایک یاایک سے زیادہ مستحکم زبانوں کی شکل اختیار کی۔ انھی میں ایک اردو بھی ہے۔

دنیا کی زبانوں کا سب سے بڑا خاندان ہندیورپی خاندان ہے۔اسی ہندیورپی خاندان کی ایک مشرقی شاخ ہندآریائی کہلاتی ہے۔ ہندآریائی کی ارتقائی شکلیں جدید ہندآریائی زبانیں کہلائیں جن میں سے ایک اردو بھی ہے۔ ہندآریائی زبانوں کودرج ذیل ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے:

قدیم ہند آریائی
1500ق م سے 500 تک
وسطی ہند آریائی
500ق م 600ء تک
(پراکرتوں کا زمانہ)
جدید ہند آریائی
600ء سے 1000ء تک
(اپ بھرنشوں کا زمانہ)
ویدک سنسکرت (ہند آریائی کی ابتدائی شکل)
کلاسیکی سنسکرت
پراکتیں (قدرتی زبانیں)
پشاچی
اردھ ماگدھی
ماگدھی
شورسینی
مہاراشٹری
شورسینی اپ بھرنش
مغربی ہندی
کھڑی بولی
بانگڑو ہریانی
برج
بندیلی
قنوجی
اردو
ہندی
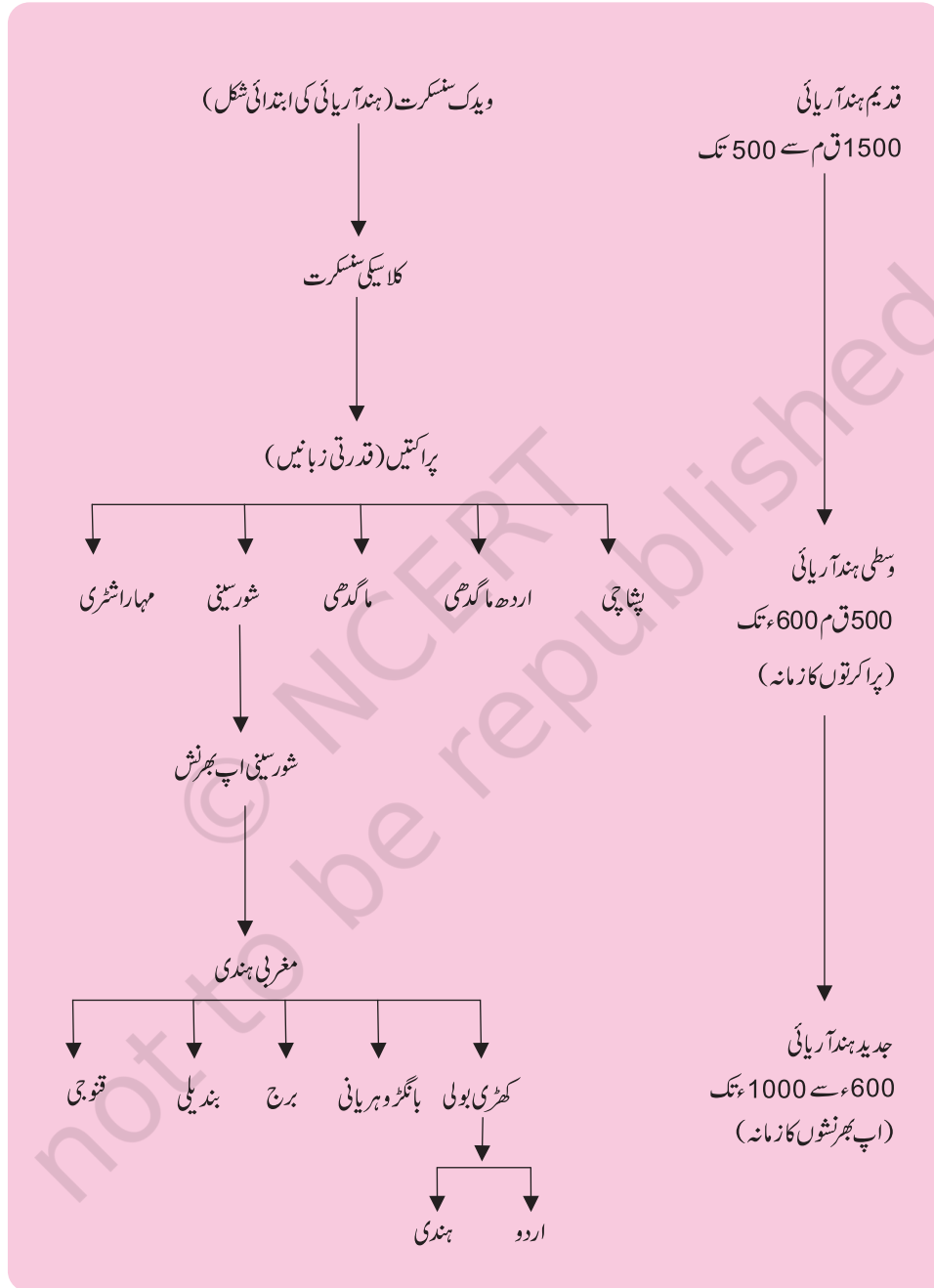
قدیم ہند آریائی کو ویدک اور کلاسک سنسکرت کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وسطی ہند آریائی زبانوں کو پراکرت کے ذیل میں لیا جاتا ہے، جن میں ایک شورسینی بھی تھی۔ شورسینی پراکرت سے شورسینی اَپ بھرنش وجود میں آئی اور اس سے مغربی ہندی نکلی۔ اس مغربی ہندی سے جو زبانیں اور بولیاں پیدا ہوئیں اُن میں ایک کھڑی بولی بھی ہے جو اردو اور ہندی دونوں کا سرچشمہ ہے۔

ہر زبان کا ایک رسمِ خط ہوتا ہے۔ زیادہ تر جدید زبانوں کے رسمِ خط دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ جیسے اردو نے عربی و فارسی رسم خط، ہندی نے ناگری اور یوروپی زبانوں نے رومن رسمِ خط اختیار کیا۔ اسی طرح وہ زبان زندہ کہلاتی ہے جو دوسری بولیوں اور زبانوں کے الفاظ قبول کرتی رہتی ہے۔ اردو ایک ایسی ہی زبان ہے جس میں افعال اور اُن کو برتنے اور بدلنے کے طریقے ہندوستانی ہیں۔ عربی، فارسی اور ترکی کے ان الفاظ کی تعداد زیادہ ہے جو ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی رائج ہیں اور جو عوام میں بھی روزمرّہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری زبانوں سے مراد پنجابی، کشمیری، سندھی، مراٹھی، گجراتی اور بنگالی ہیں۔ پنجابی، کشمیری، سندھی، سرائیکی اور پشتو کا رسمِ خط اردو سے ملتا جلتا ہے۔ پنجابی گورمکھی میں بھی لکھی جاتی ہے۔ رسمِ خط کے فرق کے باوجود اردو اور ہندی کے قواعد کے اصول تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اسی لیے دونوں زبانیں آپس میں بہنیں کہلاتی ہیں۔

یہ سوال بھی اکثر کیا جاتا ہے کہ اردو ہندوستان کے کس علاقے میں پیدا ہوئی؟ زبان کے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ اس نے پنجاب میں جنم لیا کیوں کہ جب دہلی کے اِردگرد اردو اپنی شکل بنا رہی تھی، اسی زمانے میں پنجابی زبان بھی بن رہی تھی۔ بعض لوگوں کا اصرار ہے کہ اردو دکن میں پیدا ہوئی۔ یہ خیال شاید اس لیے پیدا ہوا کہ اردو کا قدیم مذہبی اور ادبی سرمایہ دکنی میں ملتا ہے۔ پہلے یہ خیال بھی عام تھا کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ اب لسانیات کے بیش تر ماہرین کا فیصلہ یہ ہے کہ اردو دہلی اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں بولی جانے والی کھڑی بولی سے نکلی ہے۔ پنجاب سے دہلی کی نہ صرف یہ کہ حدیں ملتی ہیں بلکہ دہلی کا پنجاب والوں سے اور پنجاب سے دہلی والوں کا گھر آنگن کا رشتہ ہے۔ کھڑی بولی کا دوسری بولیوں سے بھی میل جول تھا۔ یہ اثر پنجابی میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

علاءالدین خلجی کے بعد 1327 میں جب محمد بن تغلق نے دکن کی طرف کوچ کیا اور دولت آباد کو دارالسلطنت بنایا، تب بڑی تعداد میں آبادیاں بھی منتقل ہوئیں۔ ان میں دہلی شہر کے عام باشندوں کے علاوہ تاجر، صوفیائے کرام اور فوجی بھی تھے۔ اپنے ضروری ساز و سامان کے علاوہ شمال میں بولی جانے والی کھڑی بولی اور دوسری بولیاں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ اردو ان سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ ایک برس بعد ہی محمد تغلق پھر دہلی لوٹ آیا۔ بہت سے لوگ اس کے ساتھ

واپس آ گئے اور بہت سے وہیں آباد ہو گئے۔ علاوہ اس کے جو صوفیا، تاجر اور فوجی دکن کی طرف سفر کرتے تھے، ان کے لیے سب سے بے خطر راستہ گجرات سے ہو کر جاتا تھا۔ یہ لوگ جہاں جہاں پہنچے، ان کے ساتھ 'اُردو' بھی تھی جسے زبانِ دہلوی بھی کہا جاتا ہے۔ گجرات پہنچ کر اردو کا رشتہ وہاں کی مقامی بولی کے ساتھ قائم ہوا اور وہ 'گُجری' کہلائی۔ جہاں شمال میں برج، اودھی، ہریانی اور پنجابی بولیوں کے ساتھ اس کے لسانی رشتے مضبوط ہوئے، وہیں وہ جنوب کی دوسری مقامی بولیوں کے ساتھ گھل مل گئی۔

اِس امر کی بھی اہمیت ہے کہ جو صوفیائے کرام یا بادشاہ یا فوجی دوسرے ملکوں سے ہندوستان آئے وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے رہن سہن کے طریقوں، ان کی رسومات اور خیالات نے یہاں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا اور یہاں کی تہذیبی زندگی ان کے ذہن و فکر پر اثر انداز ہوئی۔ اس طرح اپنی ملکی یا مادری زبان سے رفتہ رفتہ ان کے رشتے کمزور پڑنے لگے۔ یہاں کی مختلف بولیوں سے مل کر جو زبان بن رہی تھی، اس کو نہ صرف انھوں نے اپنا لیا بلکہ جنوب میں قلی قطب شاہ نے اس زبان میں شاعری کی اور شمال بھاشا میں شاہ عالم ثانی نے برَج بھاشا میں دوہے کہے۔ یہ وہ زبان تھی جس کا رسمِ خط عربی و فارسی تھا لیکن وہ خود ہندوستانی تھی اسی لیے اردو زبان کو کبھی ہندوستانی بھی کہا گیا ہے۔ ہندی، ہندوی اور زبانِ دہلوی کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے، لیکن اب اسے 'اُردو' ہی کہتے ہیں۔

اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں اردو کے ثقافتی اور سماجی اداروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان اداروں میں داستان گوئی، مرثیہ خوانی، مشاعرہ، قوالی، چہار بیت، مجرے اور غزل گائیکی اہم ہیں۔ ان اداروں نے اردو ادب کی حکایتی روایت کو بھی پروان چڑھایا ہے۔

اردو مختلف قوموں کے باہم اختلاط سے پیدا ہوئی۔ مقامی اور باہر سے آنے والی قوموں کے درمیان رابطے کی ضرورت کے لیے ایک ایسی ملی جلی زبان کی ضرورت تھی جو ان کے درمیان ترسیل کا ذریعہ بن سکے۔ اس لیے مقامی زبانوں اور عربی، فارسی، ترکی، پشتو وغیرہ زبانوں کے ملاپ سے اردو کی نشوونما ہوئی۔ خانقاہوں، درباروں اور بازاروں میں اردو کا ارتقا ہوا اور پروان چڑھی۔ اردو والوں کی مختلف ملکوں میں نقل مکانی نے اُسے ہندوستان گیر حیثیت دلائی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی صوبے کی زبان نہ ہو کر پورے ملک کی زبان ہے۔ اردو کو برصغیر ہند و پاک کے بالخصوص سارک ممالک میں رابطے کی زبان بھی کہا جاتا ہے۔

اردو ہندوستان میں بہار، یوپی، دہلی اور ہماچل پردیش کے علاوہ بنگال اور آندھرا پردیش کے مختلف اضلاع کی دوسری سرکاری زبان بھی ہے۔ پاکستان میں یہ پہلی سرکاری زبان ہے اور کشمیر میں بھی اسے یہ مقام حاصل ہے۔ برطانیہ اور خلیجی ممالک میں بھی اردو بولنے والوں کی قابلِ ذکر تعداد موجود ہے۔

باب 2

دکن میں اُردو شعر و ادب

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں دکن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے فروغ میں یہاں کے بادشاہوں نے بھی حصّہ لیا۔ دکن کا ہی ایک بادشاہ قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر بھی ہے۔ دکن کے ایک اہم شاعر ولی دکنی نے اپنی غزل گوئی کے لیے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

پہلے دکن کی حدود میں گجرات، تلنگانہ اور کرناٹک کے علاقے شامل تھے۔ یہاں چار زبانیں گجراتی، مراٹھی، تیلگو اور کنڑ بولی جاتی تھیں۔ اردو زبان سب سے پہلے شمالی ہند سے آنے والے صوفیائے کرام کے ساتھ یہاں پہنچی۔ صوفیائے کرام نے رشد و ہدایت کے سلسلے میں مقامی زبانوں سے میل جول بڑھایا۔ اس میل جول سے ایک نیا لسانی ماحول تیار ہوا۔ دکن پر علاء الدین خلجی کی فتح نے شمال و جنوب کو ایک دھاگے میں پرونے کا کام کیا اور نئے لسانی ماحول کو مزید فروغ حاصل ہوا۔

کچھ ہی عرصے بعد 1327 میں محمد بن تغلق نے ہندوستان کی راجدھانی کو دہلی سے دکن کے علاقے دولت آباد منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ پایۂ تخت کی تبدیلی سے نئے لسانی ماحول کو تیزی کے ساتھ پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد یہاں آ کر بس گئے۔

زبان کے لین دین کا جو عمل صوفیائے کرام سے شروع ہوا تھا، فوجیوں، سپہ سالاروں سے ہوتا ہوا حکّام اور دربار تک پہنچ گیا۔ اگر چہ ایک سال کے بعد ہی دہلی کو دوبارہ راجدھانی بنا دیا گیا۔ تاہم دہلی سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر لوگوں نے وہیں رہائش اختیار کر لی۔ دہلی سے آئی ہوئی زبان پر مقامی اثرات کی وجہ سے اسے آگے چل کر ایک نیا نام 'دکنی' دے دیا گیا جو اردو کی ایک قدیم شکل ہے۔ اسے قدیم اردو کہنا ہی مناسب ہے کیوں کہ افعال اور جملوں کی نحوی ساخت کے اعتبار سے دکنی اور اردو میں کوئی فرق نہیں۔ یوں بھی پورا دکنی سرمایہ فارسی اور اردو کی ادبی روایت کا حصہ ہے۔

بہمنی دور (1347-1495):

دکن میں اردو زبان وادب کے فروغ کے تعلق سے بہمنی سلطنت کا قیام بھی ایک اہم واقعہ ہے۔اس کے دو بڑے نتیجے سامنے آئے: ایک تو یہ کہ حسن گنگو بہمنی نے مرکزی حکومت سے مقابلہ کرنے کے لیے مقامی حمایت کو لازمی سمجھا۔دوسرے یہ کہ بہمنی سلطنت کے علاقے میں تین مقامی زبانیں تیلگو، کنڑ اور تامل بولی جاتی تھیں۔ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے کے بجائے اردو کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی۔اسی سلطنت کے آخری دور کے بادشاہ محمود شاہ بہمنی (دورِ سلطنت: 1482-1520) کے عہد کا ایک شاعر قریشی بیدری ہے، جس کے بارے میں خیال ہے کہ اسی نے قدیم اردو کو دکنی کا نام دیا۔

سو اس شاہ کے دوریں بیدر مقام　　یہ شاعر کیا نظم دکھنی تمام

بہمنی سلطنت کی علم دوستی اور ادب نوازی کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خواجہ حافظ شیرازی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔اس دور میں بہت سے صوفیاے کرام اور شاعروں کے نام ملتے ہیں۔مثلاً شاہ برہان الدین غریب، سید یوسف راجا، امیر حسن سنجری، محمد اکبر حسینی، ملا محمد تقی نظیری، محمد عبداللہ حسینی، فیروز شاہ، مشتاق، لطفی، اشرف، نظامی، سید محمد حسینی گیسودراز وغیرہ۔ان میں بھی نظامی بیدری اور سید محمد حسینی گیسودراز بندہ نواز کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔

خواجہ بندہ نواز گیسودراز (1321-1422): ان کا نام سید محمد حسینی اور تخلص شہباز تھا۔وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں دہلی سے گلبرگہ چلے گئے۔وہ اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے۔عربی فارسی کے علاوہ دکنی میں بھی انھوں نے اپنی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ان میں 'شکار نامہ' اور 'چکی نامہ' اہم ہیں۔

حسن نظامی بیدری: ان کا نام فخرالدین اور تخلص نظامی تھا۔بیدر کے رہنے والے تھے۔ان کی شہرت ان کی ایک مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کی وجہ سے ہے۔اس مثنوی کو اردو کی پہلی مثنوی کہا جاتا ہے۔کدم راؤ پدم راؤ اس مثنوی کے مرکزی کردار ہیں۔کدم راؤ راجا ہے اور پدم راؤ اس کا وزیر۔یہ ایک راجا کی کہانی ہے جو عورت کی وفاداری پر شک کر کے سنیاس لے لیتا ہے۔بعد میں ایک جوگی سے دھوکا کھا کر اپنی سابقہ حالت پر لوٹ آتا ہے اور ہنسی خوشی زندگی گزارتا ہے۔

بہمنی سلطنت کے بطن سے پانچ نئی سلطنتیں عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی، برید شاہی اور عماد شاہی وجود میں آئیں۔ان میں عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں نے اردو زبان وادب کی ترقی میں بڑا حصہ لیا۔

عادل شاہی دور (1686-1490) :

بیجاپور میں عادل شاہی سلطنت کا قیام 1490 میں ہوا۔ یہ حکومت تقریباً ایک سو پچانوے سال تک قائم رہی۔ عادل شاہی بادشاہوں نے نہ صرف شعروادب کی سرپرستی کی بلکہ وہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ اس حکومت کا بانی یوسف عادل شاہ ترکی اور فارسی میں شعر کہتا تھا۔ ایک اور بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو 'جگت گرو' کے نام سے شہرت ملی۔ اگرچہ شروع میں عادل شاہیوں نے شمالی ہند کے درباروں کی نقل کی اور فارسی زبان کا بول بالا رہا لیکن اس دور میں ہند ایرانی تہذیب کے سنگم کو علوم وفنون کے ہر شعبے میں کافی فروغ حاصل ہوا۔ اردو زبان وادب پر اس تہذیبی امتزاج کے اثرات مرتب ہوئے۔

بیجاپور میں کئی شاعروں اور ادیبوں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں عبدل، میراں جی شمس العشاق، اشرف بیابانی، برہان الدین جانم، شاہ داوَل، ملک خوشنود، رستمی، مقیمی، حسن شوقی، صنعتی، علی عادل شاہ ثانی شاہی، نصرتی، امین الدین اعلیٰ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

میراں جی شمس العشاق (1496-1407) : میراں جی شمس العشاق مشہور صوفی بزرگ تھے۔ ان کا تعلق خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے سلسلے سے تھا۔ انھوں نے اردو میں تصوف کے مضامین کو بیان کرنے کی روایت ڈالی۔ ان کی تصنیفات میں 'خوش نامہ'، 'خوش نغز'، 'شہادت الحقیقت'، 'شہادت التحقیق' اور 'مغزِ مرغوب' کے علاوہ نثر میں 'شرح مرغوب القلوب' اور رسالہ 'سبع صفات' شامل ہیں۔

اشرف بیابانی (1528-1459): ان کا نام سید شاہ اشرف بیابانی تھا۔ وہ اپنے زمانے کے ایک مشہور بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے والد سید شاہ ضیاء الدین رفاعی بیابانی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہ صوفی تھے اور شاعر بھی۔ ان کی تصانیف میں 'لازم المبتدی'، 'واحد باری' اور 'نوسرہار' اہم ہیں۔ نوسرہار مثنوی ہے اور اس کا موضوع کربلا کا واقعہ ہے۔ اس کی اہمیت زبان وبیان کے اعتبار سے مسلّم ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (1627-1580) : ابراہیم عادل شاہ ثانی عادل شاہی سلطنت کے تیسرے بادشاہ تھے۔ وہ فارسی اور دکنی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ مصوری اور موسیقی سے بھی انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ ان کی مشہور تصنیف 'کتابِ نورس' یا 'نورس نامہ' ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر راگ راگنیوں سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں ابراہیم عادل شاہ نے راگ راگنیوں پر مبنی خود اپنے گیت شامل کیے ہیں۔ سترہ راگوں کے تحت کُل 59 گیت اور سترہ دوہے شامل ہیں

اور ہر گیت کا موضوع مختلف ہے۔اس کے بیشتر گیت ہندو دیو مالا کے قصّوں سے بھرے ہوئے ہیں۔عشقیہ واردات اور کیفیات کی تصویر کشی کرنے میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کو کمال حاصل تھا۔

شاہ امین الدین اعلیٰ (1674-1599): ان کا شمار دکن کے مشہور بزرگوں میں ہوتا ہے۔ وہ برہان الدین جانم کے بیٹے تھے۔انھوں نے اپنے مریدوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے رسائل لکھے اور شعر بھی کہے۔'وجود نامہ'، 'چکی نامہ'، 'وصل نامہ'، 'محبت نامہ'، 'نور نامہ'، 'نظم وجودیہ'، 'رموز السالکین'، 'گنجِ مخفی'، 'رموز العارفین' وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔

علی عادل شاہ ثانی شاؔہی (1762-1628) : محمد عادل شاہ کے جانشین علی عادل شاہ ثانی شاؔہی بلند پایہ شاعر تھے۔ شاعری کے علاوہ خطّاطی، موسیقی، مصوری اور فن سپہ گری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف شاعروں اور عالموں کی قدر دانی کی بلکہ خود بھی زیادہ تر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔'کلیاتِ شاہی' کے نام سے ان کا کلام شائع ہو چکا ہے، جس میں قصائد، مثنوی، غزلیات، چار در چار، کبت اور فارسی کلام اور قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔

شاہی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں مقامی اور ملکی عناصر کو بہ طورِ خاص اہمیت دی ہے۔ان کے کلام کا پورا پس منظر ہندوستانی ہے۔نسوانی حسن اور مناظرِ قدرت کی دل فریب عکاسی میں انھیں مہارت حاصل تھی۔

شاؔہی نے ہر صنف سخن میں اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔قصائد میں نصرؔتی کے بعد ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ان کی غزلوں میں عشقیہ تجربات کے ساتھ ترنم اور غنائیت بھی پائی جاتی ہے۔

عبدل : ان کے نام کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ایک روایت کے مطابق ان کا نام عبداللہ تھا جب کہ دوسری روایت میں ان کا نام عبدالغنی بتایا گیا ہے۔عبدل، ابراہیم عادل شاہ ثانی (دورِ حکومت: 1627-1580) کے درباری شاعر تھے۔ان کی مشہور تصنیف 'ابراہیم نامہ' ہے، جسے بیجاپور کا پہلا ادبی کارنامہ کہا جاتا ہے۔ یہ بادشاہِ وقت کا قصیدہ ہے۔ 'ابراہیم نامہ' اپنے دور کے سماجی، اخلاقی اور مجلسی حالات و واقعات کی آئینہ داری کے لیے مشہور ہے۔

شاہ برہان الدین جانم : شاہ برہان الدین، میراں جی شمس العشاق کے بیٹے اور خلیفہ تھے۔انھوں نے تصوف کے مضامین کو موضوع بنایا۔ان کے مشہور رسائل 'ارشاد نامہ'، 'حجت البقا'، 'وصیت الہادی'، 'سکھ سہیلا' اور 'پنج گنج' وغیرہ

ہیں۔ 'کلمتہ الحقائق' اور 'وجودیہ' ان کی نثری تصنیفات ہیں۔ جانم نے عام طور پر ہندی بحریں استعمال کی ہیں۔ انھوں نے اسلامی تصوف کی تشریح کے لیے ہندو فلسفے کی اصطلاحوں کو نہایت خوبی سے استعمال کیا ہے۔

ملک خوشنود : ان کا تعلق اصلاً گولکنڈہ سے تھا۔ بعد میں بیجاپور چلے گئے اور وہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی دو مثنویاں 'جنت سنگار' اور 'بازارِ حسن' ملتی ہیں۔ جنت سنگار، امیر خسرو کی فارسی مثنوی 'ہشت بہشت' اور 'بازارِ حسن' انھیں کی 'یوسف زلیخا' کا دکنی ترجمہ ہے۔

رستمی : ان کا نام کمال خاں تھا۔ وہ عادل شاہی دربار سے وابستہ تھے۔ رستمی بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور قصیدے بھی۔ رستمی کی شہرت ان کے ترجمے کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے ایک فارسی مثنوی 'خاور نامہ' کا دکنی میں ترجمہ بھی کیا تھا جو چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں دو سو بائیس عنوانات کے تحت حضرت علیؓ کی جنگی فتوحات کا بیان ہے۔

شوقی : ان کا نام حسن تھا اور شوقی تخلص کرتے تھے۔ ان کا تعلق دکن کے تین درباروں عادل شاہی، قطب شاہی، اور نظام شاہی سے تھا۔ عمر کا بڑا حصّہ نظام شاہی حکومت میں گذرا۔ اپنی زندگی کے آخری ایّام میں وہ عادل شاہی سلطنت سے وابستہ ہوگئے تھے۔ انھوں نے شاعری میں بڑا نام پیدا کیا۔ 'فتح نامۂ نظام شاہ' اور 'میزبانی نامہ' ان کی دو مثنویاں ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ دکنی ادب کی تاریخ میں حسن شوقی کی بڑی اہمیت ان معنوں میں بھی ہے کہ انھوں نے ولؔی سے قبل صنفِ غزل کو مقبولِ خاص و عام بنایا۔ ان کا کلام 'دیوانِ حسن شوقی' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

مقیمی : مقیمی ابراہیم عادل شاہ کے زمانے کے مشہور شاعر ہیں۔ انھوں نے مثنوی 'چندر بدن و مہیار' لکھی جو عادل شاہی دور کی پہلی عشقیہ مثنوی مانی جاتی ہے۔ اس کا شمار اپنے دور کی مقبول مثنویوں میں ہوتا ہے۔ اس کہانی میں عشق کی عظمت کا بیان ہے جو پریم مارگی تصورات سے بہت قریب ہے۔

صنعتی : ان کا نام محمد ابراہیم خاں تھا۔ وہ سلطان محمد عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی دو مثنویاں 'قصۂ بے نظیر' (1645) اور 'گلدستہ' بہت مشہور ہوئیں۔ 'قصۂ بے نظیر' کا ایک نام 'قصۂ تمیم انصاری' بھی ہے۔ اس میں ایک صحابی تمیم انصاریؓ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس مثنوی سے طلسمات اور عجائبات سے متعلق مثنویوں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔ صنعتی کو بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔

نصرتی : ان کا نام شیخ نصرت تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت شاہی محل میں ہوئی تھی جس سے ان کی شاعرانہ صلاحیتیں خوب چمکیں وہ اپنے دور کے سب سے اہم شاعر مانے جاتے ہیں۔ علی عادل شاہ ثانی شاہؔی نے انھیں ملک الشعرا کا خطاب

عطا کیا تھا۔ ان کی مثنویاں اردو کی بہترین رزمیہ مثنویاں کہی جاتی ہیں۔ ان کی تین مثنویاں 'گلشنِ عشق'، 'علی نامہ' اور 'تاریخِ اِسکندری' دستیاب ہیں۔ 'علی نامہ' علی عادل شاہ کی منظوم سوانح عمری ہے۔ اس میں نصرتی کے قصائد بھی شامل ہیں۔ 'گلشنِ عشق' میں علی عادل شاہ کی مختلف جنگوں کا ذکر ہے۔ 'تاریخ اسکندری' بھی رزمیہ مثنوی ہے اور اس میں سکندر عادل شاہ کے انتقال پر مرہٹوں اور عادل شاہی فوج کے درمیان لڑائی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ نصرتی کو قدرتی مناظر کی عکاسی اور جنگ وجدل کے معرکوں کی تفصیل پیش کرنے میں بڑی مہارت تھی۔

قطب شاہی دور (1495-1690):

گولکنڈہ میں قطب شاہی حکومت 1508 سے 1686 تک قائم رہی۔ گولکنڈہ کا علاقہ حیدرآباد، آندھرا پردیش اور موجودہ مہاراشٹر کے بعض علاقوں پر مشتمل تھا۔ یہاں کی قطب شاہی حکومت اور دہلی کی مغل سلطنت میں نسلی اور تہذیبی یگانگت دکھائی دیتی ہے۔ اتفاق سے دونوں کے استحکام کا زمانہ بھی ایک تھا۔ اکبر کی طرح ابراہیم اور محمد قلی قطب شاہ نے بھی مقامی سطح پر تہذیبی یگانگت اور باہمی روابط کو فروغ دینے کی کوشش کی۔

گولکنڈہ کے ادبی ذخیرے نے بیجاپور کی ادبی روایت میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ یہ جہت عشق وعبادت کی ہے۔ اس دور میں بھی شاعروں اور ادیبوں کے کئی نام ملتے ہیں جن میں سے چند اہم نام یہ ہیں۔ محمودؔ، فیروزؔ، محمد قلی قطب شاہ، اسداللہ وجہیؔ، عبداللہ قطب شاہ، غواصیؔ، ابن نشاطیؔ اور قاضی محمود بحریؔ۔

محمود : محمود قطب شاہی حکومت کے ابتدائی زمانے کے شاعر تھے۔ ان کا ذکر وجہیؔ اور محمد قلی نے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ محمودؔ کی غزلیں، مرثیے اور دوہرے مختلف بیاضوں میں ملتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فارسی اور مقامی زبان کی لفظیات کا خوش گوار امتزاج ملتا ہے۔ جو بعد میں آنے والے شعرا کے لیے غزل کے میدان میں نئی راہیں ہموار کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوا۔

فیروز : ان کا نام قطب الدین یا قطب دین قادری تھا۔ ان کا شمار بیدر کے مشہور شاعروں اور گولکنڈہ کے بڑے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کی مشہور تصنیف 'پرت نامہ' ہے جس میں انھوں نے اپنے پیرومرشد کی تعریف وتوصیف کی ہے۔ ان کا طرزِ بیان رواں اور بے ساختہ ہے۔

ملاّ وجہی (1659-1562): ان کا نام اسداللہ تھا۔ ان کے آبا و اجداد خُراسان سے آکر دکن میں بس گئے تھے۔ وجہی وہیں پیدا ہوئے۔ انھوں نے قطب شاہی خاندان کے چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ وہ فارسی اور دکنی دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ قطب مشتری ان کی مشہور مثنوی ہے جس میں انھوں نے قلی قطب شاہ اور مشتری کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔ یہ مثنوی اندازِ بیان، تشبیہات و استعارات اور تاثیر کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔

وجہی کی نثری تصنیف 'سب رس' اردو کی پہلی نثری داستان ہے جو 1635 میں لکھی گئی۔ اس کا موضوع تصوف اور اسلوب تمثیلی ہے۔

قلی قطب شاہ (1611-1565) : اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ معانؔی، قطب شاہی خاندان کے پانچویں حکمراں تھے۔ وہ مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے ہم عصر اور حیدرآباد شہر کے بانی تھے۔ 47 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ قلی قطب شاہ کا اردو کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں سبھی اصناف کے نمونے موجود ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایرانی شاعری کے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا اور اس میں ہندوستانی فکر و احساس اور تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی۔ ان دونوں حیثیتوں سے محمد قلی قطب شاہ کا کلام سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نائیکہ بھید اور شرنگار رس کی نزاکتوں سے واقف تھے۔ انھوں نے عورت کو ہر روپ میں پیش کیا ہے۔ فارسی تلمیحات کے ساتھ ساتھ ہندو دیو مالا اور ہندوستانی تلمیحات اور استعارے بھی خوب استعمال کیے ہیں۔

عبداللہ قطب شاہ : انھوں نے اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کی ادبی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ فنونِ لطیفہ اور شعر و ادب کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ انھوں نے بھی شاعری میں کمال دکھایا ہے۔ ان کے کلام میں راگ رنگ کی محفلوں کی خوب صورت عکّاسی ملتی ہے۔

غواصؔی : غواصی قطب شاہی دور کے اہم شاعر تھے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ نے انھیں ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا تھا۔ وہ سفیر کے عہدے پر بھی فائز رہے تھے۔ ان کی تین مثنویاں 'مینا ستونتی'، 'سیف الملوک و بدیع الجمال' اور 'طوطی نامہ' بہت مشہور ہوئیں۔ غزل، قصیدے، رباعی اور مرثیے پر مشتمل ان کا دیوان بھی موجود ہے۔ حسن و عشق کا موضوع

ان کا خاص میدان ہے۔ غواصی کی تینوں مثنویاں عشقیہ ہیں لیکن عشقیہ قصے مختلف انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ ان قصوں کے پیچھے اخلاق اور معاشرت کے آئین وآداب بھی تمثیلی پیرایے میں نظم کیے گئے ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی غواصی نے اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔

ابنِ نشاطی : ان کا نام شیخ محمد مظہر الدین تھا۔ وہ عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی مثنوی پھول بن، بہت مشہور ہوئی۔ پھول بن فارسی قصہ ’بساتین الانس‘ کا دکنی ترجمہ ہے۔ اس میں عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں بھی اشعار لکھے گئے ہیں۔ نشاطی کی یہ مثنوی لفظی اور معنوی خوبیوں سے پُر ہے۔

بحرؔی (وفات 1717) : ان کا نام قاضی محمود اور تخلص بحرؔی تھا۔ وہ ایک معروف صوفی بزرگ تھے۔ ’من لگن‘ ان کی مشہور مثنوی ہے۔ اس میں تصوف کے مضامین دل نشیں حکایتوں کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے ’من لگن‘، بلند پایہ مثنوی ہے۔ ان کی دوسری مثنوی ’بھنگ آب نامہ‘ بھی موجود ہے۔ بحری نے غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں شگفتگی روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔

دکن میں اردو ادب کی جو روایت عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں قائم ہوئی، ان حکومتوں کے خاتمے کے بعد اس میں مزید ترقی ہوئی اور دو بڑے نام ولؔی اور سراؔج سامنے آئے جن سے دکن اور شمال کی تفریق ختم ہوگئی۔

ولی دکنی (1668-1707) : ان کا نام ولی محمد تھا۔ ان کے آبا و اجداد گجرات میں مقیم تھے۔ وہاں سے ہجرت کر کے وہ دکن کی طرف آئے اور وہیں بس گئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ولی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ شاہ وجیہ الدین گجراتی کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد اپنے پیش رو دکن کے دوسرے شعرا کے برخلاف صنف غزل کی طرف زیادہ توجہ کی اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس صنف کو بہت جلد بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ ولؔی نے فارسی غزل کے مضامین اور تشبیہات و استعارات سے اپنی غزل کو آراستہ کیا جس کی بدولت غزل میں ایک نئی روایت کا آغاز ہوا۔

جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا اور اس کے بعد وہ 1700 میں خود یہاں آئے تو اہل دہلی نے ان کی اور ان کے کلام کی بڑی قدر کی۔ ولی کے دہلی آنے سے قبل بھی اردو میں طبع آزمائی کی جاتی تھی لیکن عام طور پر لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ ولی کی شگفتہ وخوش آہنگ غزلوں نے دہلی کے شعرا کا دل موہ لیا اور وہ بھی اسی راہ پر چل پڑے۔ یہیں سے اردو شاعری کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ ان کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں :

مفلسی سب بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے
دل کو گر مرتبہ ہو درپن کا مفت ہے دیکھنا سریجن کا
جب میری خبر لینے وہ صیّاد نہ آیا شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

سراؔج اورنگ آبادی (1712-1764) : ان کا نام سید شاہ سراج الدین حسینی اور تخلص سراؔج تھا۔ ان کے آباواجداد میرٹھ کے رہنے والے تھے، لیکن وہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ سراؔج پر ہمیشہ جذب و کیف کا ایک عالم طاری رہتا تھا۔ اسی عالم میں وہ شعر بھی کہتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے کلام میں جذب اور سرمستی کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

یار کوں بے حجاب دیکھا ہوں میں سمجھتا ہوں خواب دیکھا ہوں
دو رنگی خوب نئیں یک رنگ ہو جا سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا
خبرِ تحیّرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

وؔلی اور سراؔج کے بعد شمالی ہند میں اردو شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

باب 3

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا ابتدائی دور

اردو کا آغاز وارتقا مختلف مقامات پر مختلف ناموں سے ہوا۔ دہلی، پنجاب، سندھ اور دکن ہر جگہ کی اپنی تاریخی روایات ہیں۔ مختلف ادوار میں یہ زبان 'ہندوی'، 'ہندی'، 'دکنی'، 'ریختہ'، 'اردوے معلّٰی'، وغیرہ ناموں سے موسوم ہوئی۔ ہماری زبان کی تاریخ کا اہم واقعہ یہ ہے کہ شمالی ہند ہی اس کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور نقطۂ عروج بھی۔ مسعود سعد سلمان سے امیر خسؔرو تک، ولؔی سے آرزؔو تک، مرزا مظہر جان جاناںؔ اور شاہ حاتؔم سے میؔر وسوداؔ تک، پھر عہدِ غالبؔ اور داغؔ دہلوی تک اردو میں ادب کی تخلیق کا سفر بہت دل چسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ اِس ذیل میں شمالی ہند بالخصوص دہلی میں اردو ادب کے آغاز سے عہدِ میؔر تک مختلف اسالیب و اصناف کے بتدریج ارتقا کی خاص اہمیت ہے۔

جب مغلیہ سلطنت عروج پر تھی اور فارسی کا بول بالا تھا، فارسی کے بڑے بڑے شاعر دہلی کی رونق میں اضافہ کر رہے تھے۔ پھر وہ دور بھی آیا جب فارسی میں شعر کہنے والوں نے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ خان آرزؔو اور ان کے معاصرین ایسے ہی لوگ تھے۔ پھر وقت بدلا۔ رفتہ رفتہ اردو میں شعر گوئی کا رواج عام ہوا۔

دہلی میں ولؔی دکنی کی آمد سے قبل جعفر زٹلؔی، عبدالجلیل اٹلؔ اور محمد عطاء اللہ عطاؔ وغیرہ کا شمار دہلی کے ان شعرا میں ہوتا ہے جو اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان میں جعفر زٹلؔی کا نام نمایاں ہے۔

ولؔی دکنی 1700 میں دہلی آئے۔ دکن میں اردو ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔ وہاں اردو میں شعر کہنا فخر کی بات تھی۔ اسی فخر کے ساتھ ولؔی نے دہلی میں شعر سنائے اور داد وصول کی۔ اُن کی آمد اور ان کے اشعار نے دہلی والوں کو احساس دلایا کہ اس عوامی زبان میں بھی اچھے شعر کہے جا سکتے ہیں۔

امیر خسرو (1325-1208/09): ان کا نام ابوالحسن تھا۔ ان کی پیدائش ایٹہ (کاشی نگر) ضلع کے قصبے پٹیالی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام امیر سیف الدین تھا۔ خسرو کی کم سنی ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کے بعد خسرو کی پرورش ان کے نانا عماد الملک نے کی جو بادشاہ بلبن کے عہدِ حکومت میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ اس طرح ابتداے عمر ہی سے خسرو کا تعلق شاہی دربار سے ہوگیا۔ وہ دہلی کے چھے بادشاہوں سے وابستہ رہے۔ جلال الدین خلجی نے انھیں امیر کا خطاب دیا تھا۔

خسرو نے کئی جنگی مہمات میں بھی حصہ لیا۔ غیاث الدین تغلق کے ساتھ وہ بنگال کی مہم میں تھے کہ اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کی وفات کی خبر سنی۔ اس خبر سے وہ بہت غم زدہ ہوئے اور کچھ عرصے بعد ہی ان کی وفات ہو گئی۔

خسرو فارسی کے اعلیٰ پایے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی میں بھی ماہر تھے۔ ان سے متعدّد تصانیف یادگار ہیں۔ خسرو نے اپنے دیوان 'غُرّۃ الکمال' کے دیباچے میں اطلاع دی ہے کہ عربی اور فارسی کے علاوہ ان کا ایک دیوان ہندوی یعنی قدیم اردو میں بھی تھا۔ یہ دیوان اب ناپید ہے۔ ہندوی کلام کے نام پر خسرو سے بہت سی پہیلیاں، انمل فقرے، دوسخنے اور ڈھکوسلے وغیرہ بھی منسوب کیے جاتے ہیں۔ وہ قوالی کے موجد تھے۔

افضل نارنولوی (و۔ 1625/26) : عام طور پر ان کا نام افضل تخلص افضلؔ اور وطن پانی پت بتایا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر عبدالغفّار شکیل کی تحقیق سے اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ان کا اصل نام گوپال، تخلص افضل اور وطن نارنول، ضلع مہندر گڑھ (ہریانہ) تھا۔ ان کی ولادت کا زمانہ متعین نہیں۔ سالِ وفات شعرائے فارسی کے ایک تذکرے میں 1035 ہجری (1625/26 عیسوی) بتایا گیا ہے۔ اردو اور فارسی کے خوش گو شاعر تھے۔ ان کا پیشہ معلّمی تھا اور شاگردوں کی تعداد کافی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ افضل نے ایک مندر میں رہائش اختیار کر لی تھی اور وہیں ہندوستانی علوم پر بھی عبور حاصل کیا۔

بارہ ماسا شاعری کی ایک قدیم صنف ہے جس میں معشوقہ اپنے عاشق سے جدائی کا حال، مہینوں اور موسموں کی مناسبت سے بیان کرتی ہے۔ افضل نے ابتدائی اردو میں ایک بارہ ماسا 'بکٹ کہانی' کے نام سے لکھا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ 'بکٹ' کے معنی کٹھن ہوتے ہیں جس کی مناسبت سے عشق میں جدائی کے کٹھن حالات کا ذکر بارہ ماسے میں کیا جاتا ہے۔ 'بکٹ کہانی' کھڑی بولی اور برج بھاشا سے متاثر ہے۔

زٹلی (1713-1659) : ان کا نام مرزا محمد جعفر تھا۔ ہجو گوئی کی وجہ سے جعفر زٹلی کہلاتے تھے۔ وطن نارنول تھا۔ اپنے زمانے کے مروجہ علوم و فنون سے خوب واقف تھے۔ شاعری میں اٹل نارنولی کے شاگرد تھے۔ وہ دکن میں اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ کام بخش کے سواروں میں شامل تھے۔ بعد میں انھوں نے یہ ملازمت چھوڑ دی تھی۔ فرخ سیر جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو انھوں نے اس کے سکّے کے لیے ایک ہجویہ شعر کہا۔ اس جرم پر فرخ سیر نے انھیں قتل کرا دیا۔

جعفر زٹلی بڑے تیز مزاج اور حاضر جواب تھے اور انھوں نے احتجاجی شاعری بھی کی ہے اسی لیے اپنی ہجویات میں وہ پھکڑّ پن اور گالیوں پر اتر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عام طور پر اخلاقی اقدار اور ان کے زوال کو موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بے شمار نئے الفاظ اور ترکیبیں وضع کی ہیں۔ چند اشعار دیکھیے :

محمّد پار اُتارن ہار سب کا	محمّد سرور و سالار سب کا
بیا جعفرؔ! توکّل پر قدم رکھ	خدا کی یاد دل میں دم بہ دم رکھ
سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر	بادشاہِ تسمہ کش فرّخ سیر

ایہام گوئی کا دور:

شمالی ہند میں اردو شاعری کا پہلا دور محمد شاہی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دور کی تہذیبی زندگی پر تکلف اور تصنّع کا رجحان غالب تھا۔ مجلس آرائی اور خارجی شان و شوکت اس عہد کی پہچان بن گئی۔ ظاہری چمک دمک نے حقائق کو دھندلا دیا تھا۔ شاعری میں سادگی اور بے تکلفی کی جگہ لفظی صناعی نے لے لی تھی۔ ذو معنی الفاظ کے استعمال نے حقیقی جذبوں کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ نتیجے کے طور پر اس دور میں ایہام گوئی کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

ایہام شاعری میں ایسے ذو معنی الفاظ کے استعمال سے عبارت ہے جن کے ایک معنی قریب کے ہوں اور دوسرے بعید کے۔ اس طرح معنوی فریب دے کر شعر کو دل کش بنانے کا یہ ایک انداز تھا۔ صنعتِ ایہام کے اس چلن نے شاعری میں فن کی صورت اختیار کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ شمالی ہند کے اس دور کے ایہام گو شعرا نے یہ اثر ولیؔ سے اخذ کیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف ولیؔ ہی کے کلام میں صنعتِ ایہام کی مثالیں نہیں ملتیں، ان کے پیش رو صائبؔ اور بیدلؔ جیسے فارسی شعرا نے بھی ایہام سے مضمون آفرینی کا کام لیا تھا۔ سنسکرت شاعری اور برج بھاشا کے دوہوں میں صنعتِ ایہام کا استعمال خاص التزام کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے جس کے اثرات دکنی شعرا کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ یہ وہ پس منظر ہے جس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس دور کے شعرا کو متاثر کیا جس کے نتیجے میں ایہام گوئی کو فروغ حاصل ہوا۔

آبروؔ (1683/85-1733) : ان کا نام نجم الدین اور عرف شاہ مبارک تھا۔ گوالیار کے مشہور صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مزاجاً وہ ایک صوفی منش انسان تھے۔ گوالیار سے ہجرت کر کے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ شمالی ہند کے دورِ اوّل کے شعرا میں ان کا ایک ممتاز مقام ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ اپنے دور کے عام رجحان کے مطابق آبرو کے کلام میں جا بہ جا ایہام کے اشعار ملتے ہیں مگر اس کے علاوہ دوسری خوبیاں بھی موجود ہیں۔ دہلوی زبان کی سادگی اور ہندی آمیز لب و لہجے کے فطری اظہار نے ان کے اشعار کو پُر اثر بنا دیا ہے۔

آبرو نے 'آرائشِ معشوق' کے نام سے ایک مختصر مثنوی بھی لکھی ہے۔ اس کے علاوہ سلام، مرثیے اور کئی نظمیں بھی ان سے یادگار ہیں۔ ان کے چند اشعار دیکھیے :

چلتا ہے اب تلک ترے مکھڑے پہ رشک سے	ہر چند ہو گیا ہے چمن کا چراغ گل
پھرتے تھے دشت دشت دِوانے کدھر گئے	وہ عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے
ملنے کے شوق میں ہم گھر بار سب گنوایا	مدّت میں گھر ہمارے آیا تو گھر نہ پایا

آرزؔو (1687/88-1756): ان کا نام سراج الدین علی خاں تھا۔ آرزؔو کا شمار اپنے عہد کے فارسی کے مشہور شعرا میں ہوتا ہے۔ ولؔی کے اثر سے انھوں نے بھی ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ آرزو دہلی میں اردو کی ادبی روایت کے پہلے دور کے سب سے اہم اور ممتاز شاعر ہیں۔ انھوں نے شمالی ہند کے شعرا کی پہلی نسل کے بہت سے ایسے شاعروں کی تربیت کی جو ریختہ میں شعر کہنے کی طرف مائل ہوئے۔

خان آرزؔو کے علم وفن، ذہانت، شیریں کلامی، حاضر جوابی وحاضر دماغی کا ذکر بہت جگہ ملتا ہے۔ وہ شاعر، عالم، اور لغت نویس بھی تھے۔ فارسی زبان میں 'سراج اللغہ'، اور 'نوادر الالفاظ' ان کی مشہور لغات ہیں۔

ہر صبح آوتا ہے تیری برابری کو	کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشیدِ خاوری کو
داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل	ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے
اس زلفِ سیہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے	آئینے کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے

مضموؔن (1689-1734/35) : ان کا نام شرف الدین تھا۔ ان کا تعلق بابا فرید گنج شکر کے خاندان سے تھا۔ آگرے میں پیدا ہوئے۔ نوعمری ہی میں دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ مضموؔن، خان آرزو کے شاگرد تھے۔ ان کے دانت وقت سے پہلے گر گئے تھے۔ اسی بنا پر ان کا منھ پوپلا ہو گیا تھا۔ اس لیے خاں آرزؔو انھیں شاعرِ بے دانہ کہا کرتے تھے۔ وہ کم گو شاعر تھے۔ ان کے کلام میں ایہام کے باوجود شگفتگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج	ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج
دردِ دل سے جس طرح بیمار اٹھتا ہے کراہ	اس طرح اک شعر مضموں بھی کہے ہے گاہ گاہ
چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے	کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

شاکر ناجی (1690-1747) : ان کا نام محمد شاکر ناجی تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ پیشہ سپہ گری تھا۔ کلام میں صنائع بدائع کی کثرت ہے۔ اس دور کے دیگر شعرا کی طرح ایہام گوئی شاکر ناجؔی کے کلام کی بھی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ غزل کے علاوہ رباعی، قصیدہ، مرثیہ، قطعات وغیرہ میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ غزل کی ہیئت کے علاوہ مربع کی ہیئت میں بھی مرثیے لکھے ہیں۔

ریختہ ناجؔی کا ہے محکم اساس	بات میری بانیِ ایہام ہے

تجھ کو کیوں کر جدا کروں اے جاں   زندگانی بہت ہی پیاری ہے
خیال چھوڑ کہ دنیا ہے خواب کی مانند   تمام خوبی ہے اس کی سراب کی مانند

فائز دہلوی (1690/91-1738) : ان کا نام نواب صدرالدین محمد خاں تھا۔ وہ صاحب علم اور صاحبِ ثروت تھے۔ ولی سے بہت متاثر تھے اور اکثر ان ہی کی زمین میں شعر کہتے تھے۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کی واردات کا ذکر ہوا ہے۔ ان کے مطبوعہ دیوان میں صرف بتیس غزلیں ہیں، باقی منظومات ہیں۔ ان میں ہندوستانی عناصر پائے جاتے ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں وہ جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں دہلی کا بار بار ذکر کیا ہے اور خود کو دہلوی کہا ہے۔ ایہام ان کے یہاں بہت کم ہے لیکن صنعتوں کا استعمال فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ فارسی نثر میں بھی ان کی کتابیں ملتی ہیں۔

دیکھ کر تجھ نین کی شوخی کوں   تھک کے صحرا نشیں غزال ہوا
پل پل مٹک کے دیکھے ڈگ ڈگ چلے لٹک کے   وہ شوخ چھل چھبیلا طنّاز ہے سراپا
غمزہ نگہ، تغافل انکھیاں سیاہ و چنچل   یارب نظر نہ لاگے انداز ہے سراپا

انجام (و- 1746) : ان کا نام امیر خاں اور لقب عمدۃ الملک تھا۔ انجام، محمد شاہ کے عہد (1719-1748) میں صوبے دار تھے۔ وہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن انھیں اردو زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے ریختی، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں بھی لکھی ہیں۔ روانی اور بے ساختگی ان کے کلام کا خاص وصف ہے۔

نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے   کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی
دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم   پر ترستے ہی رہے بس ایک پیمانے کو ہم
قفس کے بیچ بلبل نے تڑپھ کر جی دیا اپنا   کسو بے درد نے شاید کہا ہوگا بہار آئی

یکرنگ (و۔ 1737/49) : ان کا نام غلام مصطفےٰ خاں تھا۔ یکرنگ محمد شاہ کے منصب دار اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کے کلام میں بھی ایہام تو ہے مگر وہ شدّت نہیں جو اس زمانے کے دوسرے شعرا کے یہاں ہے۔ یکرنگ کے یہاں زبان کی فصاحت اور مضامین کی تازگی پائی جاتی ہے۔

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے   دل سے صبر و قرار جاتا ہے
کیا جانیے وصال ترا ہو کسے نصیب   ہم تو ترے فراق میں اے یار مرگئے

ردِعمل اور اصلاحِ زبان :

ایہام گوئی مخصوص تہذیبی عوامل کا نتیجہ تھی۔ اب حالات نے نئی کروٹ لی۔ محمد شاہ کے دورِ حکومت میں نادر شاہ نے 1739 میں دہلی میں قتل عام کا بازار گرم کیا۔ الم ناکی کا یہ وہ دور تھا جس سے ہر کوئی دوچار تھا۔ ان حالات کا اثر فکر و ذہن اور ذوق و شوق پر پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ایہام کا اثر زائل ہونے لگا اور اس کے خلاف ردِعمل شروع ہوا۔ لسانی شعور میں ایک نئی تبدیلی واقع ہوئی۔ ادبی روایت میں اس تبدیلی کو 'اصلاحِ زبان' کی تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے 'سادہ گوئی' یا 'تازہ گوئی' کی تحریک بھی کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کے اثر سے اردو شاعری میں فارسی شاعری کے اسالیب اور تراکیب کا چلن بڑھنے لگا۔

مرزا مظہر جانِ جاناں (1699/1700-1781) : ان کا نام مرزا مظہر تھا۔ ان کا شمار اپنے دور کے بلند پایہ صوفی بزرگوں میں ہوتا ہے۔ وہ عربی و فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ مزاج میں بلا کی شائستگی تھی۔

مرزا جانِ جاناں شعر میں صنعت گری کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے ایہام گوئی سے نہ صرف پرہیز کیا بلکہ اس کے خلاف فضا بھی ہموار کی۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کی کوششوں سے اردو شاعری میں سادگی کا رجحان بڑھا اور اصلاحِ زبان کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس لیے ان کے ذریعے شروع کی گئی اس تحریک کو 'سادہ گوئی' یا 'تازہ گوئی' کی تحریک بھی کہا جاتا ہے۔

اپنے دور کے دیگر شعرا کی طرح مرزا مظہر جانِ جاناں بھی بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے مگر انھوں نے اردو میں بھی شعر کہے۔ ان کا کوئی دیوان تو نہیں ملتا البتہ مختلف تذکروں میں ان کا اردو کلام بکھرا ہوا ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ میں ان کا نام اردو شاعر سے زیادہ اس دور کی اردو شاعری پر ان کے گہرے اثرات کی وجہ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

چلی اب گُل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا	نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے	اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
کون کہتا ہے مر گیا مظہر	فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

حاتمؔ (1699-1783) : ان کا نام ظہور الدین اور حاتمؔ تخلص تھا۔ نواب امیر خاں انجامؔ کی سرکار میں ملازم تھے۔ ان کا شمار اپنے عہد کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ابتدا میں وہ ایہام گوئی کی طرف مائل تھے لیکن جب مرزا مظہر جانِ جاناں نے اصلاحِ زبان کی تحریک شروع کی تو انھوں نے براہِ راست اس تحریک کا اثر قبول کیا اور بہت جلد ایہام گوئی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ انھوں نے ازسرِ نو اپنے کلام کا انتخاب 'دیوان زادہ' (56-1755) کے نام سے کیا اور اپنے پرانے ضخیم دیوان

کومسترد کردیا۔غزل کے علاوہ حاتم نے شہرِ آشوب بھی لکھے ہیں جس میں ان کے عہد کے سیاسی، معاشرتی و تہذیبی حالات کی مرقع کشی کی گئی ہے۔انھوں نے 'واسوخت' بھی لکھے اور دیگر مروجہ اصناف میں بھی شعر کہے۔

ہجر کی زندگی سے موت بھلی کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

خواب میں تھے جب تلک تھا دل میں دنیا کا خیال کھل گئی جب آنکھ تو دیکھا کہ سب افسانہ تھا

مدّت سے خواب میں بھی نہیں نیند کا خیال حیرت میں ہوں کہ کس کا مجھے انتظار ہے

فغاںؔ (1725/26-1772/73) : ان کا نام اشرف علی خاں تھا۔فغاںؔ نوجوانی کے زمانے ہی سے شعرگوئی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔اس فن میں اتنا کمال پیدا کرلیا تھا کہ اپنے عہد کے ممتاز شاعروں میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔وہ پھبتیاں کہنے کے لیے بھی مشہور تھے۔اپنی ظرافت اور خوش مزاجی کے سبب اکثر نوابین و امرا کے درباروں میں مقبول رہے۔

فغاںؔ کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ قطعات، رباعیاں، مخمس وغیرہ بھی موجود ہیں۔انھوں نے قصیدے، مثنویاں اور ہجویات بھی کہی ہیں۔اپنے معاصر شعرا کے برخلاف ان کی شاعری فارسی سے زیادہ متاثر ہے۔زبان و بیان کا حسن اور لب و لہجے کی ہمواری فغاں کے کلام کی خاص خوبی ہے۔

کباب ہوگیا آخر کو کچھ بُرا نہ ہوا عجب یہ دل ہے جلا بھی تو بے مزا نہ ہوا

اس کے وصال و ہجر میں یوں ہی گزر گئی دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے گویا مرا چمن میں کبھی آشیاں نہ تھا

باب 4

میرؔ کا عہد

دورِ ایہام گوئی کے بعد ردِعمل کی تحریک کے اثر سے اردو شاعری میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا جسے میرؔ و مرزاؔ کا دور کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ 'اردو شاعری کا سنہرا' دور ہے۔ اس زمانے میں سیاسی نظام کمزور پڑ رہا تھا۔ نادر شاہ کے حملے کے شدید اثرات نے زندگی کا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی کی یہ پرچھائیاں اس دور کی شاعری میں نمایاں ہیں۔

سوداؔ (1706/07-1780/81) : ان کا نام مرزا محمد رفیع تھا۔ ان کے والد شیخ محمد شفیع کابل سے بہ غرضِ تجارت ہندوستان آئے تھے۔ یہیں سوداؔ کی ولادت ہوئی۔ سودا کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی معاشی زندگی کا آغاز فوج میں ملازمت سے کیا۔ پھر اسے ترک کر کے مختلف امرا کے درباروں سے وابستگی اختیار کی۔ دہلی کی تباہی کے بعد سودا پہلے فرخ آباد پہنچے۔ پھر فیض آباد پہنچ کر شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ آصف الدولہ نے جب اپنا دارالسلطنت لکھنؤ منتقل کیا تو سودا بھی ان کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔

سودا کا اصل میدان قصیدہ ہے لیکن وہ اپنے عہد کے ممتاز غزل گو بھی ہیں۔ اُن کی غزلوں میں بلند آہنگی اور نشاط و سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً چند شعر درج ذیل ہیں:

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا — موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

کیفیّتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

قصیدے میں سوداؔ کی قادر الکلامی کا اندازہ ان کے ان قصائد سے لگایا جا سکتا ہے جو مشکل زمینوں میں لکھے گئے ہیں۔ قدرتِ کلام اور مختلف علوم سے واقفیت کے سبب سودا کے قصیدے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ زورِ بیان، شوکتِ الفاظ، بلند آہنگی اور زبان پر بے پناہ قدرت اُن کے قصائد کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان کے ہجویہ قصائد بھی قابلِ ذکر ہیں۔

سودا نے صنف مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان مثنویات میں بھی مدح اور ہجو کا پہلو غالب ہے۔

فنِ مرثیہ گوئی میں بھی سودا کے کارنامے قابل قدر ہیں۔مرثیے کے لیے مسدس کی ہیئت کا استعمال بھی سب سے پہلے سوؔدا ہی نے کیا ہے۔

اثؔر دہلوی (1720/35-1794/95) : ان کا نام سیّد **محمد میر** تھا۔ وہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی اور چہیتے مرید تھے۔اثؔر کی تربیت بھی دردؔ کے زیرِ سایہ ہوئی۔ دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے بہت لگاؤ تھا۔دردؔ کی طرح اثر بھی صاحبِ علم و فضل اور درویش صفت انسان تھے۔خواجہ میر دردؔ کے بعد وہی ان کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔انھوں نے غزل کے مقابلے میں مثنوی میں زیادہ شہرت پائی۔ان کی زبان سادہ اور پرتاثیر ہے۔

لوگ کہتے ہیں یار آتا ہے دل تجھے اعتبار آتا ہے

کون سنتا ہے یاں کسو کی بات بس اثؔر قِصّہ مختصر کیجیے

حال اپنا کسو سے کیا کہیے ایک دل تھا سو وہ بھی کھو بیٹھے

دردؔ دہلوی (1721–1785) : ان کا نام سید **خواجہ میر** تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ باپ کی طرف سے خواجہ بہاء الدین نقشبند اور ماں کی طرف سے سیّد عبدالقادر جیلانی سے سلسلۂ نسب رکھتے ہیں۔ درد کی پرورش مذہبی اور صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی۔انھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ وہ قرآن و حدیث کے علاوہ فقہ اور تصوف کے مسائل پر بھی نظر رکھتے تھے۔دردؔ نے جوانی کے دور میں ہی درویشی اختیار کر لی تھی اور سلسلۂ نقشبندیہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔فکر و خیال یا سیرت و عمل کے اعتبار سے ان کی پوری زندگی پاکیزگی کی مثال تھی۔ وہ اخلاقی اعتبار سے بھی بڑی دل کش شخصیت کے مالک تھے۔ان کے مزاج میں صبر و ضبط، توکّل و قناعت پسندی شامل تھی۔

صوفیانہ شاعری میں دردؔ کا ایک ممتاز مقام ہے۔انھوں نے اردو شاعری میں اس روایت کو سب سے زیادہ فروغ دیا اور فکری بنیاد فراہم کی۔ان کی تصانیف میں فارسی اور اردو دیوان کے علاوہ 'علم الکتاب'، 'واردات'، 'اسرار الصلوٰۃ'، 'نالۂ درد'، 'آہِ سرد' اور 'درد دِل'، وغیرہ شامل ہیں۔اردو دیوان میں تقریباً پندرہ سو اشعار ہیں۔ درد کے کلام میں سادگی اور روانی کے ساتھ پاکیزگی اور گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔ چھوٹی بحروں میں انھوں نے عمدہ غزلیں کہی ہیں۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وائے ناکامی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سوز (1721-1798/99) : ان کا نام **سیّد محمد میر** تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ تلاشِ معاش میں دہلی سے فرخ آباد گئے۔ آخرِ عمر میں فیض آباد میں قیام رہا اور وہیں وفات پائی۔ سوز بھی سودا کے شاگردوں میں تھے۔ شروع میں ان کا تخلص میر تھا۔ بعد میں سوز تخلص اختیار کیا۔ میر سوز کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ وہ شگفتہ مزاج تھے۔ تواضع اور توکّل بھی ان کے مزاج کا حصّہ تھا۔ میر سوز کے کلام میں اگرچہ گہرائی نہیں لیکن زبان کا لطف بہت ہے۔ سوز کے کلام کو لکھنوی رنگ کا اوّلین نمونہ بھی کہا گیا ہے۔ ان کے کلام میں فارسیت برائے نام ہے۔ ان کی زبان روزمرّہ اور محاورے سے سجی ہوئی ہے۔

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یا رب رازِ دل اُن پر بھی ظاہر ہو گیا

ایک آفت سے تو مرمر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

یہ ٹھنڈی سانس ہر دم کس سے سیکھی کیا ہوا تم کو
بھلا ہم سے کہو تم طالبِ دیدار کس کے ہو

قائم (1722/25-1793/94) : ان کا نام **محمد قیام الدین** تھا۔ قائم چاند پور، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے مگر بچپن ہی سے اپنے بڑے بھائی منعم کے پاس دہلی میں رہے۔ تلاشِ معاش کے سلسلے سے دہلی کے علاوہ ٹانڈہ (ضلع بریلی) لکھنؤ اور رام پور میں بھی ان کا قیام رہا۔ آخر رامپور میں انھوں نے وفات پائی۔ وہ اپنے عہد کے ایک اہم اور ممتاز شاعر تھے۔ قائم کے ہاں بھی ہجونگاری میں شدّت کا پہلو غالب ہے۔ درد اور سودا ان کے استاد تھے۔ سودا کی طرح غزل، قصیدہ اور ہجو کے علاوہ انھوں نے مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ فارسی نثر میں ان کا تذکرہ 'مخزنِ نکات' بھی قابل ذکر ہے۔ ریختہ میں شعر گوئی کی روایت کے فروغ میں قائم نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

میں وہ اسیرِ قفس ہوں کہ عمر بھر جس نے
نہ سیر باغ کی، نے رؤئے آشیاں دیکھا

قسمت تو دیکھ، ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دوٗر اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

میرؔ (1723/24-1810) : ان کا نام میر محمد تقی تھا۔ میرؔ کی پیدائش اکبرآباد (آگرہ) میں ہوئی۔ ابھی دس گیارہ برس کے تھے کہ اُن کے والد میر متقی کا انتقال ہو گیا۔ تلاشِ معاش کے لیے میرؔ کو کم عمری ہی میں دہلی آنا پڑا۔ ابتدا میں اپنے سوتیلے ماموں خان آرزوؔ کے یہاں قیام کیا۔ خان آرزوؔ کا شمار اُس وقت کے اہم اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ میرؔ نے اُن سے کافی استفادہ کیا۔

میرؔ نے دہلی کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ نادرشاہ کا حملہ زیادہ تباہ کُن ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ دہلی پر کئی بیرونی حملے ہوئے۔ ان حملوں نے دہلی کے امرا اور رؤسا کو ہلا کے رکھ دیا۔ بیشتر اہلِ کمال دہلی کی سکونت ترک کر کے دوسرے علاقوں کی طرف نکل گئے۔ لکھنؤ میں اُس وقت نواب آصف الدولہ اہلِ فن کی پذیرائی کر رہے تھے۔ اس وجہ سے لکھنؤ صاحبانِ کمال کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ میرؔ بھی نواب آصف الدولہ کی دعوت پر 1781 میں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ زندگی کے بقیہ ایّام انھوں نے وہیں گزارے اور وہیں وفات پائی۔

میرؔ کی زبان سادہ، دلکش اور شگفتہ ہے۔ غزل ان کی پسندیدہ صنفِ سخن تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صنف کے اساتذہ میں وہ آج بھی سرفہرست ہیں۔ غزلوں کے علاوہ انھوں نے مثنویاں، مرثیے، قطعات، رباعیاں، مثلث، واسوخت، مخمس، مسدّس سبھی اصناف اور اسالیب میں اپنے آثار چھوڑے ہیں۔ اسی لیے اُنھیں 'خدائے سخن' کہا جاتا ہے۔ اردو کے چھے دیوان کے علاوہ ایک فارسی دیوان بھی ان سے یادگار ہے۔ فارسی نثر میں خودنوشت سوانح 'ذکرِ میر' اور تذکرہ 'نکات الشعرا' بھی اُن کی اہم تصانیف ہیں۔

میرؔ نے اپنی غزلوں میں آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا ہے۔ زبان کی سادگی، صداقت، جذبات کی شدّت اور احساسات کی تصویر کشی ان کی غزلوں کی اہم خصوصیات ہیں۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے — پھول کھلے ہیں، پات ہرے ہیں، کم کم بادوباراں ہے

دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

پاس ناموسِ عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے	یعنی آگے چلیں گے دَم لے کر
مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ	کیا دِوانے نے موت پائی ہے

یقینؔ (1727-1755) : ان کا نام انعام اللہ خاں تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کی تربیت سے ان کے جوہر کھلے۔ ان کی غزل میں دہلی کی زبان اور محاورے کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ کلام میں فارسیت کے باوجود بول چال کی زبان کا رنگ نمایاں ہے۔

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پوچھوں	کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزہ بھی ہے
مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالوں نے	نہیں معلوم میرے بعد ویرانے پہ کیا گزری
تری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ	یہ اتنا کارِ آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

جعفرعلی حسرتؔ (1734/35-1785/86) : جعفرعلی حسرتؔ کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ اپنے دور کے رواج کے مطابق حسرتؔ نے مختلف علوم کی تحصیل کی۔ دیگر شعرا کی طرح حسرت بھی دہلی سے فیض آباد پھر لکھنؤ پہنچے۔ وہ کم عمری سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ 'طوطی نامہ' جعفرعلی حسرتؔ کی سب سے مشہور مثنوی ہے جو تقریباً ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ جعفر کی اس مثنوی پر سحرالبیان کا خاص اثر ہے۔ حسرت کے یہاں صنائع بدائع کا بہ کثرت استعمال ہے اور خارجیت اور معاملہ بندی کا رجحان بھی زیادہ ہے۔ جو لکھنوی رنگِ سخن کی نمائندگی کرتا ہے۔

کس کس طرح سے ہم نے کیا اپنا جی نثار	لیکن گئیں نہ دل سے ترے بدگمانیاں
دشمن کو بھی خدا نہ دکھاوے شبِ فراق	ہجراں کی شب وہ شب ہے کہ جس کو سحر نہیں
حسرت کے دل کو بند کیا چار سو سے گھیر	کیا تیری زلف میں بھی ہے قیدِ فرنگ شوخ

میر حسنؔ (1740/41-1786) : ان کا نام میر غلام حسن تھا۔ میر ضاحکؔ کے بیٹے تھے۔ ان کا خاندان ہرات سے منتقل ہوکر دہلی میں بس گیا تھا۔ میر حسن دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت بھی پائی۔ انھوں نے بھی دہلی کی تباہی کے بعد پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ کا رُخ کیا۔ شعرگوئی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ پہلے میر ضیاؔ سے اصلاح لی پھر سوداؔ سے۔ وہ قادرالکلام شاعر تھے۔ کلیاتِ میر حسن میں غزلیات اور مثنویات کا بڑا حصّہ ہے۔ تین قصیدے بھی ہیں اور رباعیات بھی۔ 'سحرالبیان' میر حسن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ اردو کی مقبول ترین مثنوی ہے۔

سحرالبیان کے مختلف حصّے داستانوں کی مختلف کہانیوں پر مشتمل ہیں مگر میرحسن نے انھیں جس طرح پیش کیا ہے اس سے یہ نئی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اس مثنوی میں اپنے دور کی تہذیبی وسماجی اور معاشرتی فضا بہت واضح ہے۔ اس مثنوی کا حُسن اس کے اسلوبِ بیان میں ہے جو سادہ مگر دلکش ہے۔ اس میں جا بجا محاکات آفرینی اور جذبات نگاری کی بیش بہا مثالیں ملتی ہیں۔ میرحسن نے سحرالبیان کے علاوہ اور بھی بہت سی مثنویاں لکھیں ہیں۔ مثنوی سحرالبیان سے چند اشعار دیکھیے۔

خفا زندگانی سے ہونے لگی   بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپِ غم کی شِدّت سے پھر کانپ کانپ   اکیلی لگی رونے، منہ ڈھانپ ڈھانپ
نہ اگلا سا ہنسنا، نہ وہ بولنا   نہ کھانا، نہ پینا، نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا، پھر نہ اُٹھنا اُسے   محبت میں دن رات گُھٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو   تو اُٹھنا اُسے کہہ کے، ہاں جی، چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے   تو کہنا، یہی ہے جو اَحوال ہے
کسی نے جو کچھ بات کی، بات کی   پہ، دِن کی جو پوچھی، کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے   کہا: خیر، بہتر ہے، منگوائیے

عہدِ میؔر کے کچھ اور شعرا بھی قابلِ ذکر ہیں جن میں شاہ محمدی بیدؔار (1796-1727)، شیخ قدرت اللہ قدرت (ف 1790) اور ہدایت اللہ خاں ہداؔیت (ف 1804) شامل ہیں۔

میؔر کے عہد کے قابلِ ذکر شعرا اور مختلف شعری اصناف کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اس عہد کی دو اور اہم اصناف شہر آشوب اور واسوخت بھی ہیں۔ شہر آشوب شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس میں شعرا نے اپنے زمانے کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کا بیان کیا ہے۔ اس صنف میں شاہ حاتؔم، میؔر، سوداؔ، قائؔم اور جعفر علی حسرؔت خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کا یہ دور غیر معمولی ترقی کا دور ہے جس کا نقطۂ آغاز مرزا مظہر جانِ جاناں تھے تو نقطۂ عروج میؔر اور سوداؔ۔ اس دور تک آتے آتے اردو زبان فارسی کی محتاج نہیں رہی اور اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر ہر خاص و عام کی زبان بن گئی۔ شعر و سخن کا چرچا عام ہونے لگا۔ مشاعروں کی محفلیں سجنے لگیں اور مختلف اصناف کو فروغ حاصل ہوا۔ کئی نئے اسالیب کی بنیاد پڑی جن کے نتیجے میں شعر و ادب کے نئے دبستان وجود میں آئے۔

ایک نئی شعری روایت کا آغاز— نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری

نظیر اکبرآبادی (1735/40-1830) : ان کا نام شیخ ولی محمد تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا تو اپنی والدہ کے ہمراہ اکبر آباد (آگرہ) چلے گئے۔ نظیر سیلانی طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے لیے جو راہ چنی، وہ اس دور کے عام تخلیق کاروں کی راہ سے مختلف تھی۔ سیر سپاٹے، تفریح اور عوامی سروکار کی وجہ سے ان کی تخلیقی کائنات وسیع تر ہونے لگی۔ انھوں نے کبوتر بازی، کُشتی، کنکوے بازی، تیراکی یا ایسے ہی دوسرے کھیلوں میں خاص دل چسپی لی۔ ساتھ ہی بلاتفریق ہر مذہب کے تہواروں میں شامل ہوتے رہے۔ جہاں کہیں محبت کا جذبہ کارفرما ہوتا، وہ اس کا احترام کرتے۔

اسی طرزِ زندگی سے نظیر کے یہاں تنوع پیدا ہوا اور شعر کہنے کے لیے نئی راہیں ہموار ہوئیں۔ نظیر نے اگرچہ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن انھیں شہرت نظم نگار کی حیثیت سے ملی۔ اپنے خاص رنگ کی وجہ سے انھیں عوامی سطح پر غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی اسی مقبولیت کے پیشِ نظر بھرت پور کے مہاراجا نے انھیں اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ اودھ کے دربار سے بھی دعوت نامہ ملا۔ مگر وہ اپنے قلندرانہ مزاج کی وجہ سے کہیں نہیں گئے۔ آگرہ اور یہاں کا ماحول ان کے لیے سب کچھ تھا۔ اس شہر سے اپنے والہانہ رشتے کو انھوں نے ایک نظم میں یوں بیان کیا ہے ۔

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے　　　ملّا کہو، دبیر کہو، آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو، آگرے کا ہے　　　شاعر کہو، نظیر کہو، آگرے کا ہے

نظیر اردو کے علاوہ عربی، فارسی، برج بھاشا، اودھی اور پنجابی سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ انھوں نے عوامی موضوعات پر اظہارِ خیال کے لیے حسبِ ضرورت الفاظ بھی وضع کیے اور انتہائی سادہ اور سلیس اسلوب میں شاعری کی۔ اُن کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ ٹھیلے والے اور خوانچے والے بھی ان سے نظمیں لکھواتے تھے۔ اُن کے یہاں میلوں ٹھیلوں، موسموں، تہواروں اور مذہبی شخصیات کے علاوہ بھوک اور مفلسی جیسے موضوعات پر بھی خاصی تعداد میں نظمیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی نظمیں 'روٹی نامہ'، 'آدمی نامہ' اور 'بنجارہ نامہ' بھی بے حد مقبول ہیں۔ ان کی نظم 'آدمی نامہ' کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

دنیا میں بادشا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی　　　اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی　　　نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

میرؔ کے عہد کی نثر

شاعری کی طرح اردو نثر بھی شمالی ہند میں قدرے تاخیر سے وجود میں آئی۔ تعلیم یافتہ لوگ اپنے اہم تحریری کاموں کے لیے فارسی زبان کو ترجیح دیتے تھے مگر صوفیوں کے بعض اقوال اور فقروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ روزمرہ کے کاروبار میں کسی حد تک اردو نثر کو بھی دخل تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ وغیرہ نے اپنی گفتگو میں اردو الفاظ اور فقرے استعمال کیے ہیں۔ اس کی بعض ابتدائی صورتیں میر جعفر زٹلی کے طنزیہ سیاسی اقوال میں بھی نظر آتی ہیں جن میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کے جوڑ سے زٹلی نے پر مذاق فقرے اور جملے بنانے کی کوشش کی ہے۔

اردو روزمرّہ نے شمالی ہند کے بعض اہلِ قلم کو اس طرف راغب کیا کہ وہ رائج الوقت اردو فقروں کو اپنی تحریروں میں استعمال کریں۔ سیّد برکت اللہ عشقی بلگرامی نے صوفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے بہت سے اردو الفاظ و محاورات 'عوارفِ ہندی' میں استعمال کیے۔ مرزا جان طپشؔ نے دہلی دربار میں استعمال کی جانے والی متعدد اصطلاحات کا ایک ضخیم مجموعہ 'شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان' کے نام سے مرتب کیا۔

شمالی ہند کی ابتدائی نثری کاوشوں نے اردو نثر کے تشکیلی عمل کو تیز کر دیا۔ تخلیقی اور علمی کاموں میں نئے لفظوں اور ترکیبوں کی پیوندکاری نے اردو نثر کو ایک مخصوص صورت دی۔ اس ذیل میں سیّد فضل علی فضلی کی 'کربل کتھا' (1732-33) کا نام لیا جا سکتا ہے جو فارسی تصنیف 'روضۃ الشہدا' کا اختصار سے کیا گیا اردو ترجمہ ہے۔ فضلی نے چند برسوں بعد اسے نسبتاً آسان زبان میں دوبارہ لکھا۔

اسی عہد میں معین الدین حسین علی نے تصوّف میں ایک فارسی تصنیف کا ترجمہ 'جامِ جہاں نما' (1760-61) کے نام سے کیا۔ جس کے بعد شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی نے 'خدائی نعمت' (1771) لکھی۔ یہ قرآن کے آخری پارے کی آسان زبان میں تفسیر ہے جو 'تفسیر مرادیہ' کے نام سے بھی کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ رفیع الدین نے اردو میں مکمل قرآن کا لفظی ترجمہ کیا۔ لفظی ترجمہ ہونے کی وجہ سے شاہ صاحب کی زبان رواں نہیں تھی۔ اس کے بعد ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے 1790-91 میں 'موضح قرآن' کے نام سے سلیس و بامحاورہ زبان میں ترجمہ فرمایا اور تفسیری حواشی بھی تحریر کیے۔ ہندوستان کے دیگر مذاہب

کے ماننے والوں نے بھی عوام میں اپنے عقائد کی تبلیغ کے لیے اردو نثر کو وسیلہ بنایا۔ عیسائی مشنریوں نے خاص طور پر 'انجیل' کے ترجمے اردو زبان میں کیے۔

ہندو مذہب کی بھی بہت سی کتابیں اردو نثر میں ترجمہ کی گئیں۔ سندھ کے مؤل رام نے بھگوت گیتا کا فارسی آمیز اردو ترجمہ کیا۔ ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے راماین، مہابھارت، لیلاوتی اور دھرم شاستر کے ترجمے کروائے۔ علم تاریخ میں رستم علی بجنوری کی کتاب 'قصۂ احوال روہیلہ' کی بھی اہمیت ہے۔ اس میں شجاع الدولہ کے عہد حکومت تک روہیلہ قوم کے عروج و زوال کا بیان ملتا ہے۔ افسانے اور ناول سے بہت پہلے اردو میں قصّہ کہانی کی روایت عام رہی ہے۔ شمال میں اس کی قدیم مثال عیسوی خان کی داستان 'قصّۂ مہر افروز و دلبر' ہے۔ میر محمد حسین عطا خاں تحسینؔ کی داستان 'نَو طرزِ مرصّع'، مہر چند کھتری کی داستان 'نو آئینِ ہندی'، شاہ عالم ثانی (1727-1806) کی 'عجائب القصص' (1792/93) اٹھارھویں صدی میں اردو نثر کی اہم مثالیں ہیں۔ ان کا مفصّل ذکر داستانوں سے متعلق باب میں آئے گا۔

13085CH05

باب 5

لکھنؤ میں اُردو شاعری

1707 میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہوگئی۔ بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار کی وجہ سے یہاں کی معاشی صورتِ حال بد سے بدتر ہوتی گئی۔ مجبوراً یہاں کے شعرا، ادبا اور دوسرے اربابِ فضل وکمال مختلف پناہ گاہیں ڈھونڈھنے لگے۔ اس زمانے میں دہلی کے برخلاف اودھ میں خوش حالی تھی۔ یہاں کے صوبے دار برہان الملک سعادت علی خاں تھے، جنھوں نے فیض آباد کو دارالسلطنت بنا کر بڑی حد تک خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ ان کے بعد صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کا دور دورہ رہا۔ اس کے بعد آصف الدولہ نے یہاں کی حکومت سنبھالی۔ انھوں نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ ان کی سخاوت کا ہر طرف شہرہ تھا اس لیے دوسرے اربابِ کمال کے ساتھ اردو کے شعرا بھی پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ میں جمع ہوتے گئے۔ اس طرح لکھنؤ شعر و ادب کا ایک مرکز بن گیا۔ آصف الدولہ کے بعد غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر اور آخر میں واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ کی مرکزی حیثیت برقرار رہی۔

فیض آباد اور پھر لکھنو میں شعر وسخن کی بساط جمانے والوں میں وہ شعرا پیش پیش تھے جو دہلی اور اس کے اطراف سے ہجرت کر کے وہاں پہنچے تھے جیسے سوؔدا، میر تقی میرؔ، میر حسنؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ، رنگینؔ، انشاؔ وغیرہ۔ اس کے بعد اگلی نسل ان شعرا کی تھی جو یہیں پلے بڑھے اور استادی کے درجے تک پہنچے۔ ان میں ناسخؔ اور آتشؔ سرفہرست ہیں۔ ان کے بعد ناسخؔ کے شاگردوں میں وزیرؔ، رشکؔ، بحرؔ وغیرہ اور آتشؔ کے شاگردوں میں نسیمؔ، صباؔ، رندؔ، شوقؔ وغیرہ نے لکھنؤ کی شعری روایت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

لکھنوی شعرا نے صنف مرثیہ کی طرف بھی توجہ کی اور اسے درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ مرثیہ گو شعرا میں خلیقؔ و ضمیرؔ اور انیسؔ و دبیرؔ نے خاص طور پر شہرت حاصل کی۔ بعد میں اوجؔ، مونسؔ، انسؔ، عشقؔ، وحیدؔ وغیرہ نے مرثیہ گوئی کی اس روایت کو جاری رکھا۔ 'ریختی' کی بنیاد بھی لکھنؤ ہی میں پڑی۔ انشاؔ، رنگینؔ، جانؔ صاحب نے اس میں شہرت پائی۔ 'واسوخت' میں بھی یہاں نئی نئی راہیں نکالی گئیں۔ امانتؔ کا نام اس باب میں سرِ فہرست ہے۔ لکھنؤ میں شعر و ادب کے مطالعے کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلا دور

لکھنؤ میں اردو شاعری کا پہلا دور دہلی کے طرز پر ہی شروع ہوا جس میں سادگی اور صداقت پسندی کو اہمیت حاصل تھی۔ تاہم رفتہ رفتہ لکھنؤ کی شاعری نے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ زبان و بیان اور لب و لہجے میں تبدیلی کے علاوہ افکار و تصورات میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ آہستہ آہستہ رنگینی، تکلف اور تصنع کو اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ پہلے دور سے تعلق رکھنے والے شعرا میں مصحفیؔ، جراَتؔ، انشا، رنگینؔ اور شاہ نصیرؔ کے نام اہم ہیں۔ یہ وہ شعرا ہیں جو دہلی سے ترکِ وطن کر کے لکھنؤ پہنچے تھے۔

مصحفیؔ (1747/50-1824/25) : ان کا نام شیخ غلام ہمدانی تھا۔ اصلاً امروہہ کے رہنے والے تھے۔ تلاشِ معاش کے سلسلے میں مختلف شہروں کا سفر کیا۔ آنولہ، ٹانڈہ (بریلی)، دہلی وغیرہ میں مقیم رہنے کے بعد بالآخر لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے۔ سلیمان شکوہ کے دربار سے انشاء اللہ خاں انشا کی وابستگی کے بعد انشا اور مصحفی میں ٹھن گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو کم تر ثابت کرنے پر تُل گئے۔

مصحفی نہایت پُر گو شاعر تھے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اردو کے آٹھ دواوین کے علاوہ ایک دیوانِ قصائد اور متعدد مثنویاں ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں۔ ان کی شاعری میں دہلوی اور لکھنوی دونوں رنگ شامل ہیں۔ انھوں نے فارسی میں بھی تین دیوان مرتب کیے اور شعرائے فارسی و اردو کے تین تذکرے بھی لکھے۔ خلیقؔ، آتشؔ، اسیرؔ وغیرہ ان کے قابلِ ذکر شاگرد ہیں۔ مصحفیؔ کے یہاں ہر رنگ کے شعر مل جاتے ہیں۔

چلی بھی جا جَرَسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم ۔۔۔ کہیں تو قافلۂ نَو بہار ٹھہرے گا

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن کو رات کرنا ۔۔۔ کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا ۔۔۔ ہجر تھا یا وصال تھا، کیا تھا

مصحفیؔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم ۔۔۔ تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

جراَتؔ (1748/49-1809/10) : ان کا نام شیخ یحییٰ امان قلندر بخش تھا۔ ان کے آبا و اجداد مغلیہ دربار سے وابستہ تھے۔ دہلی کے حالات خراب ہوئے تو جراَت ترکِ وطن کر کے پہلے فیض آباد، پھر لکھنؤ پہنچے۔ اُن دِنوں لکھنؤ میں مرزا

سلیمان شکوہ شعرا کی سرپرستی کرنے والوں میں سرفہرست تھے۔ جرأت بھی سلیمان شکوہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔

جرأت کے بارے میں مشہور ہے کہ عین جوانی میں نابینا ہو گئے تھے۔ اُن کی تعلیم تو معمولی تھی لیکن زبان پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ علمِ نجوم اور فنِ موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ ستار بہت عمدہ بجاتے تھے۔ زندہ دل تھے۔ ان کی شاعری ان کی زندہ دلی کی مظہر ہے۔ معاملاتِ عشق کے بیان میں وہ نہایت بے باک تھے۔ اپنے استاد جعفر علی خاں حسرؔت دہلوی کی طرح انھوں نے بھی معاملہ بندی کی راہ اختیار کی۔ انھوں نے مرثیے، مثنویاں اور قطعے بھی کہے لیکن غزل ان کا خاص میدان ہے۔ جرأت نے واسوخت، شہر آشوب اور ریختی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

آئے جو مرے پاس تو منہ پھیر کے بیٹھے ‌ ‌ ‌ یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا
پری سا جو مکھڑا دکھا کر چلے ‌ ‌ ‌ مجھے تم دِوانہ بنا کر چلے
باتوں سے کٹے کس کی بھلا راہ ہماری! ‌ ‌ ‌ غربت کے سوا کوئی نہیں ہم سفر اپنا

انشؔا (1817-1752/56): ان کا نام انشاء اللہ خاں تھا۔ وہ مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماشاء اللہ خاں کے ساتھ 1779 کے آس پاس لکھنو پہنچے۔ پھر دہلی میں شاہ عالم کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ انشا بڑے صاحبِ علم و فضل تھے۔ انھیں کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ وہ بہت ذہین، بے باک اور حسّاس تھے۔ سولہ سترہ برس دہلی میں گزارنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور وہاں کی ادبی فضا پر چھا گئے۔ جرأت و مصحفؔی کے ساتھ انشا کے معرکے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انشا نہ صرف دربار کی جان تھے بلکہ ان کا شمار اپنے عہد کے اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔

انشؔا نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ غزل میں انھیں امتیاز حاصل تھا۔ فارسی کلیات کے علاوہ ان کی کتاب 'دریائے لطافت' سے ان کے علم و فضل کا پتا چلتا ہے۔ 'رانی کیتکی کی کہانی' اور 'سِلکِ گہر' ان کی مختصر داستانیں ہیں۔ رانی کیتکی کی کہانی میں انشا نے یہ اہتمام کیا ہے کہ عربی فارسی کا کوئی لفظ نہ آنے پائے۔ ریختی میں بھی ان کا ایک دیوان موجود ہے۔ طبیعت کے اس رجحان کے باوجود مشکل پسندی، عالمانہ خیال آرائی، سنگلاخ زمینیں اور تراکیب بھی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ انھوں نے ہندی کے سبک و شیریں الفاظ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ!
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

نزاکت اس گلِ رعنا کی دیکھیو انشاء
نسیم صبح جو چھوجائے رنگ ہو میلا

رنگینؔ (1758/63-1834/35) : ان کا نام سعادت یار خاں تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ حاتمؔ کے شاگرد تھے۔ مگر زیادہ تر وقت لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں گزرا۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ ان کے مزاج میں شوخی تھی جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔

رنگین عیش و عشرت کی زندگی کے دل دادہ تھے۔ 'مجالسِ رنگیں' ان کی مشہور کتاب ہے جس میں انھوں نے اپنے دور کی ادبی مجلسوں اور مشاعروں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ 'امتحانِ رنگیں' بھی ان کی معروف کتاب ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور دوسری شعری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ کہا جاتا ہے شمالی ہند میں ریختی کہنے والے پہلے شاعر رنگینؔ ہیں۔ ریختی میں عورتوں کے خاص محاورے، فقرے اور ان کے روزمرہ کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔ رنگین نسوانی زبان کا خوش اسلوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ 'سلطان ٹیپو شہید' کے عنوان سے ان کا ایک قصیدہ بھی مشہور ہے۔ غالب کے معاصر شاہ غمگین گوالیاری، رنگین کے شاگرد تھے۔

جو ہونی تھی سو بات ہولی کہارو
چلو لے چلو میری ڈولی کہارو

مجھے چپکے پہنچا دو انشا کے گھر تک
نہ پوچھو کہ کے پیسے ڈولی کہارو

میں ترے صدقے، نہ رکھ اے میری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

شاہ نصیرؔ (1760/61-1838) : شاہ نصیر کا وطن دہلی تھا۔ ماں باپ کے اکلوتے تھے۔ ناز و نعمت میں پرورش ہوئی، اس لیے تعلیم ادھوری رہ گئی۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شاہ محمدی مائلؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کے کئی سفر کیے۔ یہاں آتشؔ و ناسخؔ سے مشاعروں میں معرکہ آرائیاں بھی رہیں۔ وہ یہاں کے مشاعروں پر اثر انداز بھی ہوئے اور ان کے رنگِ سخن سے متاثر بھی۔ آخر میں وہ حیدرآباد چلے گئے تھے۔ وہیں

وفات پائی۔

شاہ نصیر کے کلام میں خارجیت، تصنّع اور رعایت لفظی کا عنصر زیادہ ہے۔ انھیں مشکل زمینوں میں شعر کہنے کا ملکہ تھا۔ ذوقؔ، مومنؔ اور ظفرؔ ان کے مشہور شاگرد ہیں۔

تیرہ بختانِ ازل کا کبھی دیکھا نہ فروغ ۔۔۔ شب کو جگنو کی طرح اڑ کے نہ جھلکی مکّھی
شیشۂ بادۂ گل رنگ پٹک دے ساقی ۔۔۔ جامۂ سبز میں دیکھے جو تنِ سرخ ترا
خیال زلفِ بتاں میں نصیرؔ پیٹا کر ۔۔۔ گیا ہے سانپ نکل، اب لکیر پیٹا کر

دوسرا دور

لکھنؤ میں شاعری کا دوسرا دور ان خصوصیات اور رجحانات سے عبارت ہے جو لکھنوی تہذیب وثقافت کی بنیادی پہچان تصور کیے جاتے ہیں۔ لسانی طرح داری ہو یا تصنع اور صنائع کا زور یا پھر طرز ادا اور فکر وخیال کی نیرنگی، ہر دو سطح پر اس دور میں لکھنؤ کی انفرادیت نمایاں ہو کر سامنے آئی۔ اس دور کے نمائندہ شعرا میں آتشؔ، ناسخؔ، شوقؔ اور نسیمؔ وغیرہ کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس دور کی شاعری میں غزل کے علاوہ مثنوی کو خصوصی فروغ حاصل ہوا۔

آتشؔ (1768-1847) : ان کا نام خواجہ حیدر علی تھا۔ ان کے والد خواجہ علی بخش دہلی چھوڑ کر فیض آباد میں بس گئے تھے۔ آتشؔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ کم سِنی میں ہی یتیم ہو جانے کی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ نواب محمد تقی خاں، ہوسؔ کے یہاں ملازم ہو گئے۔ انھیں کے ہمراہ فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے۔ لکھنؤ میں مصحفیؔ کی شاگردی اختیار کی لیکن کسی بات پر خفا ہو کر رشتہ توڑ لیا۔

آتشؔ کے مزاج میں قناعت تھی۔ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دربار سرکار سے ربط ضبط انھیں پسند نہ تھا۔ مفلسوں اور محتاجوں سے ان کی خوب بنتی تھی۔ ان کی شاعری میں لکھنوی طرز نمایاں ہے۔ انھوں نے صنعتوں سے خوب کام لیا ہے اور جذبات واحساسات کو بھی بڑے سلیقے سے نبھائے ہیں۔ ان کے یہاں اخلاقی مضامین اور مسائلِ تصوّف کے ساتھ ساتھ بلند خیالی اور حسنِ بیان بھی ہے۔ درج ذیل اشعار سے ان کے رنگِ سخن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے ۔۔۔ ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا؟ ۔۔۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟

سن تو سہی! جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟	کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟
آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے	میں جا ہی ڈھونڈتا تیری محفل میں رہ گیا

ناسخ (1772/76-1838) : ان کا نام شیخ امام بخش تھا۔ ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ ناسخ زبان داں اور ماہرِ فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا شمار لکھنؤ کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ کئی امرا ان کے شاگرد تھے۔ ناسخ نہایت خود دار انسان تھے۔ وہ کبھی کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے۔ غازی الدین حیدر نے انھیں 'ملک الشعرا' کا خطاب دے کر دربار سے منسلک کرنا چاہا تو ناسخ نے جواب دیا کہ اتنے چھوٹے سے بادشاہ سے خطاب لے کر کیا کروں گا۔ غازی الدین حیدر کو غیر متوقع جواب دینے کے بعد ناسخ بادشاہ کے عتاب کے خوف سے لکھنؤ چھوڑ کر کچھ دِنوں کے لیے الہ آباد چلے گئے۔ نظامِ دکن کے دیوان مہاراجا چندو لال نے ناسخ کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی، لیکن انھوں نے وہاں جانا بھی گوارا نہ کیا۔

ناسخ شاعری کے معنوی حسن سے زیادہ ظاہری حسن کے دلدادہ تھے۔ اس لحاظ سے اردو زبان کو نکھارنے اور سنوارنے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے تین دیوان اور دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔

زندگی زندہ دِلی کا ہے نام	مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں
وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں	ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں
جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی	عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

شوقؔ (1782-1871) : ان کا نام تصدّق حسین خاں اور نواب مرزا عرفیت تھی۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے مختلف علوم میں مہارت حاصل کی۔ علم طِب پر بھی انھوں نے مکمل دسترس بہم پہنچائی اور طبابت کو بہ طور پیشہ اختیار کیا۔ واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں وہ شاہی معالج بھی مقرر ہوئے۔

شعر و سخن سے دلچسپی کے باعث شوق شاعری کی طرف راغب ہوئے اور آتش کی شاگردی اختیار کی۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن انھیں شہرت مثنوی نگار کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ ان کی مثنویاں 'فریبِ عشق'، 'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق' کافی مقبول ہوئیں۔ ان تینوں مثنویوں میں 'زہرِ عشق' نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔

زہرِ عشق کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے۔ واقعات و کردار عام زندگی سے لیے گئے ہیں اور انھیں سیدھے سادے انداز میں روزمرّہ کی بول چال میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں لکھنؤ کی بیگماتی زبان کے بڑے اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ قصّہ اتنے دلچسپ پیرایے میں بیان کیا گیا ہے کہ واقعات کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ کرداروں کے جذبات بڑے کامیاب اور مؤثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان امتیازات کے علاوہ لکھنوی تہذیب و معاشرت کی سچّی تصویر کشی بھی اس مثنوی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ 'زہرِ عشق' کے چند اشعار دیکھیے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے   آج وہ کل ہماری باری ہے

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی   دل دیا، غم سے آشنائی کی

حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں   ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں

نسیم (1811-1845) : ان کا نام پنڈت دیا شنکر تھا۔ وہ گنگا پرشاد کول کے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ خاندانی روایت کے مطابق انھوں نے اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بیس برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ آتش کی شاگردی اختیار کی تھی۔ نسیم نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا ایک مختصر سا دیوان ہے جس میں غزلوں کے علاوہ چند مخمس اور ترجیع بند بھی ہیں، لیکن ان کی ساری شہرت ان کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' سے ہے۔

نسیم کی غزلوں میں ان کے استاد کا رنگ جھلکتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور خودداری ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان کی زبان پر لکھنوی رنگ غالب ہے۔ رعایتِ لفظی اور صنائع کے استعمال کے باوجود معنویت اور پاکیزگی کا خیال رکھنا ان کا خاص وصف ہے۔ کلام میں برجستگی اور اختصار سے خوبی پیدا کر دیتے ہیں۔

مثنوی 'گلزارِ نسیم' 1838/39 میں لکھی گئی اور 1844 میں شائع ہوئی۔ اس میں جو کہانی بیان ہوئی ہے، وہ 'قصّہ گلِ بکاولی' کے نام سے مشہور ہے۔ اس مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ داستان میں غزل کے اشعار جیسا ایجاز پیدا ہو گیا ہے۔ 'گلزارِ نسیم' میں تشبیہ و استعارہ کی کثرت، لفظی و معنوی رعایات اور کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ دینے کے ہنر نے ایسا جادو جگایا کہ چھوٹی سی کہانی میں مختلف معنوی امکانات پیدا ہو گئے۔ یہ خوبی غزل کے عمدہ شعر میں ہوتی ہے۔

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کو دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کا مثالی نمونہ کہا جاتا ہے۔ نسیم کے زمانے کے لکھنؤ اور وہاں کی شاعری میں جو شائستگی، مرصّع کاری اور تکلفات رائج تھے، وہ اس مثنوی میں پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

گُل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بُلبُلِ خامہ نعرہ زن ہے
گل چیں نے وہ پھول جب اُڑایا — اور غنچۂ صبح کھِل کھِلایا
وہ سبزۂ باغِ خواب آرام — یعنی وہ بکاوَلی گل اندام
جاگی مرغِ سحر کے غُل سے — اُٹھّی نکہت سی فرشِ گل سے
منھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا، تو وہ گل ہَوا ہُوا ہے — کچھ اور ہی گل کھِلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کِدھر گیا گل! — جھنجلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون! — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون!
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہو کے تو گل اُڑا نہیں ہے
نرگس! تو دکھا کدھر گیا گل؟ — سَوسن! تو بتا کدھر گیا گل؟
سنبل! مرا تازیانہ لانا — شمشاد! انھیں سولی پر چڑھانا

تیسرا دور

اردو میں مرثیہ گوئی کی روایت :

دبستانِ لکھنؤ کے تیسرے دور کی شاعری کا امتیازی وصف مرثیہ نگاری ہے۔ اس دور میں مرثیہ نگاری نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ مرثیہ نگاروں کے حوالے سے جن شعرا کو بقائے دوام حاصل ہوئی ان میں میرانیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے نام سب سے زیادہ اہم ہیں۔

اردو مرثیے کی شروعات دکن سے ہوئی۔ شمالی ہند میں مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ نے اس میں کامیاب تجربے کرکے اس صنف کو اور ترقی دی۔

میر مستحسن خلیقؔ، میر مظفر حسین ضمیرؔ اور مرزا جعفر علی فصیحؔ نے مرثیے کو ترقی کی اعلیٰ منزلیں طے کرائیں۔ بالخصوص مرثیے کے مختلف اجزائے ترکیبی میں تمہید، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین کا تعین میر ضمیر ہی سے منسوب ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ لکھنؤ میں اس صنف نے شاعری میں توازن پیدا کیا اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترجمانی کی۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے عہد میں یہ صنف اپنے درجۂ کمال کو پہنچی اور بعد میں آنے والے مرثیہ گویوں نے اسی طرز اور ترتیب کی پیروی کی۔

میر انیسؔ (1874-1802/03): ان کا نام میر ببر علی تھا۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ میر حسنؔ کے پوتے تھے۔ میر انیسؔ کے والد میر مستحسن خلیقؔ بھی ایک باکمال شاعر تھے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے اور آخر عمر تک وہیں رہے۔

میر انیسؔ نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن جلد ہی مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کے مرثیے فصاحت و بلاغت کی عمدہ مثال ہیں۔ میر انیس کو منظر نگاری، کردار نگاری اور رزم نگاری میں کمال حاصل تھا۔ واقعات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے نادر تشبیہیں، دلکش استعارے، آسان زبان اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ میر انیسؔ کی زبان عام فہم ہونے کے باوجود شگفتہ اور دل کش ہے۔

میر انیس نے مرثیے کے علاوہ غزلیں، رباعیاں اور سلام بھی کہے ہیں۔ اُن کے مراثی پانچ جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ زبان و بیان کی مختلف خصوصیات کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی ترجمانی اور مقامی تہذیب کی عکاسی نے ان مرثیوں کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ ان کے مرثیے کے کچھ بند درج ذیل ہیں۔

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں، وہ بیاباں وہ سحر — دم بہ دم جھومتے تھے، وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرّد پہ بچھائے تھے گُہر — لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ زار — پھولوں پہ جا بہ جا، وہ گُہر ہائے آب دار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے، شاخوں کا بار بار — بالائے نخل ایک جو بُلبُل، تو گُل ہزار
خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے، کٹورے گُلاب کے

مرزا دبیر (1803-1875) : ان کا نام مرزا سلامت علی تھا۔ دبؔیر کے اجداد ایران سے آئے تھے۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے۔ وہیں کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ عربی، فارسی کے علاوہ دیگر علوم میں بھی مہارت حاصل کی۔

مرزا دبیر کو شعر گوئی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ لکھنؤ کے ماحول نے اس شوق کو تیز تر کر دیا۔ وہ میر ضمؔیر کے شاگرد تھے۔ لطیف تشبیہوں، دلآویز استعاروں اور صنائع بدائع کی فراوانی نے مرزا دبؔیر کے کلام کو ایک انفرادیت بخشی۔ مضمون آفرینی اور مبالغہ آرائی میں مہارت رکھتے تھے۔ اُن کے مراثی میں فضائل اور رزم کے حصّے پُر شِکوہ اور ماتم اور بین کے حصّے اثر انگیز ہیں۔

مرزا دبؔیر نے رباعی، قطعہ، مثنوی، سلام اور قصیدے بھی کہے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی۔ 'احسن القصص' اور 'معراج نامہ' ان کی دو مثنویاں ہیں۔ ان کا کلام 'دفترِ ماتم' کے نام سے بیس جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

مرثیے کے دو بند ملاحظہ ہوں:

کس شیر کی آمد ہے، کہ رَن کانپ رہا ہے — رُستم کا جگر، زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے — سب ایک طرف، چرخِ کُہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے، حیدر کے پِسَر کو
جبریل لرزتے ہیں، سمیٹے ہوئے پَر کو

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی — پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اَور قطع زلفِ لیلیِ زُہرہ لقب ہوئی — مجنُوں صفتِ قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہوگیا، پیوند کے لیے

انیؔس و دبؔیر کے بعد نفیؔس، تعشؔق اور رشؔید نے بھی مرثیے لکھے، مگر وہ ان دونوں کے برابر نہ پہنچ سکے۔ حاؔلی اور ان کے بعض معاصرین نے عام ڈگر سے ہٹ کر شخصی مرثیہ نگاری کی داغ بیل ڈالی جسے رفتہ رفتہ خاصا فروغ حاصل ہوا۔ مرثیے کے علاوہ سلام نگاری میں بھی اسی دور میں ایک نیا تجربہ کیا گیا، چنانچہ اہلِ بیتؓ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کو مخاطب کرتے ہوئے سلام لکھے گئے۔

غالبؔ کے عہد کو اردو شعر و ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس عہد میں مغلیہ سلطنت کی شاندار اور پُرشکوہ روایت اپنی آخری سانس لے رہی تھی اور برطانوی سامراج بڑی تیزی کے ساتھ استحکام حاصل کر رہا تھا۔ سیاسی حالات کی ابتری کے نتیجے میں ہندوستانی عوام کی زندگی کا ہر شعبہ شدت سے متاثر ہو رہا تھا۔ مایوسی و شکست خوردگی کے آثار ہر جگہ نمایاں تھے۔ معاشی ابتری سے عوام و خواص دونوں کی زندگی متاثر تھی، ایک بڑی تہذیب اور اس سے وابستہ اقدار و روایات کے نشانات تیزی سے روبہ زوال تھے۔ عہدِ غالب کے اس پُرآشوب منظرنامے میں حیرت انگیز طور پر اردو ادب و شعر میں فکری، حسی اور فنی سطح پر ایسے معیار قائم ہوئے جو اردو ادب کی تاریخ میں روشن باب کا درجہ رکھتے ہیں۔

پہلا دور

اٹھارھویں صدی عیسوی میں دہلی کی تباہی و بربادی کے سبب اودھ کی طرف ہجرت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، جس نے وقتی طور پر دہلی کی ادبی مرکزیت کو متاثر کیا مگر بالآخر غالبؔ اور ان کے معاصرین کی بدولت اسے نئی توانائی حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہؔ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، اسداللہ خاں غالبؔ اور حکیم مومن خاں مومنؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

بہادر شاہ ظفر (1775-1862) : ان کا پورا نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور شاہ عالم ثانی کے پوتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کا انتقال 1837 میں ہوا۔ اسی سال بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ ان کی بادشاہت بیس سال رہی۔ 1857 کے آشوب میں جب انگریزوں کے ہاتھوں دہلی تاراج ہوئی تو اس کے ساتھ سلطنتِ مغلیہ کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر ملک بدر کر کے رنگون بھیج دیے گئے اور وہیں جلاوطنی کے عالم میں ستاسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

بہادر شاہ ظفر کی تعلیم و تربیت قلعۂ مُعلّیٰ میں پورے اہتمام سے ہوئی تھی۔ انھیں مختلف علوم و فنون میں مہارت اور کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ ظفر کا کلام اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ برج بھاشا اور پنجابی میں بھی موجود ہے۔

ظفر کے اساتذہ میں شاہ نصیرؔ، عزّت اللہ عشقؔ، میر کاظم حسین بیقرارؔ، ذوقؔ اور غالبؔ کے نام آتے ہیں۔ تاہم ان میں ذوقؔ کا نام اس اعتبار سے سرِ فہرست ہے کہ وہ طویل عرصے تک ان کے استاد رہے اور ظفر کو سب سے زیادہ قربت بھی ذوق ہی سے رہی۔

ظفر نے چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی نثر میں ایک کتاب 'خیابانِ تصوّف' بھی ہے جو گلستان سعدی کی متصوّفانہ شرح ہے۔ ظفر کی شاعری کا حجم کافی زیادہ ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں کئی رنگ ہیں۔ ان میں شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ کا رنگ زیادہ نمایاں ہے جس کا اظہار مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں کہی ہوئی غزلوں میں ہوا ہے۔

ظفر کے کلام کا بڑا حصّہ ایسے اشعار پر مشتمل ہے جس سے ان کے عہد اور خود ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی بھرپور عکّاسی ہوتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاجِ گدایانہ بنایا ہوتا

توڑی مریضِ غم نے ترے اس طرح سے جان گھبرا کے غم گسار سرھانے سے ہٹ گئے

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

ذوقؔ (1788/90-1854) : ان کا نام شیخ محمد ابراہیم تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول شوقؔ کے مکتب میں ہوئی۔ حافظ غلام رسول خود بھی شاعر تھے۔ اس لیے ذوق کو بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔ مزید تعلیم کے لیے عبدالرزاق کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ یہاں ذوقؔ کی ملاقات مولانا محمد باقر سے ہوئی۔ اس مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران، ذوق اپنے کلام کی اصلاح شاہ نصیرؔ سے لینے لگے تھے۔ انھیں کے توسط سے ذوقؔ کی لال قلعے کے دربار تک رسائی ہوئی۔ شاہ نصیرؔ جب دہلی چھوڑ کر دکن چلے گئے تو ذوق کو شہزادہ ابوظفر ولی عہد بہادر نے اپنا استاد بنا لیا۔ اس کے بعد شہزادے کے علاوہ قلعے کے بعض نومشق شعرا بھی ان کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی پر انھوں نے مبارک باد کے طور پر قصیدہ پیش کیا تو بادشاہ کی طرف سے انھیں 'ملک الشعرا' کا خطاب عطا ہوا۔ قصیدہ گوئی میں مہارت کی بنا پر انھیں 'خاقانیِ ہند' کا خطاب بھی ملا۔ ذوقؔ نہایت ملنسار اور خلیق انسان تھے۔ انھیں اپنے وطن سے بے حد لگاؤ تھا۔ حیدرآباد کے دیوان مہاراجا چندو لال شاداںؔ نے انھیں اپنے دربار میں بلانا چاہا مگر وہ دہلی کی گلیاں چھوڑ کر حیدرآباد نہیں گئے۔ یہیں ان کا انتقال ہوا۔

ذوقؔ کے دیوان میں غزلیں اور قصائد دونوں موجود ہیں۔ مگر وہ قصیدہ گو کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ انھیں مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل تھی۔ ان علوم کی مصطلحات کو انھوں نے اپنے قصیدوں میں بڑی خوبی

کے ساتھ استعمال کیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے قصیدے پُرشکوہ بن گئے ہیں۔ زورِ بیان اور تخیّل کی بلندی ان کے قصائد کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ سوؔدا کے بعد اردو قصیدہ گوئی میں ان کا درجہ سب سے بلند ہے۔

ذوقؔ کی غزلوں میں وارداتِ عشق کی ترجمانی ہوئی۔ انھوں نے محاوروں اور کہاوتوں کا برمحل استعمال کیا ہے ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

غالبؔ (1869-1797) : ان کا نام اسداللہ خاں تھا۔ پیدائش آگرہ میں ہوئی۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں آصف الدولہ کے دور میں لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ سے حیدرآباد گئے۔ پھر وہاں سے الور پہنچ کر راجا بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ وہیں 1801 میں کسی لڑائی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد چچا نے غالب کی پرورش کی۔ ابھی وہ نو برس کے تھے کہ چچا نے بھی وفات پائی۔ اس کے بعد غالبؔ اور ان کے اہلِ خاندان کے لیے انگریزی سرکار سے وظیفہ جاری ہوگیا۔ بچپن کا زمانہ ننھیال میں گزرا جو نہایت خوش حال تھی۔ نوعمری ہی میں دہلی کے ایک بڑے خاندان میں ان کی شادی ہوگئی اور وہ دہلی میں رہنے لگے۔ ذوق کے انتقال کے بعد غالبؔ بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے اور کچھ دنوں بعد قلعے میں باقاعدہ ملازم بھی ہوگئے۔ انھیں 'نجم الدولہ'، 'دبیر الملک' اور 'نظام جنگ' کے خطابات سے نوازا گیا۔ 1857 کے ہنگامے کے بعد ان کی تنخواہ اور خاندانی پنشن سب بند ہوگئی۔ اس سے کچھ عرصے پہلے فروری 1857 میں ان کا تعلق ریاست رام پور سے بھی رہا۔ جہاں سے انھیں مسلسل وظیفہ ملتا رہتا تھا۔ 1857 سے پہلے کی دہلی مغل تہذیب کی شان دار روایات کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ اس تہذیب کے مٹ جانے کا غالبؔ کو حد درجہ ملال تھا۔ اس کا اندازہ ان کی نثری تصانیف اور خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ 'مہرِ نیم روز' مغل خاندان کی تاریخ ہے جو فارسی میں لکھی گئی ہے۔ 'دستنبو' ان کا فارسی روزنامچہ ہے جس میں 1857 کے واقعات درج ہیں۔ اسی سال ان کی پینشن بھی بند ہوئی اور اسی سال غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کا انتقال ہوگیا۔ 1861 میں دیوانِ غالب کی اشاعت عمل میں آئی۔ 1864 میں قاطع برہان شائع ہوئی۔ غالب کے اردو خطوط کا پہلا مجموعہ 'عودِ ہندی' کے نام سے اور دوسرا مجموعہ 'اردوئے معلّٰی' کے نام سے شائع ہوا۔

غالب بنیادی طور پر شاعر تھے۔ قاطع برہان کے ذریعے وہ ماہر لغات کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ انیسویں صدی کے ربع اوّل تک وہ اردو زبان میں شعر کہتے رہے۔ بعد ازاں 1850 تک نہ صرف یہ کہ فارسی میں شاعری کی

بلکہ اسی زبان میں خطوط لکھتے رہے۔ غالب کے ذہنی سفر کو سمجھنے کے لیے اُن کے فارسی خطوط بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ فارسی خطوط کی زبان اور تکنیک روایتی اسلوب کی حامل ہے۔ جب کہ اردو خطوط روایت سے انحراف کی مثال ہیں۔ غالب نے تقریباً 1849 کے بعد اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز کیا تھا۔ ان خطوط کی زبان افسانوی ہے۔ خطاب کرنے کا انداز غیر رسمی ہے۔ بے ساختگی ان خطوط کی خاص پہچان ہے۔ غالب کے یہ خطوط غالب کے ذہن، ان کے تخلیقی سفر، ان کی شخصی پریشانیوں ہی کا مرقع نہیں ہیں بلکہ ان سے غالب کے پورے عہد کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی صورتِ حال کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

غالب ایک آفاقی شاعر ہیں۔ ان کے ذہن اور تجربے کی دنیا لامحدود ہے۔ اس میں فکر و جذبے کے اعتبار سے رنگا رنگی ملتی ہے۔ ہر عہد کا انسان ان کے اشعار میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔ غالب کی شاعری نہ صرف اپنے وقت سے آگے بڑھ جاتی ہے بلکہ جغرافیائی حدود سے بھی تجاوز کرتی ہے۔

غالب اپنی شاعری میں مشکل پسند تھے۔ اس کا احساس خود انھیں بھی تھا۔ چوں کہ مشکل پسندی ان کی طبیعت اور ان کے مزاج کا حصّہ تھی اس لیے مشکل پسندی سے دامن بچا کر چلنے کا ان میں یارا بھی نہ تھا۔ ایک طرف زبان کے استعمال کے طریقے میں ان کے یہاں روایت سے انحراف کی جھلک ملتی ہے جس نے ان کی شاعری کو ان کے عہد میں اجنبی بنا دیا، دوسری طرف چیزوں کو سمجھنے کی فہم فلسفیانہ نوعیت کی تھی۔ اردو شاعری کی تاریخ میں یہ اندازِ نظر بالکل نیا تھا۔ غالب نے لفظ کو لغوی معنی کے طور پر نہیں برتا بلکہ وہ اس تعبیری معنی پر نگاہ رکھتے ہیں جس کی بنیاد کئی جہتوں پر ہوتی ہے۔

معنی کی کثرت کے باعث ان کی شاعری میں ابہام بھی پیدا ہوا۔ اسی بنا پر بعض مشکل اشعار کی صراحت خود اُن کو بھی کرنی پڑی۔ ان کے بعد حالی اور پھر نظم طباطبائی نے غالب کے کلام کی شرح کو خاص اہمیت دی۔ جس کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔

غالب کے کلام کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ اُسے جب بھی پڑھا جاتا ہے، وہ نئے معنی اور نئے تاثر سے دوچار کراتا ہے۔ اس میں ہر پہلو سے نئے تجربے اور نئے انکشاف کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی تازہ کاری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ہر بار ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم پہلی بار انھیں پڑھ رہے ہیں۔ غالب جتنے جدت پسند ہیں، اتنے ہی کلاسیکی ہیں، جتنے کلاسیکی ہیں اس سے کہیں زیادہ جدید ہیں۔ انھیں کسی ایک میلان، کسی ایک نظریے سے وابستہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ ہر نظریے کے علم برداروں نے انھیں اپنے لیے مثال بنایا اور ان کے توسّط سے اپنے نظریے کو اعتبار بخشا۔

غالبؔ کی شخصیت میں خوش اخلاقی، شگفتہ مزاجی، حاضر جوابی اور انسان دوستی کی خصوصیات موجود تھیں۔ ان کا کلام بھی انھی خصوصیات سے عبارت ہے۔ اس میں تخیّل کی بلندی اور فکر کی گہرائی بھی ہے۔ تصوّف کی آمیزش بھی ہے۔ تہہ داری، معنی آفرینی، جدّتِ ادا اور ندرتِ بیان ان کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات نے اردو شاعری کی تاریخ میں انھیں ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔ عالمی شاعری کے منظر نامے پر بھی آج غالب کا نام نمایاں ہے۔

ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

ضعف سے گریہ مُبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

مومنؔ (1800/01-1852): ان کا نام محمد مومن خاں تھا۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شاہ عبدالقادر کے مدرسے میں ہوئی جہاں انھوں نے عربی اور فارسی زبانیں سیکھیں۔ مومنؔ کا موروثی پیشہ طب تھا اس لیے انھوں نے اس فن میں بھی مہارت حاصل کی۔ ریاضی، نجوم، شطرنج اور موسیقی کے بھی وہ ماہر تھے۔ مسٹر ٹامسن نے مومنؔ کو فارسی کے استاد کے طور پر دلّی کالج سے اور مہاراجہ کپورتھلہ نے اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہا لیکن انھوں نے کوئی ملازمت قبول نہیں کی۔ سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ زندگی کے آخری ایّام میں وہ گھر کے کوٹھے سے گر پڑے تھے جس کے نتیجے میں ہاتھ پاؤں ٹوٹ جانے کی وجہ سے دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اس حادثے کی تاریخ 'دست و باز و بشکست' کے ذریعے نکالی تھی۔

مومنؔ کا شمار غزل کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کی روایات کی پاسداری کی اور اس کے خط و خال کو بڑے دل کش انداز میں نمایاں کیا۔ ان کی غزلوں میں وارداتِ عشق کی ترجمانی مختلف انداز سے ہوئی ہے۔ عشقیہ جذبات کا برملا اظہار ان کی غزلوں میں رنگینی اور شگفتگی پیدا کر دیتا ہے۔ معاملہ بندی اور مکرِ شاعرانہ ان کی غزلوں کا نمایاں وصف ہے۔ مومنؔ نے غزلوں کے مقطعوں میں اپنے تخلص کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس سے

اشعار میں ایک نئی معنویت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ اشعار میں نئی نئی تراکیب کے ذریعے حسنِ معنی کو بڑھانے کا ہنر جانتے تھے۔ انھوں نے سہلِ ممتنع میں بھی اشعار کہے ہیں جو ضرب المثل بن گئے ہیں۔ غزل کے علاوہ مومنؔ نے مثنوی، رباعی، قصیدے، قطعات وغیرہ بھی کہے ہیں۔ انھیں تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ان کے دیوان موجود ہیں۔ 'انشائے مومن' ان کی فارسی تصنیف ہے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

دوسرا دور

محسنؔ کاکوروی (1826/27-1905) : ان کا نام محمد محسن تھا۔ کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شاعری کی طرف راغب ہوئے اور امیرؔ مینائی کی شاگردی اختیار کی۔ محسنؔ نے اپنی شعری صلاحیتوں کے اظہار کے لیے نعت گوئی کا انتخاب کیا اور اس میدان میں اپنے کمالِ فن کی بنا پر جدید دور کے اہم نعت گو قرار پائے۔ محسنؔ نے چند نعتیہ مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ انھوں نے کئی نعتیہ قصائد تحریر کیے جن میں ان کا لامیہ قصیدہ بہت مقبول و معروف ہے۔

سمتِ کاشی سے چلا، جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا، گنگا جل

گھر میں اشنان کریں، سرو قدانِ گوکل
جاکے جمنا پہ نہانا بھی ہے، اِک طوُلِ امل

خبر اُڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو، ہوا پر بادل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں، گھٹائیں کالی
ہند کیا، ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

جانبِ قبلہ ہوئی ہے، یورشِ ابرِ سیاہ
کہیں پھر کعبے میں قبضہ نہ کریں لات و ہبل

امیرؔ مینائی (1828/29-1900) : ان کا نام منشی امیر احمد تھا۔ ان کے والد مولوی کرم محمد حضرت شاہ مینا کے

خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے اپنے نام کے ساتھ 'مینائی' لکھتے تھے۔ امیؔر مینائی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ طب، نجوم اور جفر سے بھی انھیں دل چسپی تھی۔ وہ اسیؔر کے شاگرد تھے۔ ان کی دو کتابوں 'ارشاد السلطانی' اور 'ہدایت السلطانی' سے خوش ہو کر واجد علی شاہ نے انھیں انعام و اکرام سے نوازا۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد وہ رام پور سے وابستہ ہوگئے۔ آخرِ عمر میں حیدرآباد چلے گئے تھے، وہیں ان کا انتقال ہوا۔ 'مرأۃ الغیب' اور 'صنم خانۂ عشق' ان کے دیوان ہیں۔ 'نورِ تجلّی' اور 'ابرِ کرم' ان کی نعتیہ مثنویاں ہیں۔ 'امیر اللّغات' بھی ان کا اہم کارنامہ ہے۔

امیر مینائی نے یوں تو تمام اصناف میں طبع آزمائی کی تاہم غزل ان کا خاص میدان ہے۔ ان کی شعر گوئی کا بیش تر زمانہ لکھنؤ اور رام پور میں گزرا لیکن ان کے تغزل پر دہلوی رنگ کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ صحتِ زبان اور روزمرّہ کو بھی کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم امیؔر	سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے، نہ دیوارِ چمن بلبل	تری ہمّت کی کوتاہی، تری قسمت کی پستی ہے
قریب ہے یارو! روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر	جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

جلالؔ لکھنوی (1909-1830/31) : ان کا نام حکیم میر ضامن علی تھا۔ انھوں نے دوسرے علوم وفنون کے ساتھ طب میں بھی مہارت حاصل کی تھی۔ وہ کم عمری ہی میں شعر کہنے لگے تھے اور ناسخؔ کے شاگرد رشکؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ واجد علی شاہ کی معزولی اور 1857 کے ہنگاموں کے بعد جب لکھنؤ کے حالات خراب ہوئے تو جلالؔ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کی دعوت پر رام پور چلے گئے۔

جلالؔ نے قصائد میں پُر شکوہ اور بامحاورہ ٹکسالی زبان استعمال کی ہے۔ ان کا کلام تصنع سے پاک ہے۔ وہ زبان کے صحیح استعمال پر شعوری طور پر توجہ دیتے ہیں۔ اصلاحِ زبان کی فکر انھیں بہت زیادہ تھی اسی لیے لُغت اور قواعد کے موضوع پر 'سرمایۂ زبانِ اردو' اور 'مفید الشعرا' جیسی کتابیں لکھیں۔ انھوں نے اپنی لغات میں تذکیر و تانیث پر بھی بحث کی ہے جو اس زمانے میں لکھنوی ادب کا اہم مسئلہ بنا ہوا تھا۔

بہت بہار کی آمد سے خوش ہیں مُرغِ چمن	شگوفے دیکھیں انھیں کیا نہال کرتے ہیں
اک قدم جانا جنھیں دشوار تھا	شوق لے کر سینکڑوں منزل گیا
جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم	چمن کو پھول ملے، ہم کو داغ بھی نہ ملا

داغؔ دہلوی (1905-1831): ان کا نام نواب مرزا تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھے سات سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ماں نے بہادر شاہ ظفرؔ کے بیٹے مرزا فخرو سے شادی کر لی۔ چنانچہ ماں کے ساتھ داغؔ بھی لال قلعے میں رہنے لگے۔ یہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ لال قلعے کی شاعرانہ فضا میں شاعری شروع کی اور استاد ذوقؔ کے شاگرد ہوئے۔ استاد کے فیضِ تربیت اور اپنی مشقِ سخن سے تھوڑے ہی عرصے میں استادی کا بھی درجہ حاصل کر لیا۔ 1856 میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا اس لیے داغؔ کو اپنی والدہ کے ساتھ قلعہ چھوڑنا پڑا۔ 1857 کے ہنگامے کے بعد انھوں نے دہلی کو خیر باد کہا اور رام پور چلے گئے۔ والیِ رام پور نواب یوسف علی خاں نے داغؔ کی بڑی قدر و منزلت کی اور انھیں ولی عہد کلبِ علی خاں کا مصاحبِ خاص مقرر کر دیا۔ کلب علی خاں کے انتقال کے بعد داغؔ حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں بھی اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نظام حیدر آباد میر محبوب علی نے انھیں اپنی استادی کا شرف بخشا۔ بڑی تنخواہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً وہ انعامات سے بھی نوازے گئے۔ حیدر آباد ہی میں ان کی وفات پائی۔

داغؔ کی تصانیف میں چار دیوان 'گلزارِ داغؔ'، 'آفتابِ داغؔ'، 'ماہتابِ داغؔ' اور 'یادگارِ داغؔ' ایک مثنوی اور چند قصائد و رباعیات شامل ہیں۔ دہلی کی تباہی پر ان کا شہر آشوب بھی مشہور ہے۔

داغؔ کی شاعری کی سب سے ممتاز خصوصیت زبان کا استعمال ہے۔ سادگی و شیرینی، ترنّم و روانی اس زبان کی بنیادی صفات ہیں۔ انھوں نے محاورات کا استعمال نہایت برجستہ انداز میں کیا ہے۔ شوخی و بانکپن، رنگیں بیانی اور چُلبلا پن داغؔ کی شاعری کا حصّہ ہیں۔ اپنے کلام کی سادگی، صفائی، روانی اور عام پسند جذبات و خیالات کی ترجمانی کی بدولت داغؔ اپنے زمانے کے سب سے مقبول شاعر تھے۔ داغ کی شاعری کا اثر اُن کے معاصرین نیز بعد کے بہت سے شعرا پر بھی پڑا اور ایک خاص مدّت تک اُن کے رنگِ کلام کی تقلید ہوتی رہی۔

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کے وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر آتا ہے پروانہ

خاطر سے یا لحاظ سے، دل مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

ہوش و حواس، تاب و تواں داغؔ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

باب 7

سر سیّد احمد کا عہد

13085CH07

سر سیّد احمد خاں انیسویں صدی کے ایک بڑے رہنما اور مصلح ہیں۔ اس وقت دوسری اقوام کے مقابلے میں مسلمانوں کی حالت ابتر تھی۔ سرسید نے محسوس کیا کہ بدلے ہوئے حالات میں جدید علوم کے بغیر ان کی ترقی ممکن نہیں۔ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ان کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر توجہ کی اور جہاں جہاں خرابیاں نظر آئیں، انھیں دور کرنے کی عملی کوشش کی۔ ان کی انھی کوششوں کو 'سر سیّد تحریک' یا علی گڑھ تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اردو ادب پر سر سیّد کی تحریک کے گہرے اثرات ہیں۔ وہ ادب کی افادیت اور مقصدیت کے قائل تھے۔ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے علمی نثر کی بنیاد ڈالی۔ ان کے عہد میں ایسے بہت سے ادیب ہوئے جنھوں نے اردو نثر کے ارتقا اور فروغ میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اسی عہد میں مضمون نگاری، انشائیہ نگاری، ناول نگاری، سوانح نگاری، تاریخ نگاری اور تنقید نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

سر سیّد (1817-1898) : ان کا نام سیّد احمد خاں تھا۔ وہ دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے تعلیم کے مراحل دہلی میں طے کیے اور اپنے زمانے کے اہلِ کمال سے فیض حاصل کیا۔ 1839 میں انھوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کی۔ 1862 میں جب وہ غازی پور میں تھے، 'سائنٹفک سوسائٹی' کے نام سے انھوں نے ایک انجمن بنائی۔ اس انجمن کا مقصد ہندوستانیوں میں مختلف علوم، خاص کر سائنسی علوم کے مطالعے کو فروغ دینا تھا۔ 1869 میں سید احمد خاں انگلستان چلے گئے جہاں تقریباً ڈیڑھ برس تک ان کا قیام رہا۔ واپس آکر انھوں نے انگلستان میں شائع ہونے والے بعض علمی اور سماجی رسالوں کے طرز پر 'تہذیب الاخلاق' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس کی بدولت اردو میں مضمون نگاری کو بہت ترقی ملی۔

سید احمد خاں نے علی گڑھ میں 1875 میں ایک اسکول قائم کیا۔ یہ اسکول 1878 میں 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' اور پھر 1920 میں 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' کی شکل میں ہندوستان کا ایک نمایاں تعلیمی ادارہ بن گیا۔

1878 میں سید احمد خاں کو 'سر' کا خطاب ملا۔ اس لیے لوگ انھیں 'سرسید' کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ آخر عمر تک تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ 'آثار الصنادید'، 'اسبابِ بغاوتِ ہند'، اور 'سرکشی ضلع بجنور' ان کی خاص تصانیف ہیں۔ سائنس، فلسفہ، مذہب اور تاریخ سے متعلق ان کے مضامین کئی جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ درج ذیل ادبی اصناف کے ارتقا میں سرسید احمد خاں کے عہد کا نمایاں رول ہے۔

مضمون :

عہدِ سرسید سے پہلے اہل قلم کسی موضوع پر یا تو مستقل کتابیں لکھتے یا رسالے تصنیف کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مضامین کی شکل میں کسی موضوع پر اظہارِ خیال کا سلسلہ پہلے 'دہلی کالج' سے شروع ہوا جسے آگے چل کر سرسید نے 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعے فروغ دیا۔ سرسید کے مضامین مختلف موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے انھیں سائنسی، علمی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی وغیرہ مختلف قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

حالؔی اور شبلؔی بھی اس عہد کے اہم مضمون نگار تھے۔ انھوں نے مضمون نگاری کا معیار بلند کیا اور اسے زیادہ مرتّب اور منظّم شکل عطا کی۔ سرسید کے دوسرے رفیقوں میں محسن الملک، چراغ علی اور مولوی ذکاء اللہ نے بھی مضمون نگاری میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔

انشائیہ :

انشائیہ بھی مضمون ہی کی ایک قسم ہے۔ اس کا انداز عالمانہ اور سنجیدہ مضامین سے مختلف ہوتا ہے۔ انشائیے میں بات ہلکے پھلکے اور شگفتہ پیرایے میں کہی جاتی ہے۔ یہاں گفتگو کو اس طرح آگے بڑھاتے ہیں کہ بات سے بات نکلتی چلی جائے۔ اردو میں انشائیے کا سلسلہ بھی سرسید سے شروع ہوتا ہے۔ 'امید کی خوشی'، 'گزرا ہوا زمانہ'، 'بحث و تکرار' اور 'خوشامد' جیسے ان کے متعدد مضامین میں انشائیے کا انداز ملتا ہے۔ اس عہد میں محمد حسین آزاد نے انشائیہ نگاری کے فن کو بہت فروغ دیا۔ انھوں نے انگریزی کے تمثیلی مضامین کے طرز پر اردو میں انشائیے لکھے۔ آزؔاد کے یہ انشائیے 'نیرنگِ خیال' کے نام سے شائع ہوئے۔

ناول :

اردو میں ناول نگاری کا آغاز بھی اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ مانا جاتا ہے کہ اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد ہیں۔ 'مرأۃ العروس'، 'ابن الوقت'، 'توبۃ النصوح' اور 'بنات النعش' ان کے مشہور ناول ہیں۔ ناول نگاری کی روایت کو اسی عہد میں پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، عبدالحلیم شررؔ اور مرزا ہادی رسواؔ نے بہت کامیابی اور خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھایا۔ سرشارؔ کے 'فسانۂ آزاد'، شررؔ کے 'فردوسِ بریں' اور مرزا رسواؔ کے 'امراؤ جان ادا' کا شمار اس عہد کے اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔

سوانح :

عہدِ سرسید کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں نہ صرف اردو میں سوانح نگاری کی روایت قائم ہوئی بلکہ بڑی حد تک اس کے اصول وآداب بھی متعین ہوئے۔ اس دور کے سب سے پہلے اور باقاعدہ سوانح نگار مولانا الطاف حسین حالیؔ ہیں۔ انھوں نے 'حیاتِ سعدی'، 'یادگارِ غالبؔ' اور 'حیاتِ جاوید' جیسی اہم سوانح عمریاں لکھیں۔ اس روایت کو شبلی نعمانی نے آگے بڑھایا۔ 'المامون'، 'الفاروق'، 'سیرۃ النعمان' اور 'سیرۃ النبیؐ' وغیرہ ان کی مشہور سوانح عمریاں ہیں۔

تاریخ :

عہدِ سرسید میں اردو میں باقاعدہ تاریخ نویسی کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ سرسید کی تصانیف میں 'آثارالصّنادید'، 'تاریخِ سرکشیِ ضلع بجنور' اور 'اسبابِ بغاوتِ ہند' وغیرہ تاریخ نویسی کے دائرے میں آتی ہیں۔ اسی طرح شبلیؔ نعمانی کے یہاں تاریخ نویسی کا ایک خاص ذوق نظر آتا ہے۔ انھوں نے بہ کثرت تاریخی مضامین لکھے اور تاریخی موضوعات پر 'مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'، 'اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر' اور 'تاریخِ علم الکلام' جیسی کتابیں بھی تصنیف کیں۔

اس ضمن میں مولوی ذکاءاللہ کی خدمات بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی 'تاریخِ ہند' کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ عبدالحلیم شررؔ کے تاریخی مضامین اور خاص طور پر ان کی کتاب 'گذشتہ لکھنؤ' بھی تاریخ نویسی میں اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہے جسے ایک تہذیبی تاریخ سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔

تنقید :

اردو میں باقاعدہ تنقید نگاری کا آغاز بھی عہدِ سرسید ہی سے ہوتا ہے۔ اردو کے پہلے باقاعدہ نقاد مولانا الطاف حسین حالیؔ ہیں اور اردو کی پہلی تنقیدی کتاب 'مقدمۂ شعر وشاعری' (1893) ہے۔ حالیؔ نے اس میں شعر کی ماہیت، اچھی شاعری کی خصوصیات اور شاعر کے فرائض وغیرہ سے بحث کے بعد اپنے نظریات کی روشنی میں اردو شاعری کی مختلف اصناف (غزل، مثنوی، مرثیے) کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

اس دور کے دوسرے اہم نقاد محمد حسین آزاد ہیں۔ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' بھی اسی دور سے تعلق رکھتی ہے مگر اس میں تنقید سے زیادہ تحسین کا پہلو حاوی ہے۔ آزاد کی انفرادیت میں ان کی شگفتہ بیانی کا خاص حصّہ ہے۔ شبلی نعمانی کا شمار بھی اس عہد کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ 'موازنۂ انیس و دبیر' اور 'شعر العجم' میں انھوں نے اپنے تنقیدی نظریات تفصیل کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

ان تفصیلات سے عہدِ سرسید میں اردو نثر کی مجموعی صورتِ حال کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس دور کی اہم شخصیات کا علاحدہ ذکر کیا گیا ہے۔

محسن الملک (1817/37-1907) : ان کا نام سیّد مہدی علی اور خطاب محسن الملک تھا۔ وہ اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری ملازم ہوگئے اور ترقی کرتے کرتے تحصیل دار کے عہدے تک پہنچے۔ انھوں نے قانون کے موضوع پر دو کتابیں لکھیں جنھیں انگریز حکام نے مفید قرار دیا اور انھیں ڈپٹی کلکٹر بنا دیا۔ ان کی کارکردگی کی شہرت کی بنا پر انھیں حیدر آباد بلا لیا گیا۔ یہاں وہ مالیات کے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں ریاست کی طرف سے 'محسن الدولہ'، 'محسن الملک'، اور 'منیر نواز جنگ' کے خطابات عطا ہوئے۔ 1892 میں علی گڑھ آگئے اور باقی زندگی ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی خدمت میں صرف کر دی۔ شملہ میں ان کا انتقال ہوا اور تدفین علی گڑھ میں ہوئی۔

محسن الملک نے ہر قدم پر سرسید کے ساتھ تعاون کیا۔ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے سرسید کے افکار و خیالات کو دور دور تک پھیلانے میں مدد دی۔ وہ 'تہذیب الاخلاق' کے باقاعدہ لکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کی نثر سنجیدہ و دلکش اور زبان سادہ و آسان ہے۔

محمد حسین آزاد (1830-1910): مولانا محمد حسین آزاد دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ 1846 میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ چار سال میں انھوں نے یہاں کی تعلیم مکمل کر لی۔ آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے اردو کا پہلا اخبار 'دہلی اردو اخبار' نکالا۔ اردو کے مشہور شاعر شیخ محمد ابراہیم ذوق سے آزاد کے والد کے گہرے مراسم تھے۔ انھوں نے آزاد کو تعلیم و تربیت کے لیے ذوق کے سپرد کر دیا تھا۔

1857 تک آزاد کی زندگی بڑے عیش و آرام میں بسر ہوئی۔ وہ ادبی مشغلوں میں اپنا وقت گزارتے اور اخبار کے کاموں میں والد کی مدد کرتے تھے۔ مولوی محمد باقر ہندوستان کے پہلے صحافی تھے جنھیں انگریزوں سے بغاوت کے جرم میں گولی ماری گئی تھی۔

حکومت کی نظر میں آزاؔد مجرم تھے۔ اس لیے وہ دہلی سے فرار ہوگئے اور برسوں در بدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ آخر کار 1864 میں لاہور میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ وہاں ان کی ملاقات پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر لائٹنر سے ہوئی۔ ان کی سر پرستی میں آزاؔد نے بچوں کے لیے درسی کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں محکمۂ تعلیم کے ڈائریکٹر کرنل ہالرائڈ کے ساتھ مل کر آزاؔد نے نئی نظم نگاری کو فروغ دیا۔

آزاد کچھ دنوں گورنمنٹ کالج، لاہور میں عربی، فارسی کے پروفیسر بھی رہے۔ 1887 میں انھیں 'شمس العلما' کا خطاب ملا۔ اس دوران ان کی جوان بیٹی کی موت ہوگئی۔ آزاد اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔ آخر کار ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ ان کی زندگی کے بقیہ بیس سال دیوانگی میں بسر ہوئے۔

آزاؔد بلاشبہ اردو کے بڑے انشا پرداز ہیں۔ ان کی نثر میں جادو کی سی تاثیر ہے۔ جو لکھ دیتے ہیں دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ ان کی نثر بظاہر سادہ لیکن بہت سجی ہوئی ہوتی ہے۔ تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے وہ زبان کو رنگین بنانے کے ہنر سے واقف تھے۔

آزاؔد نے بچوں کے لیے درسی کتابیں بھی لکھیں اور 'قصصِ ہند' کے نام سے تاریخی کہانیاں بھی تحریر کیں، لیکن 'آبِ حیات' (1881) ان کا شاہکار ہے۔ یہ اردو زبان اور شاعری کی پہلی تاریخ ہے۔ اس میں اردو شاعری کے مختلف ادوار قائم کیے گئے ہیں۔ آبِ حیات میں آزاؔد کے جادو نگار قلم نے شعرا کے جو مرقّعے تیار کیے ہیں، وہ بے مثال ہیں۔ البتہ شاعروں کے کلام پر آزاد نے جو تنقید کی ہے اس میں تجزیے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کتاب میں بیان کیے گئے حالات اور واقعات بعض جگہ تحقیق کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ آزاؔد کی دوسری اہم کتابوں میں 'نیرنگِ خیال'، 'دربارِ اکبری' اور 'سخن دانِ فارس' کے نام شامل ہیں۔

مولوی ذکاءاللہ (1910-1832) : ذکاءاللہ کی پیدائش اور نشو و نما دہلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ کالج کے مضامین میں انھیں سب سے زیادہ دلچسپی ریاضی سے تھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دہلی کالج ہی میں ریاضی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آگرہ کالج میں فارسی اور اردو پڑھانے پر مامور ہوئے۔

1855 میں انھیں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنایا گیا۔ 1866 میں وہ نارمل اسکول، دہلی کے ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔ 1869 میں میور سنٹرل کالج، الہ آباد میں پروفیسر کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ 1885 میں وہ ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ انھوں نے دہلی میں وفات پائی۔

ذکاءاللہ سرسید کے رفقا میں تصانیف کی کثرت کے لحاظ سے سب سے ممتاز ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، فزکس، ہیئت، سیاست اور ادب جیسے موضوعات پر 143 کتابیں تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین کی تعداد بھی بہت ہے۔ ان کا اسلوب نگارش سیدھا سادا ہے۔ وہ عبارت آرائی سے کام نہیں لیتے۔ اردو نثر کے دامن کو وسیع کرنے اور اسے طرح طرح کے موضوعات سے مالا مال کرنے میں ذکاءاللہ کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ذکاءاللہ کی سب سے اہم تصنیف 'تاریخِ ہند' ہے جو 10 جلدوں پر مشتمل ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد (1912-1836): نذیر احمد کی پیدائش بجنور میں ہوئی۔ وہ ایک غریب گھرانے کے فرد تھے۔ علم کے شوق میں بچپن میں دہلی آ گئے۔ پہلے ایک مدرسے میں پڑھا۔ اس کے بعد دلّی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ نذیر احمد کو عربی ادب میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ انگریزی زبان کی بھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔

نذیر احمد 1863 میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1877 میں سرسالار جنگ نے انھیں حیدرآباد بلا لیا۔ کچھ عرصے بعد وہ ترقی کر کے بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہو گئے۔ قبل از وقت پنشن لے کر دہلی آ گئے اور زندگی کے بقیہ دن یہیں گزارے۔

نذیر احمد دہلی کی زبان اور محاوروں پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو میں ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس صنف کا آغاز انھوں نے شعوری طور پر نہیں کیا بلکہ اپنی بچیوں کی تربیت کے لیے الگ الگ کتابیں لکھنی شروع کیں۔ دو دو چار چار صفحات لکھ کر انھیں دیتے جاتے اور جب ان صفحات کا سبق پورا ہو جاتا تو مزید صفحات لکھ دیتے۔ اس طرح یہ کتابیں مکمل ہو گئیں۔ ان کتابوں کی مقبولیت دیکھ کر نذیر احمد نے کئی اور کتابیں لکھیں۔ یہی کتابیں اردو ناولوں کا اوّلین نقش ہیں۔ نذیر احمد کے ناولوں کے نام ہیں مرأۃ العروس' (1869)، 'بنات النعش' (1873)، 'توبۃ النصوح' (1877)، 'رویائے صادقہ'، 'ابن الوقت' (1888)، 'ایامیٰ' اور 'فسانۂ مبتلا'۔

نذیر احمد کے یہ تمام ناول مقصدی اور اصلاحی ہیں اس لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ناول نہیں، تمثیلی قصّے ہیں۔ ناول نگاری کے ابتدائی نمونہ ہونے کی وجہ سے ان میں بعض فنّی خامیاں موجود ہیں۔ البتہ ان ناولوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں اس وقت کا سماج جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ نذیر احمد نے ناولوں کے علاوہ مذہبی تصانیف اور انگریزی کتابوں کے بہت اچھے ترجمے بھی یادگار چھوڑے ہیں۔ 'الحقوق والفرائض' مذہبی تصانیف میں اور

'انڈین پینل کوڈ' کا اُردو ترجمہ 'تعزیراتِ ہند' ترجموں میں سرِ فہرست ہیں۔ انھوں نے قرآن کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

حالؔی (1837-1914/15): ان کا نام خواجہ الطاف حسین اور تخلص حالؔی تھا۔ وہ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پانی پت اور دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ انھیں باقاعدہ اور سلسلہ وار تعلیم کا موقع نہیں ملا لیکن اپنے علمی شوق اور مطالعے کے ذوق کی بدولت انھوں نے فارسی و عربی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ اپنے زمانے میں رائج مذہبی اور غیر مذہبی علوم وفنون سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔

حالی کے ادبی ذوق کی تربیت دہلی کی ادبی مجلسوں اور شیفتؔہ و غالبؔ کی صحبتوں میں ہوئی تھی۔ ان سب چیزوں نے مل کر انھیں ایک اچھا شاعر اور صاحبِ بصیرت ناقد و مصنف بنا دیا۔ 1856 میں ضلع حصار میں وہ کلکٹر کے دفتر میں ملازم ہوئے۔ 1857 کے ہنگاموں میں یہ ملازمت جاتی رہی۔ اس کے بعد وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتؔہ سے وابستہ ہو گئے اور تقریباً آٹھ برس وہ ان کے ساتھ رہے۔ شیفتؔہ کی وفات کے بعد 1872 میں لاہور کے گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہوئے۔ یہاں انگریزی کتابوں کے اردو ترجموں کی اصلاح کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ چار سال وہاں رہ کر وہ دہلی واپس آئے اور اینگلو عربک اسکول میں مدرّس ہو گئے۔

1887 میں ریاست حیدرآباد نے ان کے لیے پچھتّر روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا۔ 1891 میں جب یہ وظیفہ سو روپے ماہوار ہو گیا تو حالؔی نے اسکول کی ملازمت چھوڑ دی اور پانی پت جا کر تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ وہیں ان کی وفات ہوئی۔

سرسید کے رفقا میں حالؔی اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے سرسید کے مشن کو پورے طور پر اپنا لیا تھا۔ وہ چھوٹے بڑے تمام معاملات میں سرسید کی روش کو سراہتے اور اس کی تقلید کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے اسلوب اور طرزِ نگارش میں بھی انھوں نے سرسید کی پیروی کی۔ سرسید کی طرح ان کی نثر بھی سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔ وہ خیالات کو عام فہم بنانے کی خاطر تشبیہات واستعارات اور فارسی ترکیبوں سے بچتے ہیں۔ حالؔی کی نثر نگاری کا آغاز 1867 میں ہوا۔ ان کی پہلی نثری تصنیف 'مجالس النساء' ہے۔

نثر نگار کی حیثیت سے حالؔی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اردو میں سوانح نگاری کے بانی ہیں۔ انھوں نے تین سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ 'حیاتِ سعدی' (1886)، 'یادگارِ غالبؔ' (1897) اور 'حیاتِ جاوید' (1901)۔ حالؔی کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے 'مقدمۂ شعر و شاعری' (1893) لکھ کر اردو میں باقاعدہ تنقید نگاری کی روایت قائم کی۔

حالی نے اس مقدمے میں تنقید کے اچھے اور مفصّل نمونے پیش کیے ہیں۔ مقدمے کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ شاعری کو مفید اور با مقصد ہونا چاہیے۔ چوں کہ پرانی شاعری اس معیار پر پوری نہیں اترتی اس لیے اردو میں نئی شاعری کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کے اردو تنقید پر گہرے اثرات مرتّب ہوئے۔

سرشار (1846-1902/03) : ان کا نام پنڈت رتن ناتھ اور تخلص سرشار تھا۔ ان کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ وہ یہیں پلے بڑھے۔ ابتدائی تعلیم اور فارسی وغیرہ پڑھنے کے بعد انھوں نے کیننگ کالج، لکھنؤ میں داخلہ لیا لیکن درمیان میں تعلیم چھوڑ دینے کی وجہ سے کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔

تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد لکھیم پور کھیری میں وہ ایک اسکول میں مدرس ہو گئے۔ اس کے ساتھ 'مراسلۂ کشمیر'، 'اودھ پنچ' اور بعض دوسرے اخبارات میں مضمون نویسی بھی کرتے رہے۔ ان مضامین نے انھیں ادبی حلقوں میں متعارف کرایا۔ چنانچہ 1878 میں منشی نول کشور نے انھیں 'اودھ اخبار' کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ اودھ اخبار سے سرشار کا تعلق اس لحاظ سے بہت مفید ثابت ہوا کہ سرشار نے اس میں اپنا مشہور ناول 'فسانۂ آزاد' قسط وار شائع کرنا شروع کیا۔ یہ ایک دلچسپ ناول تھا جس نے انھیں شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا۔

1893 کے آس پاس وہ 'اودھ اخبار' سے الگ ہو گئے۔ 1895 میں مہاراجا کشن پرشاد کی دعوت پر حیدرآباد چلے گئے اور وہاں 'دبدبۂ آصفی' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ حیدرآباد ہی میں ان کی وفات ہوئی۔

سرشار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے 'فسانۂ آزاد' میں چھوٹے چھوٹے قصّوں، دل چسپ واقعات، پرلُطف مناظر اور رنگ برنگے کرداروں کی وہ بھیڑ بھاڑ اور گہما گہمی پیدا کر دی ہے جس کی مثال ہمارے ادب میں اور کہیں نہیں ملتی۔ سرشار کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ اس ناول کے ذریعے انھوں نے لکھنوی تہذیب و معاشرت، اس کے بازاروں اور محلّات، اس کے رسم و رواج، اس کے میلے ٹھیلوں اور ہر طبقے کے افراد کی نہایت کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ فسانۂ آزاد کے دو مشہور کردار 'آزاد' اور 'خوجی' ہیں، جو اردو ادب میں زندہ کرداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرشار کو زبان پر بھی بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ وہ سادہ و سلیس نثر بھی لکھتے ہیں اور مزہ بدلنے کے لیے مقفّٰی اور مسجّع عبارت سے بھی گریز نہیں کرتے۔

سرشار نے 'فسانۂ آزاد' کے علاوہ بھی کئی طبع زاد ناول 'جامِ سرشار'، 'سیرِ کہسار'، 'خدائی فوجدار' وغیرہ لکھے ہیں اور بعض ناولوں کے انگریزی ترجمے بھی کیے ہیں۔

شبلی نعمانی (1857-1914) : شبلی اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدا میں اعظم گڑھ میں تعلیم پائی۔ بعد میں اسلامی علوم اور عربی ادب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے رام پور، سہارنپور اور لاہور کا سفر کیا۔ فارسی اور عربی دونوں زبانوں پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ شبلی شاعر بھی تھے۔ ان کا ادبی ذوق نہایت بلند اور پاکیزہ تھا۔

شبلؔی کے والد وکیل تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ شبلؔی بھی وکیل بنیں۔ چنانچہ وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کی لیکن جلد ہی اس پیشے سے اُکتا گئے۔ کچھ دن امینِ دیوانی کی حیثیت سے سرکاری ملازمت بھی کی۔ ان کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز صحیح معنوں میں اس وقت ہوا جب وہ 1883 میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج، علی گڑھ میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہاں انھیں نئے خیالات اور نئے علوم وفنون سے واقفیت کا موقع ملا۔ پروفیسر آرنلڈ جیسے استاد کی رفاقت اور سرسید کی صحبت کی بنا پر شبلؔی نے بہت جلد نئے ماحول میں اپنے لیے ممتاز جگہ بنالی۔ اب حالؔی اور ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ ساتھ شبلؔی کا شمار بھی سرسید کے نامور رفقا میں کیا جانے لگا۔

1898 میں سرسید کی وفات کے بعد وہ علی گڑھ کالج کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ 1901 سے 1905 تک حیدر آباد میں 'ناظم سررشتۂ علوم وفنون' رہے۔ 1905 میں وہ لکھنو آ گئے اور 'ندوۃ العلما' کے تعلیمی شعبے کی ذمے داری سنبھال لی۔ شبلؔی کا خیال تھا کہ آنے والی نسلوں کو ایک ایسے نصابِ تعلیم کی ضرورت ہے جس میں قدیم و جدید دونوں علوم شامل ہوں۔ ندوۃ العلماء میں اس وقت کا نصابِ تعلیم شبلؔی کی فکر کا نتیجہ تھا۔ 1913 میں وہ یہاں سے مستعفی ہو گئے۔ اپنی کتابوں کے مواد کی فراہمی کے لیے انھوں نے مصر، ترکی اور شام کا بھی سفر کیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اعظم گڑھ میں 'دارالمصنفین' کے نام سے تحقیق و تصنیف کا ایک ادارہ قائم کریں۔ ان کا یہ خواب ان کی وفات کے بعد پورا ہوا۔

سرسیّد اور ان کے رفقا کے درمیان شبلؔی سب سے کم عمر ہیں، اس کے باوجود ان کے کاموں کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ان کی تصانیف اور مضامین کے موضوعات سیاست، مذہب، فلسفہ، تاریخ، سوانح، سیرت، ادب، شاعری اور تنقید تک پھیلے ہوئے ہیں۔

شبلؔی کی نثر بہت خوب صورت اور دلکش ہے۔ انھوں نے سرسید احمد خاں اور محمد حسین آزؔاد دونوں کے درمیان

سے اپنی راہ نکالی ہے۔ ان کی نثر نہ تو بالکل بے رنگ اور سپاٹ ہوتی ہے اور نہ اس میں بہت زیادہ رنگینی اور آرائش پائی جاتی ہے۔ شبلؔی خیالات کی وضاحت کے ساتھ طرزِ ادا کے حسن کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔

شبلؔی نے حالؔی کے بعد سوانح نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ 'المامون' (1888) 'سیرۃ النعمان' (1890) اور 'الفاروق' (1899) ان کی مشہور سوانح عمریاں ہیں۔ 'موازنۂ انیس و دبیر' (1904) اور 'شعرالعجم' (1906-1912) شبلؔی کی ادبی اور تنقیدی کتابیں ہیں۔ 'سیرت النبیؐ' شبلؔی کی آخری تصنیف ہے جسے ان کے شاگرد سیّد سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔

رسوؔا (1857/58-1931) : ان کا اصل نام محمد ہادی، قلمی نام مرزا رسوا اور تخلّص مرزؔا تھا۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر اوورسیر کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد بہ حیثیت اوورسیر ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ 1887 میں پنجاب یونیورسٹی سے انھوں نے بی۔ اے۔ کیا۔

رسوا بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ شعر و ادب کے علاوہ کیمسٹری سے انھیں بے حد دلچسپی تھی۔ ملازمت کے دوران ولایت سے کیمسٹری کے آلات منگوائے اور گھر پر تجربے کیے۔ کیمیا بنانے کا شوق اس قدر رہا کہ ملازمت ترک کر دی اور ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے ٹیوشن کرنے لگے۔ وہ نخّاس مشن اسکول، لکھنؤ میں فارسی کے استاد بھی رہے۔ کچھ دنوں رائڈ کرسچین کالج، لکھنؤ میں بھی پڑھایا۔ آخر میں حیدرآباد جا کر دارالترجمہ میں ملازم ہو گئے اور وہیں اُن کی وفات ہوئی۔

رسوا ایک بلند پایہ ناول نگار تھے۔ ناول نگاری کے فن میں ان کا شعور بہت پختہ تھا۔ رسوا نے یوں تو چھے ناول لکھے ہیں، لیکن 'امراؤ جان ادا' ان کا شاہکار ہے۔ اس کا پلاٹ مربوط، کردار نگاری مؤثر اور مکالمے موزوں ہیں۔ یہ ناول لکھنوی تہذیب و معاشرت کے ایک خاص رُخ کی حقیقت پسندانہ ترجمانی کرتا ہے۔ مشاہدے کی گہرائی، جزئیات نگاری اور انسانی نفسیات پر گرفت کے لحاظ سے بھی یہ ایک اچھا ناول ہے۔ رسوؔا کے دوسرے ناولوں میں 'ذاتِ شریف' اور 'شریف زادہ' قابلِ ذکر ہیں۔

رسوا کی نثر صاف وشستہ اور اندازِ نگارش بے تکلف اور رواں ہے۔ محاورات اور روزمرّہ کے استعمال نے اس کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ مرقّع کشی اور منظر نگاری میں بھی انھیں کمال حاصل ہے۔ موقع بہ موقع ظرافت سے بھی کام لیتے ہیں۔

شرؔر (1926-1860) : ان کا نام عبدالحلیم اور تخلص شرؔر تھا۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ نو سال کی عمر تک یہیں رہے۔ ان کے نانا منشی قمرالدین واجد علی شاہ کی ملازمت میں 'مٹیا برج' کلکتے میں رہتے تھے۔ 1869 میں انھوں نے شرؔر کو اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں انھوں نے مختلف اساتذہ سے عربی، فارسی، منطق اور طِب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانے میں کچھ انگریزی بھی سیکھ لی۔ بعد میں لکھنؤ اور دہلی میں فقہ اور حدیث کا علم بھی حاصل کیا۔

شرؔر کو کم عمری سے مضمون نویسی کا شوق تھا۔ کلکتہ کے زمانۂ قیام ہی سے مختلف اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ وہ 'اودھ اخبار' کے نامہ نگار بھی تھے۔ 1880 میں وہ کلکتے سے لکھنؤ آئے اور اودھ اخبار کے ادارتی عملے میں شامل ہوگئے۔ 1888 میں انھوں نے لکھنؤ سے رسالہ 'دلگداز' جاری کیا۔ 1891 میں ریاست حیدرآباد میں ملازم ہوگئے۔ 1895 میں انگلستان کا سفر کیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد 1898 میں 'دلگداز' کو دوبارہ حیدرآباد سے جاری کیا۔ 1900 میں لکھنؤ واپس آگئے۔ یہیں اُن کا انتقال ہوا۔

شرؔر کے مقالات اور تصانیف کے موضوعات میں بھی بڑی وسعت اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ ان کے ادبی کارناموں میں ناول، تاریخ، انشائیہ، تنقید، صحافت، ڈراما وغیرہ شامل ہیں۔

شرؔر نے اردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ 'فردوسِ بریں' ان کا سب سے اہم تاریخی ناول ہے۔ خود شرؔر کو اپنے ناولوں میں 'فردوسِ بریں'، 'ملک العزیز ورجنا'، 'فلورا فلورنڈا'، 'فتحِ اندلس' اور 'ایّامِ عرب' زیادہ پسند تھے۔

شرؔر نے تاریخی مضامین بھی لکھے ہیں اور بعض تاریخی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ لکھنؤ کی مذہبی و معاشرتی تاریخ پر مبنی 'گذشتہ لکھنؤ' ان کی مشہور کتاب ہے۔ شرؔر کو صحافت سے بھی دل چسپی رہی ہے۔ انھوں نے متعدد رسالے نکالے لیکن شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے 'دلگداز' کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ان کے ناول اسی میں قسط وار شائع ہوتے تھے۔ اردو کی ادبی صحافت میں اس رسالے کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آزاد نظم اور نظم معرّیٰ کو ترقی دینے میں بھی شرؔر کا خاص رول رہا ہے۔

راشد الخیری (1936-1868) : ان کا نام محمد عبدالراشد تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد میں مولوی خیر اللہ بڑے نیک بزرگ گزرے ہیں۔ اسی نسبت کے اظہار کے لیے انھوں نے 'خیری' کو اپنے نام کا جز بنالیا تھا۔ بچپن میں انھیں پتنگ بازی کا بڑا شوق تھا اس لیے تعلیم میں ان کا دل نہیں لگا۔ لیکن راشد کے والدہ نے انھیں مولوی

نذیر احمد کے سپرد کر دیا۔ جو اُن کے پھوپھا تھے۔ استاد کی صحبت رنگ لائی اور راشد الخیری کو تعلیم کا ایسا چسکا لگا کہ پھر انھوں نے خود ہی تعلیمِ نسواں کے لیے ایک ادارہ قائم کر لیا۔ انھوں نے عورتوں کی اصلاح اور فلاح و بہبود کے لیے ناول اور افسانے بھی لکھے اور 'عصمت' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا۔

راشد الخیری کو مُصوّرِ غم بھی کہا جاتا ہے۔ 'سیّدہ کا لعل' لکھنے کے بعد انھیں یہ لقب ملا تھا۔ وہ طبیعت کے لحاظ سے بذلہ سنج بھی تھے۔ چنانچہ 'دادا لال بجُھکّڑ'، 'نانی عشّو' اور 'ولایتی ننّھی' اسی قبیل کے ناول ہیں۔ 'سمرنا کا چاند'، 'صبحِ زندگی'، 'ماہِ عجم'، 'محبوبۂ خداوند' اور 'منازل السائرہ' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ انھوں نے دہلی میں انتقال کیا۔

باب 8

علّامہ محمد اقبالؔ کا عہد

13085CH08

آزاد اور حالی کی کوششوں سے نظمِ جدید نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ وہ نظم تھی جو بڑی حد تک اپنے موضوعات کے اعتبار ہی سے نہیں تکنیک کے اعتبار سے بھی نئی تھی۔ چوں کہ ان شعرا کی ذہنی تربیت مشرقی آدابِ فن کے تحت ہوئی تھی اس لیے انھوں نے اپنی نظموں میں قصیدے، مثنوی یا مرثیے کی مروّجہ ہیئت ہی کا استعمال کیا۔ موضوعات کا دائرہ بھی بے حد محدود تھا۔ نظم شاعر کے اندر کی آواز نہیں بنی تھی۔ ابھی نظم کو ایک ایسے شاعر کا انتظار تھا جو نظم کو پوری طرح قائم کر دے۔ یہ کام اقبال نے کیا۔ اقبال کے مفاہیم و موضوعات میں ہمہ گیری تھی۔ ان کی زبان میں تخلیقی جوہر نمایاں تھا۔ ان کی نظموں کی تکنیکوں اور اسالیب میں بھی رنگارنگی تھی۔ اگرچہ اکبرالہ آبادی اقبالؔ کے قریبی پیش رو تھے لیکن ان کے دائرۂ کار کی ایک الگ دنیا تھی جو بے حد مخصوص بھی تھی۔ عہدِ اقبال میں نظمؔ طباطبائی، سرؔور جہاں آبادی، سیمابؔ اکبرآبادی، چکبست لکھنوی، عظمت اللہ خاں اور جوشؔ ملیح آبادی نے نظم کو نئے نئے اسالیب سے متعارف کرایا۔ موضوعات کا دائرہ بھی وسیع ہوا۔ شعرا نے نظم کے پیرایے میں اپنے عہد کے خارجی اور داخلی اضطراب کو بھی جگہ دی اور ان مسائل کو بھی موضوع بنایا جن کا تعلق وطنِ عزیز کی محکومی سے تھا۔ شعرا نے حبّ الوطنی کے نغمے گائے اور ایسی نظمیں لکھیں جن کا مقصد آزادی کے پرستاروں کے حوصلوں کو تازہ دم رکھنا تھا۔

نظمؔ طباطبائی (1852/53-1933) : ان کا نام سید علی حیدر تھا۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ 1868 میں اپنے والد کے ساتھ مٹیا برج (کلکتہ) چلے گئے۔ وہیں انھوں نے درسِ نظامی کی تعلیم مکمل کی۔ نظم طباطبائی 1887 تک کلکتے میں ہی مختلف ملازمتیں کرتے رہے۔ پھر 1918 میں وہ دارالترجمہ حیدرآباد سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں انھوں نے کئی کتابوں کے ترجمے کیے اور شائع ہونے والی کتابوں پر نظرِ ثانی کی۔ مختلف علوم کی اصطلاحات وضع کرنے میں بھی انھوں نے اہم حصّہ لیا۔ ان کا انتقال حیدرآباد میں ہوا۔

نظم طباطبائی عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں سے بہ خوبی واقف تھے۔ فلکیات اور علمِ عروض سے انھیں خصوصی دل چسپی تھی۔

انھوں نے 1900 میں دیوانِ غالبؔ کی مکمل شرح حیدرآباد سے شائع کی۔ اس شرح کا معیار اور اس کی علمی سطح خاصی بلند ہے۔ اس میں غالبؔ کے اشعار کا تنقیدی محاکمہ پیش کیا گیا ہے اور محاسنِ شعر کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ کئی جگہ خامیوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ نظمؔ طباطبائی کا ایک اور اہم کارنامہ ان کی نظم 'گورِغریباں' ہے۔ اس میں انھوں نے انگریزی زبان کے شاعر ٹامس گرے (Thomas Gray) کے 32 بندوں پر مشتمل مشہور نوحے (Elegy Written in a Country Churchyard) کا ترجمہ جس فنّی اہتمام اور ہنرمندی سے کیا ہے، وہ حیرت انگیز ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمے میں اصل نظم کا سوز اور درد انگیزی کی کیفیت برقرار ہے۔ 'دیوانِ طباطبائی' اور 'صوتِ تغزل' ان کے شعری مجموعے ہیں۔

سرورؔ جہان آبادی (1873-1910) : ان کا نام درگا سہائے تھا۔ پیلی بھیت (اتر پردیش) کے قصبہ جہان آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ بعد کی تعلیم مولوی سید کرامت حسین سے حاصل کی۔ انھیں کی صحبت میں شعروسخن کا شوق پیدا ہوا اور سرور نے انھیں سے اصلاح شعر بھی لی۔

سرور کو انگریزی پڑھنے کا بھی شوق ہوا۔ ایک پوسٹ ماسٹر سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور بعد میں مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا۔ وہ بچپن ہی سے نظمیں کہنے لگے تھے جو اس عہد کے مشہور رسالوں میں شائع بھی ہوئیں۔ سرورؔ نے غزلیں بھی کہیں، بچوں کے لیے شاعری بھی کی اور کئی انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی کیا لیکن ان کی شہرت و عظمت ان کی نظم نگاری کے سبب ہے۔ سرور کی نظموں میں جذبۂ حبِّ وطن اور منظرنگاری کے حسین مرقعے ملتے ہیں۔ 'جامِ سرور' اور 'خم خانۂ سرور' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ قومی شاعری کے فروغ میں ان کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

علّامہ محمد اقبالؔ (1873/77-1938) : اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان اصلاً کشمیری تھا۔ انھوں نے سیالکوٹ کے مشہور عالم شمس العلما مولوی سید میر حسن کے زیرِ سایہ تعلیم و تربیت کے ابتدائی مراحل طے کیے۔ سیالکوٹ کے اسکاچ مشن اسکول سے 1893 میں میٹرک اور 1895 میں انٹر پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے 1897 میں بی۔ اے اور 1899 میں فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ فلسفے کے ان کے استاد پروفیسر ٹامس آرنلڈ تھے۔ 1905 میں اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ وہاں انھوں نے 1907 میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے 'فلسفۂ عجم' کے موضوع پر پی، ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1908 میں انھوں نے لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور اسی سال وطن واپس آ گئے۔

اقبال کو اپنی عمر کے ابتدائی حصّے میں سید میر حسن کی سرپرستی میں جو شعری ماحول میسّر آیا، اس نے ان کے دل میں شعر کہنے کا شوق پیدا کر دیا۔ قیاس ہے کہ وہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے سے پہلے ہی سیدھی سادی غزلیں کہنے لگے تھے۔ 1894 کے آس پاس اقبال داغؔ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے اور بذریعۂ ڈاک اپنی غزلیں حیدرآباد بھیج کر ان سے اصلاح لینے لگے لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک جاری نہیں رہا۔ داغؔ نے اصلاح کی ضرورت نہ دیکھ کر انھیں جلد ہی فارغ کر دیا۔ گورنمنٹ کالج، لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں اقبال لاہور میں منعقد ہونے والی شعری نشستوں میں باقاعدہ شرکت کرنے لگے۔ اس زمانے میں روایتی انداز کی غزل گوئی کے بجاے وہ نئے انداز کی نظم گوئی کی طرف مائل ہوگئے۔ انھوں نے انجمن حمایتِ اسلام کے بڑے بڑے جلسوں میں جب اپنی نظمیں سنائیں تو وہ بے حد پسند کی گئیں۔ ادھر شیخ عبدالقادر کے رسالے 'مخزن' میں بھی ان کی نظمیں نمایاں مقام حاصل کرنے لگیں۔ 1904 میں اقبال نے انجمن کے جلسے میں اپنی مشہور نظم 'تصویرِ درد' سنائی جو وطن پرستی اور ہندو مسلم اتحاد کی عمدہ مثال ہے۔

اقبال اردو کے وہ منفرد شاعر ہیں جن کے یہاں شاعری اور فکر گھُل مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں اور انسان کو آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ہماری قومی زندگی کو ذہنی و فکری اعتبار سے انتہائی بلندیوں سے ہم کنار کیا ہے۔ انھوں نے اہلِ مشرق کے سوئے ہوئے ذہن کو جگانے اور انھیں زندہ قوم بنانے کے فرائض انجام دیے۔

اقبالؔ کا عہد سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کا عہد تھا۔ اس عہد میں ترقی کی رفتار تیز تھی۔ دولت مند ممالک میں اقتدار اور دولت کی ہوس اور بڑھ گئی تھی۔ پس ماندہ اقوام پہلے کے مقابلے کچھ زیادہ ہی مظالم کا شکار تھیں۔ نوآبادیاتی نظام، لبرلزم اور جمہوریت کے نام پر اپنے اقتدار کا دائرہ وسیع کرتا جا رہا تھا۔ ایسے میں اقبالؔ اپنے عہد کی آواز بن کر اٹھے اور ان کی شاعری پس ماندہ اقوام کے لیے بیداری کا پیغام بن گئی۔

اقبالؔ کی شاعری کے ناقدین نے ان کے کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ابتدا سے 1905 تک ہے۔ اس دور میں اقبالؔ حقیقت کے متلاشی نظر آتے ہیں اور مشاہدۂ فطرت کے ذریعے کائنات کے سربستہ رازوں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظمیں 'ہمالہ'، 'گلِ رنگیں'، 'انسان اور بزمِ فطرت' اور 'کنارِ راوی' اس کیفیت کا پتا دیتی ہیں۔ اسی دور میں اقبالؔ نے وطنیت اور ہندو مسلم اتحاد پر بھی نظمیں کہیں۔ 1905 سے 1908 تک اقبالؔ کا قیام

یورپ میں رہا لہٰذا ان کے دوسرے دور کا کلام قیامِ یورپ سے متعلق ہے۔ یہاں وہ زندگی میں حرکت اور عمل کے قائل نظر آتے ہیں۔ 1908 کے بعد اقبالؔ کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ان کا ذہن کئی طرح کی الجھنوں کا شکار رہا۔ مشرقِ وسطیٰ میں اسلامی ریاستوں پر نو آبادیاتی طاقتوں کے تسلط نے اقبالؔ کو مظلوموں کی حمایت پر مجبور کر دیا۔ ان کی اس دور کی نظموں میں 'شعاعِ آفتاب'، 'طلوعِ اسلام' اور 'خضرِ راہ' قابلِ ذکر ہیں۔ اس دور میں اپنے پیغام کو ہندوستان سے باہر پہنچانے کے لیے انھوں نے فارسی میں شعر کہنا شروع کیا۔

اقبالؔ کو بے پناہ شہرت شاعری کے ذریعے حاصل ہوئی تاہم ان کی نثری تصانیف بھی کم اہمیت کی حامل نہیں۔ ان کی پہلی باقاعدہ نثری تصنیف 'علم الاقتصاد' ہے۔ 'فلسفۂ عجم' اقبالؔ کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی تھی۔ 1930 میں ان کے انگریزی خطبات کا مجموعہ 'Reconstruction of Religious Thoughts in Islam' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ 1958 میں بزمِ اقبالؔ لاہور کی طرف سے اس کتاب کا اردو ترجمہ 'تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے خطبات، مقالات اور مکاتیب کے بھی متعدد مجموعے ہیں۔ ان کے مکاتیب کا کلّیات اردو اکادمی، دہلی نے چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔ 'بانگِ درا'، 'بالِ جبریل'، 'ضربِ کلیم' اور 'ارمغانِ حجاز' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'ارمغانِ حجاز' کا ایک حصّہ فارسی کلام پر مشتمل ہے۔

کلامِ اقبال کی بنیاد عشق، خودی اور عمل پر قائم ہے۔ اقبالؔ کے فارسی کلام میں 'اسرارِ خودی'، 'رموزِ بے خودی'، 'پیامِ مشرق'، 'زبورِ عجم'، 'جاوید نامہ'، 'مسافر' اور 'پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق' شامل ہیں۔ اقبالؔ، غالب کے علاوہ فارسی میں حافظؔ، بیدلؔ، نظیریؔ اور رومیؔ سے متاثر ہیں۔ فارسی کے مشہور شاعر رومیؔ کو وہ پیرِ رومی اور خود کو مریدِ ہندی کہتے ہیں۔

مشرق اور مغرب کے جن مفکرین سے اقبالؔ متاثر ہوئے ان میں حضرت شیخ احمد سرہندی مُجدّدِ الفِ ثانی، جلال الدین رومیؒ، گوئٹے، برگساں اور نطشے قابلِ ذکر ہیں۔

اقبالؔ نے شعری ہیئت اور افکار و اسالیب کی سطح پر اپنے بعد کی نسل کو بہت متاثر کیا۔ اُن کے بعد جوشؔ، فیضؔ، فراقؔ، ن۔م۔ راشدؔ اور اختر الایمان جیسے شاعروں نے بھی اردو شاعری میں تاریخی رول ادا کیا، اس کے باوجود اقبال بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اقبال کی غزلوں سے چند اشعار درج ذیل ہیں:

2019-20

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے   خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

گرچہ میں تیری دید کے قابل رہا نہیں   تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی   یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا   ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی تھا

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم   جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اگر کج رَو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟   مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟

چکبست لکھنوی (1926-1882) : ان کا نام پنڈت برج نرائن چکبست تھا۔ وہ کشمیری برہمن تھے۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ وکالت ان کا پیشہ تھا۔ جن شعرا نے اردو میں قومی شاعری کو فروغ دیا ان میں چکبست کا اہم مقام ہے۔ ان کی شاعری کے خاص موضوعات 'حبّ الوطنی' اور قومی بیداری ہیں۔ بال گنگا دھر تلک اور گوپال کرشن گوکھلے کے عزم وعمل سے وہ بہ طورِ خاص متاثر ہوئے۔ انھوں نے ان کی تعریف وتحسین میں نظمیں بھی لکھی ہیں۔

چکبست بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ ان کی زبان میں سادگی اور پُرکاری پائی جاتی ہے۔ اس میں ہندی تلمیحات نے بھی رنگ بھرا ہے۔ سیاسی خیالات کی آمیزش نے ان کی شاعری کو عصری احساسات کا آئینہ بنا دیا۔ 'صبحِ وطن' ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ چکبست مشترکہ تہذیب کے علم بردار تھے۔ 'آصف الدولہ کا امام باڑہ'، 'پھول مالا' اور 'رامائن کا ایک سین' ان کی بہترین نظمیں ہیں۔ ان کی غزل کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہے :

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب   موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا

صحنِ چمن سے دوُر انھیں باغباں نہ پھینک   تنکے جو یادگار مرے آشیاں کے ہیں

عظمت اللہ خاں (1927-1887): عظمت اللہ خاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ پانچ ہی برس کے تھے کہ ان کے والد انھیں اپنے ساتھ لے کر دہلی سے حیدرآباد جا بسے جہاں انھوں نے ابتدائی تعلیم پائی۔ بعد میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں سے فراغت کے بعد وہ حیدرآباد واپس آ گئے اور محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہوگئے۔ تپِ دق کے مرض میں حیدرآباد ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

عظمت اللہ خاں نے اردو شاعری کو ہندی بحروں اور اوزان سے متعارف کرایا۔ اس تجربے سے اردو شاعری میں نئی لے اور نیا آہنگ پیدا ہوا۔ عظمت اللہ خاں کے اس تجربے کو ان کے بعض معاصرین نے بھی قبول کیا اور ہندی عروض کے اصولوں کے مطابق اردو میں گیت اور نظمیں لکھنے لگے۔ انھوں نے ہندی شعری روایت کا لحاظ رکھتے

ہوئے عشقیہ جذبات کی عکاسی میں بھی ہندوستانی عناصر کو داخل کیا۔ 'سریلے بول' ان کی اسی نہج پر کہی گئی نظموں اور گیتوں کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے انگریزی نظموں کے تراجم بھی کیے ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی (1896/98-1982) : ان کا نام شبّیر حسن خاں تھا۔ ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ پہلے شبّیر اور بعد میں جوش تخلص اختیار کیا۔ جوش کے پردادا، دادا اور والد سب صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اگرچہ انھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی لیکن مطالعے کے شوق سے ان کے علم اور سخن فہمی میں اضافہ ہوتا رہا۔ تلاشِ معاش کے سلسلے میں انھوں نے حیدرآباد، دلّی اور ممبئی کا سفر کیا۔ بالآخر دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد میں ملازم ہوئے۔ وہاں سے دِلّی آکر رسالہ 'کلیم' جاری کیا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی منسلک رہے۔ فلموں کے لیے گیت اور کہانیاں بھی لکھیں اور پھر سرکاری رسالے 'آجکل' کے مدیر مقرر ہوئے۔ 1956 میں وہ پاکستان چلے گئے اور وہیں اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا۔

اردو نظم نگاری میں اقبالؔ کے بعد جوشؔ کا نام اہم ہے۔ یوں تو جوشؔ نے غزلیں بھی کہی ہیں مگر اردو شاعری میں بہ حیثیت نظم گو ان کا مرتبہ بلند ہے۔ جوشؔ کے متعدد شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں، جن میں 'روح ادب'، 'نقش و نگار'، 'شعلہ و شبنم'، 'فکر و نشاط'، 'رامش و رنگ'، 'سنبل و سلاسل'، 'سرود و خروش'، 'حرف و حکایت' اور 'سموم و صبا' قابلِ ذکر ہیں۔

جوش کی ابتدائی نظموں میں فطرت کی عکاسی ملتی ہے۔ ان نظموں پر اقبالؔ اور ٹیگور کے اثرات نمایاں ہیں۔ بعد میں وہ رومانی اور پھر سیاسی نظمیں لکھنے لگے۔ اِسی لیے اُنھیں 'شاعرِ فطرت'، 'شاعرِ شباب' اور 'شاعرِ انقلاب' کہا جاتا ہے۔

جوش کو زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ وہ تشبیہات اور صنائع کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں رواں دواں اور پُر زور ہیں۔ نثر میں بھی جوش نے کچھ مضامین اور اپنی خودنوشت 'یادوں کی برات' لکھی ہے۔

حفیظؔ جالندھری (1900-1982) : ان کا نام محمد حفیظ اور کنیّت ابوالاثر تھی۔ جالندھر کے ایک متوسّط نومسلم راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی تعلیم مدرسے سے شروع کی لیکن اسے مکمل نہ کر پائے اور شعروشاعری کی طرف متوجہ ہوگئے۔ وہ مشاعروں کے بہت مقبول شاعر تھے۔

حفیظ کی شہرت ان کی طویل مثنوی 'شاہنامۂ اسلام' کے سبب ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ 'نغمۂ راز'، 'سوز و ساز' اور 'تلخابۂ شیریں' ان کی شاعری کے مجموعے ہیں۔ حفیظ کی شاعری غنائیت اور نرم روی کے لیے مشہور ہے۔ ان کے گیت بھی موسیقی سے پُر اور دلکش ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ہیئت کے تجربے بھی کیے ہیں اور بچّوں کے لیے بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ 'شاہنامۂ اسلام' کے حصّۂ دوم میں شامل 'صحرا کی دعا' سے انتخاب حسبِ ذیل ہے:

خبر کیا تھی الٰہی ایک دن ایسا بھی آئے گا | کہ تیرا ساقیِ کوثرؐ یہاں تشریف لائے گا
خبر کیا تھی یہاں تیرے نمازی آ کے ٹھہریں گے | شہید آرام فرمائیں گے غازی آ کے ٹھہریں گے
خبر ہوتی تو میں شبنم کے قطرے جمع کر رکھتا | چھپا کر ایک گوشے میں مصفّا حوض بھر رکھتا
وہ پانی ان مقدس مہمانوں کو پلا دیتا | میں اپنی تشنگی دیدارِ حضرتؐ سے بجھا لیتا
مرے سر پر سے گزرا نوحؑ کے طوفان کا پانی | تاسُّف ہے کہ مجھ سے ہوگئی اس وقت نادانی

جمیلؔ مظہری (1904-1979/80): ان کا نام سید کاظم علی تھا۔عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم موتیہاری اور مظفر پور میں ہوئی۔کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔پٹنہ کالج میں اردو کے اسسٹنٹ لکچرر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔بعد میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوگئے ۔انتقال مظفر پور میں ہوا۔

جمیل مظہری کا شمار دورِ جدید کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔انھوں نے نظم کے علاوہ رباعیاں، مرثیے اور غزلیں بھی لکھی ہیں۔فکر و فلسفہ اور حبّ الوطنی ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ان کے اہم شعری مجموعے 'آثارِ جمیل'، 'فکرِ جمیل'، 'نقشِ جمیل'، 'وجدانِ جمیل' وغیرہ ہیں۔

'اجتماعِ ضدّین'، 'دو اقبال'، 'غالب کے نقشِ قدم پر'، 'مجھے کہنا ہے'، اور 'یادِ ماضی' ان کے مضامین کے مجموعے ہیں۔ان کی غزل کا یہ مطلع بھی بہت مشہور ہے ۔

بہ قدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا | اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دَم نکل جائے آدمی کا

اخترؔ شیرانی (1905-1948) : ان کا نام محمد داوَد خاں تھا۔ٹونک میں پیدا ہوئے۔ان کی پرورش لاہور میں ہوئی اورینٹل کالج لاہور سے انھوں نے تعلیم حاصل کی۔اُنھیں ادب کے علاوہ فنِ مصوّری اور موسیقی سے بھی لگاوَ تھا۔ اختر شیرانی نے رسالہ 'ہمایوں'، 'سہیلی' اور 'شاہ کار' کی ادارت بھی کی۔1925 میں انھوں نے اپنا رسالہ 'انتخاب' جاری کیا۔بعد میں اس کا نام 'بہارستان' رکھا۔اس کے بعد رسالہ 'خیالستان' اور 'رومان' بھی نکالا۔

اختر شیرانی نظم نگار اور گیت کار کے طور پر مشہور ہوئے۔ان کی نظمیں رومانی شاعری کی بہترین مثال ہیں۔ انھوں نے نظم کی روایتی ہیئتوں کے ساتھ ساتھ نئی ہیئتوں میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔ان کی یہ نظمیں دلچسپ اور دلکش ہیں۔'شعرستان'، 'صبحِ بہار'، 'نغمۂ حرم'، 'طیورِ آوارہ'، 'اخترستان'، 'لالۂ طور' اور 'شہناز' ان کے شعری مجموعے ہیں۔نثر میں 'ضحاک' اور 'آئینہ خانے' اُن کی تصانیف ہیں۔ان کا انتقال لاہور میں ہوا۔

باب 9

اُردو کے رومانی نثر نگار

سرسیّد اور حالؔی کی اصلاحی تحریک کے بعد اردو ادب میں ایک نئے رجحان کو مقبولیت حاصل ہوئی جسے 'ادبِ لطیف' کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت ایسے شگفتہ اسلوبِ نثر کو رواج دینے کی کوشش کی گئی جس میں رومانی احساس اور جذباتی انداز نمایاں ہو۔ یہ کسی تحریک یا منظّم کوشش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایک کو دیکھ کر دوسرے نے اس رجحان کا اثر قبول کیا۔ ادبِ لطیف سے وابستہ قلم کار جمالیاتی قدروں کے پاسدار اور حسن کے پرستار تھے۔ ان کی تحریروں میں نزاکتِ خیال، شعریت اور رومانیت کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں فکری وسعت بھی ملتی ہے۔ ادبِ لطیف کے لکھنے والوں نے عام طور پر حسنِ فطرت اور حسن و عشق کے معاملات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ ادیب رابندر ناتھ ٹیگور کی تحریروں سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔

میر ناصر علی (1847-1933) : میر ناصر علی دہلی میں پیدا ہوئے۔ قدیم دلّی کالج سے 1867 میں انھوں نے انٹرنس کا امتحان دیا۔ انگریزی دورِ حکومت میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ میر ناصر کی ادبی زندگی کا آغاز رسالہ 'تیرھویں صدی' سے ہوا جو انھوں نے آگرہ سے جاری کیا۔ بعد میں یہ رسالہ 'زمانہ' کے نام سے شائع ہونے لگا۔ اس کے بعد انھوں نے دہلی سے رسالہ 'افسانۂ ایّام' اور پھر 'رسالۂ ناصری' جاری کیا۔

1908 میں میر ناصر علی نے دہلی میں اپنا ذاتی پریس 'مطبعِ ناصری' قائم کیا اور یہیں سے رسالہ 'صلاے عام' شائع کرنے لگے۔ ان کے پوتے سید انصار علی ناصری نے ان کے مضامین کا ایک انتخاب 'مقاماتِ ناصری' کے نام سے 1969 میں انجمن ترقی اردو، کراچی سے شائع کیا ہے۔ اس انتخاب میں مضامین بھی ہیں اور انشائیے بھی۔ یہ تمام تحریریں میر ناصر علی کے شگفتہ اسلوب اور لطیف رومانی نثر کا نمونہ ہیں۔

مہدی افادی (1868/70-1921) : ان کا نام مہدی حسن تھا مگر وہ اپنے نام کے ساتھ افادی الاقتصادی لکھتے تھے۔ وہ گورکھپور کے ایک تعلیم یافتہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ گئے اور 1909 میں تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوئے۔

مہدی افادی کے مضامین کا مجموعہ 'افاداتِ مہدی' اور خطوط کا مجموعہ 'صحیفۂ محبت' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اُن کی نثر شگفتہ، رواں اور دل کش ہے۔ ان کا ایک مضمون 'اردو لٹریچر کے عناصرِ خمسہ' بہت مقبول ہوا۔ اس میں مہدی افادی

نے سرسیّد، نذیر احمد، حالؔی، محمد حسین آزادؔ اور شبلؔی کو اردو ادب کے عناصرِ خمسہ قرار دیا ہے۔ ان کے شگفتہ اسلوب کی شبلؔی نے بھی تعریف کی ہے۔

مہدی افادی نے حسن و عشق کے موضوع پر عمدہ انشائیے لکھے ہیں۔ انھوں نے دوسرے نثر نگاروں کے مقابلے میں کم لکھا ہے لیکن ان کے مضامین سے ان کی جدّت پسند طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں نئی تشبیہات، استعارات اور تراکیب نمایاں ہیں۔ مہدی افادی نے دوسری زبانوں کی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ اُن کا شمار رومانی نثر کے معماروں میں ہوتا ہے۔

یلدرؔم (1880/82-1943) : ان کا نام سیّد علی سجاد حیدر تھا۔ وہ نہٹور، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی۔ اے کرنے کے بعد بہ حیثیت ڈپٹی کلکٹر سرکاری ملازمت میں داخل ہوگئے۔ دورانِ تعلیم ہی انھیں تُرکی زبان وادب سے دل چسپی پیدا ہوگئی تھی۔ ترکی افسانوں نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ 1920 میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ 1930 میں انھوں نے جزائر انڈمان کے ریونیو کمشنر کا عہدہ سنبھالا۔ 1935 میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور لکھنؤ میں رہنے لگے۔ یہیں اُن کا انتقال ہوا۔

یلدرم کے مضامین اور افسانوی مجموعے 'خیالستان' اور 'حکایات واحساسات' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ یلدرم نے ترکی ناولوں اور ڈراموں کے ترجمے بھی کیے۔ 'پرانا خواب' اور 'مرزا' ان کے طبع زاد ڈرامے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کی نثر کا اسلوب رومانی ہے۔ ان کے تراجم ہوں یا طبع زاد افسانے، ڈرامے ہوں یا مضامین، سبھی میں انھوں نے اپنے احساسات کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ ہر شے میں حسن تلاش کرتے ہیں۔ یلدرم نے اردو نثر میں ادبِ لطیف کی روایت کو مستحکم کیا۔

نیازؔ فتح پوری (1884-1966) : ان کا نام نیاز محمد خاں تھا۔ وہ اتر پردیش کے شہر فتح پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، بعد میں انگریزی پڑھی۔ شعروادب کا شوق بچپن سے تھا۔ ان کی نوجوانی کا زمانہ ریاست بھوپال میں بسر ہوا۔ وہیں سے انھوں نے 1922 میں رسالہ 'نگار' جاری کیا۔ اس رسالے نے اپنے معیار، مباحث اور خصوصی شماروں کے سبب بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ نیاز فتح پوری شاعر، نثر نگار اور مترجم بھی تھے۔ انھوں نے افسانے اور انشائیے بھی لکھے اور علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین بھی۔ آخری عمر میں نیازؔ پاکستان چلے گئے اور رسالہ 'نگار' کراچی سے شائع کرنے لگے۔ کراچی ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

نیاز فتح پوری ادب کو سماجی اصلاح سے زیادہ جمالیاتی ذوق کی تسکین کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے رومانی نثر لکھی اور ادبِ لطیف کے ایک معمار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ 1913 میں ان کا طویل افسانہ 'ایک شاعر کا انجام' شائع ہوا۔ اس میں نیاؔز کی جذبات نگاری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ 'شہاب کی سرگذشت' نیاؔز کا مشہور ناولٹ ہے۔ 'نگارستان'، 'جمالستان' اور 'نقاب اُٹھ جانے کے بعد' نیاز کے افسانوں اور انشائیوں کے مجموعے ہیں۔

نیاؔز، ٹیگور کے اسلوب سے بہت متاثر تھے۔ ان کی معروف کتاب 'عرضِ نغمہ' ٹیگور کی 'گیتا نجلی' کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اردو کے کئی ادیبوں نے ٹیگور کے اسلوب کا اثر قبول کیا۔ ان کے خطوط کی نثر بھی رومانی ہے۔

سجاد انصاری (پ۔1884): سجاد انصاری گدیا ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کالج سے بی۔ اے۔ اور ایل۔ ایل۔ بی۔ کیا۔ انھیں شعر و ادب کا ذوق تھا۔ شاعری کے ساتھ وہ نثری مضامین بھی لکھتے تھے۔ وہ کم عمری میں وفات پانے کے سبب اپنی کوئی باقاعدہ کتاب تصنیف نہ کر سکے۔ ان کے مضامینِ نظم و نثر کا ایک مجموعہ 'محشرِ خیال' ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس میں چند مضامین اور ادب پارے، ایک نامکمل ڈراما اور کچھ نظمیں شامل ہیں۔ انھیں ادبِ لطیف کا فلسفی کہا جاتا ہے۔

سجاد انصاری اپنی فکر کے ساتھ ساتھ اسلوب نگارش کی بنا پر بھی مقبول ہوئے۔ ان کے مضامین کے موضوعات رنگین اور دلچسپ ہیں۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی بات بغیر کسی مصلحت و مروت کے بے باکی سے کہہ جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعری سے وعظ و نصیحت کا کام نہیں لینا چاہیے۔ رومانی نثر یا ادبِ لطیف کے لکھنے والے تشبیہات و استعارات اور خوب صورت الفاظ پر خاص توجہ دیتے تھے لیکن سجاد انصاری کے یہاں فلسفیانہ استدلال پر بھی زور ہے۔

ل۔ احمد اکبر آبادی (1885-1980): رومانی نثر نگاروں میں ایک نمایاں نام لطیف الدین احمد کا ہے۔ وہ ل۔ احمد کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ وہ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ فارسی عربی کی تعلیم انھوں نے مدارس میں حاصل کی۔ 1907 سے سیاست میں قدم رکھا اور جلیان والا باغ کے سانحے (1919) کے بعد کانگریس میں شامل ہو گئے۔ 1952 میں سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو گئے۔

ل۔ احمد اکبر آبادی نے ادبی موضوعات کے علاوہ سیاسی موضوعات پر بھی لکھا۔ اردو ادب میں وہ ایک رومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی افسانوں پر ٹیگور کے گہرے اثرات ہیں۔ انھیں سر ٹامَس مور

کی کتاب کے ترجمے 'لالہ رخ' سے شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی تصنیفات میں سے چند کے نام یہ ہیں، 'انشائے لطیف'، 'نغمات'، 'گیت اور گیان'، 'ادبی تاثرات'، 'نقدِ ادب'، 'محبت کا افسانہ' اور 'مجنوں کے ارمان'۔

سلطان حیدر جوشؔ (1953-1886) : سلطان حیدر جوشؔ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن دہلی میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم دہلی میں اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ ملازمت میں وہ ڈپٹی کلکٹری کے عہدے تک پہنچے۔ سبک دوشی کے بعد علی گڑھ میں مقیم رہے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

سلطان حیدر جوش نے اپنے افسانوں میں انگریزی کی اندھی تقلید پر جا بجا طنز کیا ہے۔ ان کا شمار رومانی نثر کے معماروں میں کیا جاتا ہے۔ 'افسانۂ جوش' اور 'فکرِ جوش' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

عبدالغفّار قاضی (1956-90/1889): قاضی عبدالغفار مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد 1908 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ عملی زندگی کا آغاز انھوں نے ایک صحافی کے طور پر کیا۔ دہلی میں مولانا محمد علی جوہر کے اخبار 'ہمدرد' میں کام کیا۔ اس کے بعد کلکتہ گئے اور وہاں سے روزنامہ 'جمہور' شائع کیا۔ حیدرآباد جاکر 'پیام' اخبار جاری کیا۔ علی گڑھ میں انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

قاضی عبدالغفار بنیادی طور پر صحافی تھے لیکن ان کی ادبی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ناول، افسانے، ڈرامے، سفرنامے کے علاوہ سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں اور ترجمے بھی کیے ہیں۔ 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' سے انھیں بہت شہرت ملی۔ ان کی نثر میں رومانیت اور شعریت کا رنگ نمایاں ہے۔

مجنوںؔ گورکھپوری (1988-1904): ان کا نام احمد صدیق تھا۔ ضلع بستی کے ایک گاؤں پلڈہ میں پیدا ہوئے۔ اردو اور انگریزی میں ایم۔اے۔ کی سند حاصل کی۔ بہت دنوں تک گورکھپور کے سینٹ اینڈریوز کالج میں انگریزی اور اردو کے استاد کی خدمات انجام دیں۔ پھر علی گڑھ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ 1968 میں کراچی چلے گئے۔ وہیں انتقال ہوا۔

مجنوںؔ کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری اور افسانہ نگاری سے ہوا۔ انھوں نے رومانی افسانہ نگار اور تنقید نگار کے طور پر شہرت حاصل کی۔ مجنوںؔ کے پہلے طویل افسانے کا نام 'زیدی کا حشر' ہے۔ 'صید زبوں'، 'خواب و خیال'، 'مجنوں کے افسانے'، 'سوگوار شباب'، 'سمن پوش'، 'نقشِ ناہید' ان کی مشہور کتابیں ہیں جو رومانی نثر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مجنوں کی نثر سادہ اور سلیس ہونے کے ساتھ شعریت سے بھرپور ہے۔ ان کی تصنیف 'پردیسی کے خطوط' کو

ادبِ لطیف کی روایت میں نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ 'شوپنہار' اور 'جمالیات' کا شمار بھی ان کی خاص کتابوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بعض عمدہ ترجمے بھی کیے ہیں۔

دیگر نثر نگار

اس عہد میں عالمانہ افکار کے مدلّل اظہار کے لیے مختلف اسالیب پر توجہ کی گئی۔ مختلف موضوعات و مسائل پر اپنے خیالات کو ربط و تسلسل کے ساتھ عالمانہ زبان میں بیان کرنے والے ادیبوں میں مولانا ابوالکلام آزاد پیش پیش ہیں۔ ادب، مذہب اور سیاست کے موضوع پر مولانا آزاد کی تحریریں اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ خطابت و صحافت میں ان کا رتبہ بہت بلند ہے۔ ان کے مضامین اور اداریے قارئین کے دلوں میں ہلچل پیدا کر دیتے تھے۔ اس عہد میں سنجیدہ موضوعات و مسائل پر ادبی نوعیت کی تحریریں پیش کرنے والے دیگر حضرات میں عبدالماجد دریابادی، سیّد عابد حسین اور خواجہ غلام السیدین کے نام خاص ہیں۔ ان کے بعد آنے والے مصنفین میں شان الحق حقّی بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

وحید الدین سلیمؔ (1928-1869) : وحید الدین سلیم ماہرِ لسانیات، صحافی، مترجم، مصنف اور شاعر تھے۔ اُنھوں نے پہلے مفتوںؔ اور پھر سلیمؔ تخلص اختیار کیا۔ پانی پت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1882 میں مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد لاہور کے اورینٹل کالج میں تعلیم جاری رکھی۔

حالیؔ نے 1894 میں انھیں علی گڑھ بلوایا اور سرسیّد سے متعارف کرایا۔ 1907 میں انھیں 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کی ادارت کی ذمے داری سونپی گئی۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران وحید الدین سلیمؔ نے 'انجمنِ مترجمین' قائم کی جس کا مقصد انگریزی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا تھا۔ جب حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ قائم کی گئی تو نصابی کتابوں کے اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ راس مسعود اور بعض دوسرے حضرات نے وحید الدین سلیم کو حیدرآباد بلوالیا۔ یہاں ترجمے کے کام کو آگے بڑھانا تھا۔ جس کے لیے 'وضعِ اصطلاحات' کی کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی کے ایک رُکن کے طور پر انھوں نے اصطلاحات سازی کی خدمات انجام دیں۔ جب شعبۂ اُردو کا قیام عمل میں آیا تو انھیں پروفیسر مقرر کردیا گیا۔ آخری زمانے میں صحت کی خرابی کے باعث ملیح آباد چلے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

سیّد سلیمان ندوی (1953-1884) : سید سلیمان دیسنہ ضلع بہار شریف میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بعد میں انھیں ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخل کیا گیا، جہاں انھیں شبلی جیسا شفیق استاد ملا۔ انھوں نے اعلیٰ

تعلیم کے تمام مراحل وہیں طے کیے۔ مولانا شبلی کی وفات کے بعد دارالمصنفین سے وابستہ ہوگئے اور لمبے عرصے تک وہیں رہے۔ سید سلیمان ندوی کو تاریخ سے غیر معمولی دل چسپی تھی۔ اسلامی تاریخ ان کا خاص میدان تھا۔ اس موضوع پر انھوں نے بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں 'سیرۃ النبیؐ'، 'سیرتِ عائشہؓ'، 'عربوں کی جہاز رانی' اور 'ارض القرآن' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سیرت النبیؐ کی ابتدائی دو جلدیں شبلی نے لکھی تھیں۔ ان کے اس منصوبے کی تکمیل سید سلیمان ندوی نے کی۔ وہ بہت اچھے مقرر بھی تھے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں کہیں کہیں خطابت کا انداز بھی ملتا ہے۔

سیّد سلیمان ندوی ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال سے بھی وابستہ رہے۔ 'الندوہ' اور 'معارف' کی ادارت کے فرائض بھی انھوں نے انجام دیے۔ فارسی ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ اس سلسلے میں ان کی سب سے معروف کتاب 'خیّام' ہے۔ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر عمر خیام سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958): مولانا آزاد کا اصل نام محی الدین احمد اور تاریخی نام فیروز بخت تھا۔ ان کے والد مولوی خیر الدین ایک عالم دین تھے۔ آزاد نے بارہ برس کی عمر میں عربی فارسی کی تعلیم سے فراغت حاصل کر لی۔ ان کا حافظہ غیر معمولی اور مطالعے کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔ کم عمری ہی میں ان کے مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہونے لگے تھے۔ انھوں نے 'لسان الصدق'، 'الہلال' اور 'البلاغ' جیسے اخبارات جاری کیے۔

مولانا آزاد نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ کئی بار جیل کی سزا بھی کاٹی۔ 1939 میں وہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور 1946 تک اس اہم عہدے پر فائز رہے۔ وہ آزاد ہندوستان کے پہلے مرکزی وزیرِ تعلیم تھے۔ جدید تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی کے علاوہ ملک کی تہذیب وثقافت کے فروغ کے لیے انھوں نے کئی اکادمیاں اور ادارے قائم کیے۔ اُن کا انتقال دہلی میں ہوا۔

مولانا آزاد نے متعدّد کتابیں لکھیں جن میں قرآن مجید کا نامکمل ترجمہ اور تفسیر 'ترجمان القرآن'، 'تذکرہ'، 'غبارِ خاطر' 'کاروانِ خیال' اور 'انڈیا ونس فریڈم' بہت مشہور ہیں۔ 'انڈیا ونس فریڈم' کا اردو ترجمہ 'ہماری آزادی' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ 'غبارِ خاطر' مولانا آزاد کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران انھوں نے اپنے دوست نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے تھے جو بھیجے نہ جا سکے۔ ان خطوط کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط نہیں بلکہ انشائیے اور مختلف موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین ہیں۔ مولانا آزاد کی نثر میں انانیت، خطابت اور ڈرامائیت کا رنگ بہت گہرا ہے۔

عبدالماجد دریابادی (1977-1892) : وہ دریاباد ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار اردو کے صاحبِ طرز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کے کیننگ کالج سے بی۔اے۔ کی سند حاصل کی تھی۔ فلسفہ اور نفسیات میں ان کی خاص دل چسپی تھی۔ انھوں نے قرآنِ حکیم کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ اسلامی تہذیب وتمدن اور تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس کے علاوہ بشریات اور عمرانیات کے بھی وہ ماہر تھے۔ ان کی مشہور کتابوں میں 'فلسفۂ جذبات'، 'مکالماتِ برکلے'، 'فلسفۂ اجتماع' اور 'محمد علی۔ ذاتی ڈائری' وغیرہ شامل ہیں۔ 'سفر نامۂ حجاز' سفرِ حج کی روداد ہے۔

عبدالماجد دریابادی ایک نامور صحافی بھی تھے۔ 'سچ'، 'صدق' اور 'صدق جدید' کے نام سے انھوں نے تین اخبارات نکالے۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ ان کی نثر میں علمیت کے ساتھ شگفتگی اور دل آویزی بھی پائی جاتی ہے۔

سیّد عابد حسین (1978-1896) : ڈاکٹر سیّد عابد حسین کا وطن داعی پور، ضلع فرخ آباد (اتر پردیش) تھا۔ عابد حسین کی پیدائش بھوپال میں ہوئی، جہاں اُن کے دادا اور والد ملازمت کرتے تھے۔ اُن کا بچپن داعی پور اور لکھنؤ میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں اور ثانوی تعلیم بھوپال میں حاصل کی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے۔ کیا۔ سیّد عابد حسین نے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری برلن یونیورسٹی، جرمنی سے لی۔ واپس آکر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے ساتھ جامعہ ملّیہ اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے۔

ڈاکٹر عابد حسین کو ان کے ڈرامے 'پردۂ غفلت' سے شہرت ملی۔ ترجمے کے میدان میں ان کی خدمات بہت اہم ہیں۔ انھوں نے جرمن زبان کی کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا، جن میں گوئٹے کی 'فاؤسٹ' سب سے اہم ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے مہاتما گاندھی کی خودنوشت 'مائی ایکسپیریمنٹ وِدٹُرتھ' (My Experiment with Truth) کا ترجمہ 'تلاشِ حق' کے نام سے، پنڈت جواہر لعل نہرو کی 'ڈسکوری آف انڈیا' کا ترجمہ 'تلاشِ ہند' کے نام سے اُردو میں کیا۔ اُردو کے علاوہ انگریزی میں بھی کئی کتابیں لکھیں جن میں 'قومی تہذیب کا مسئلہ' اور 'ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایّام میں' اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوئیں۔ وہ دو مشہور جرائد 'اسلام اور عصرِ جدید' اور 'اسلام اینڈ دی موڈرن ایج' کے بانی مدیر بھی رہے۔ ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے انھیں 'پدم بھوشن' کے اعزاز سے بھی نوازا تھا۔

خواجہ غلام السیّدین (1971-1904) : خواجہ غلام السیّدین پانی پت (ہریانہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ مشتاق فاطمہ حالؔی کی پوتی تھیں۔ غلام السیّدین کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم پانی پت میں ہوئی۔ علی گڑھ سے انھوں نے بی۔اے۔ اور بی۔ایڈ کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ وہاں سے واپس آکر علی گڑھ ٹیچرز ٹریننگ کالج

میں لیکچرر ہوئے۔ بعد میں پرنسپل ہوگئے۔ اس کے بعد ہندوستان میں محکمہ تعلیمات کے مختلف اہم عہدوں پر فائز رہے۔آخر میں مرکزی وزارتِ تعلیم کے سیکریٹری کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔

خواجہ غلام السّیدین ماہرِ تعلیم تھے۔ انھوں نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد ہندوستان میں تعلیمی اُمور کے سلسلے میں کئی مقامات پر مختلف حیثیتوں سے کام کیا۔ انھوں نے گاندھی جی کی عملی تعلیم کے نظریے سے متاثر ہوکر ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ عملی تعلیم کا خاکہ تیار کیا۔ انھوں نے اردو میں تعلیم اور ادب سے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں۔اُن کی سب سے مشہور کتاب 'آندھی میں چراغ' ہے جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔حکومتِ ہند نے انھیں تعلیمی خدمات کے صلے میں 'پدم بھوشن' کے خطاب سے نوازا۔ خواجہ غلام السّیدین کی نثر سادہ لیکن پُر زور اور مؤثر ہوتی ہے۔

شان الحق حقّی (1917-2005) : شان الحق حقّی کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ ان کا تعلق شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کے گھرانے سے تھا۔ فارسی اور اردو پر اُن کی گہری نظر تھی۔ وہ ادب اور زبان دونوں کا بہت ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم دہلی اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی۔

شاعری، افسانہ، ڈراما، تنقید، تحقیق، ترجمہ نگاری اور لغت سازی اُن کی دل چسپی کے خاص میدان ہیں۔ انھوں نے بچّوں کے لیے بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ سنسکرت اور انگریزی سے ان کے بعض ترجموں کو بہت شہرت ملی۔ تھیسارس (مترادف الفاظ کی لغت) اور لغات کی ترتیب وتدوین کے میدان میں شان الحق حقّی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ 'نکتۂ راز' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ حقّی صاحب اردو کے ممتاز عالموں اور زبان دانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصّہ انھوں نے پاکستان میں گزارا۔ آخر عمر میں انھوں نے کناڈا میں سکونت اختیار کر لی تھی، وہیں ان کا انتقال ہوا۔

2019-20

باب 10

غزل کا نیا دور

انجمنِ پنجاب کے زیرِ اثر نظم گوئی کی روایت کو جو استحکام حاصل ہوا اس کے اثرات ترقی پسند تحریک کے دور تک بدستور جاری رہے۔ غزل اس عرصے میں اگرچہ معتوب رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں باوجود تمام نامساعد حالات کے غزل نہ صرف زندہ رہی بلکہ اس نے نئی کروٹ بھی لی۔ قدیم و جدید کے امتزاج سے غزل نے ارتقا کی نئی منزلیں طے کیں۔ افکار و تصورات کے ساتھ زبان و بیان اور آہنگ و مزاج کے لحاظ سے اس دور کی غزل گوئی نے اپنی نئی شناخت قائم کی، جہاں سے غزل کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اس لیے اس دور کو غزل کی نشأۃ الثانیہ کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے کے شعرا میں شادؔ عظیم آبادی، آرزوؔ، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی، حسرتؔ موہانی اور جگرؔ مرادآبادی، بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی (1927-1846) : ان کا نام سید علی محمد تھا۔ وہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ جب انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو یہ لکھنوی شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ شروع میں شادؔ نے بھی اس رنگ کو اپنایا۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں تصنّع، تکلّف اور کسی حد تک سطحیت و سوقیت آ گئی تھی۔ تاہم جب انھوں نے سنبھل کر شعر کہنا شروع کیا تو وہ شاعری کے افق پر چھا گئے۔ شادؔ نے تغزل کے دامن کو وسیع کیا۔ ان کا اندازِ بیان منفرد ہے۔ شادؔ نے غزل کے علاوہ مرثیے اور مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ نمونۂ کلام ؎

تمنّاؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

یہ بزمِ مَے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے

ریاضؔ خیرآبادی (1934-1852/53) : ریاضؔ خیرآباد، ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد طفیل احمد سے حاصل کی۔ اسیرؔ اور امیرؔ مینائی سے اصلاح لی۔ بعد میں ریاضؔ نے گورکھپور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں سے انھوں نے 'ریاض الاخبار'، 'فتنہ' اور 'عطرِ فتنہ' نام کے اخبار جاری کیے۔

ریاض نے اردو غزل کو ایک نیا رنگ بخشا۔ شراب کی سرمستی اور سرشاری سے معمور اشعار کی کثرت کے لحاظ سے ریاض کو اردو کا حافظ کہا گیا ہے۔ انھوں نے شراب کو کبھی منہ نہیں لگایا مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی کیفیات کے ہزاروں رنگوں سے شعری سرمائے کو مالا مال کیا۔ ان کے بہت سے اشعار ہماری یادداشت کا حصہ بن گئے ہیں۔

ساقی! مئے اَلَست کی بوتل اٹھا تو لا — اتری ہے آسمان سے جو کل، اٹھا تو لا
انگور میں تھی یہ مے پانی کی چند بوندیں — پر جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہوگئی ہے
چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

آرزو لکھنوی (1872/73-1951) : ان کا نام سید انور حسین تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ آرزو نے فارسی اور اپنے زمانے کے دوسرے علوم کی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ خاص طور پر عروض اور قواعد میں مہارت پیدا کی۔

اس زمانے میں کلکتہ اور ممبئی میں تھیٹر کی متعدد کمپنیاں قائم تھیں۔ آرزو نے ان کے لیے کئی ڈرامے مثلاً 'متوالی جوگن'، 'دل جلی بیراگن' وغیرہ لکھے۔ انھوں نے فلموں کے لیے کچھ گیت بھی لکھے۔ 'نظامِ اردو' اردو زبان سے متعلق ان کا اہم رسالہ ہے۔ ان کے کلام کے چار مجموعے شائع ہوئے ہیں: 'فغانِ آرزو'، 'جہانِ آرزو'، 'بیانِ آرزو' اور 'سریلی بانسری'۔ 'سریلی بانسری' میں آرزو لکھنوی نے یہ اہتمام کیا ہے کہ اس میں عربی و فارسی کی کوئی ترکیب نہ آنے پائے۔ اسے آرزو کا امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

آرزو لکھنوی کا شمار ان باکمالوں میں ہوتا ہے جنھوں نے لکھنوی غزل کے رنگ کو نکھارا اور اسے ایک نئی اور سادہ زبان دی۔ چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

جو سخن اس زبان سے نکلا — تیر گویا کمان سے نکلا
یا چاہنے والے لاکھوں تھے — یا پوچھنے والا کوئی نہیں
ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر — اتنا برسا ٹوٹ کے بادل، ڈوب چلا مے خانہ بھی
ہٹ اپنی اپنی بات کی ہے، دھیان اپنی اپنی آن کا ہے — ہم ہیں کہ تلے ہیں مرنے پر وہ ہیں کہ مٹائے جاتے ہیں

فانی بدایونی (1879-1941) : ان کا نام شوکت علی خاں تھا۔ وہ اسلام نگر، ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس تک کی تعلیم بدایوں میں حاصل کی۔ بی۔ اے کا امتحان بریلی کالج سے پاس کیا۔ پھر ایم۔ اے۔ او کالج، علی گڑھ سے ایل ایل بی کی تکمیل کی۔ لیکن وکالت کے پیشے سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فانی بدایونی بچپن ہی سے شعر و سخن

کی طرف مائل تھے۔ 1926 میں وہ حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں مہاراجا کشن پرشاد اور پرنس معظّم جاہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ وہ خرابیِ صحت کی وجہ سے اکثر پریشان رہا کرتے تھے۔ آخری عمر میں بیوی اور جوان بیٹی کی موت سے انھیں سخت صدمہ پہنچا۔ حیدرآباد میں انھوں نے وفات پائی۔ ان کی شاعری میں احساسِ غم نمایاں ہے۔ اُن کی زبان بہت منجھی ہوئی ہے۔ اندازِ بیان نہایت دل نشیں ہے۔ ان کا بہت سا کلام تلف ہوگیا۔ جو کچھ بچا وہ 'باقیاتِ فانی' کے نام سے شائع ہوا۔

آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ امڈا آتا ہے　　دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے
اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا　　بات پہنچی تری جوانی تک

سیمابؔ اکبرآبادی (1951 – 1880/82) : ان کا نام سید عاشق حسین تھا۔ وہ آگرے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں ہوئی۔ انھیں بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ وہ داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کا شمار زود گو شعرا میں ہوتا ہے۔ سیماب نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ بعد میں نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور نظم نگاری میں اپنا ایک مقام بنایا۔ نظم نگاری میں ان کے موضوعات متنوع ہیں اور اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔

سیمابؔ نے 'قصرِ ادب' کے نام سے ایک ادبی ادارہ بھی قائم کیا تھا جس کے تحت انھوں نے آگرہ سے ماہنامہ 'شاعر' نکالنا شروع کیا جو اب تک ممبئی سے نکل رہا ہے۔ سیمابؔ نے کراچی میں وفات پائی۔

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دِن　　دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
فقط احساسِ آزادی سے آزادی عبارت ہے　　وہی دیوار گھر کی ہے وہی دیوار زنداں کی
کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے　　جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

حسرتؔ موہانی (1880/81-1951): ان کا نام سیّد فضل الحسن تھا۔ وہ قصبہ موہان، ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ سے انھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے سیاست میں دلچسپی لینے لگے۔ جنگِ آزادی کے سرگرم مجاہدین میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ انگریزی حکومت سے 'کامل آزادی' کا تصور 1921 میں پہلی بار حسرتؔ ہی نے پیش کیا۔ برطانوی حکومت کی شدید مخالفت کی وجہ سے انھوں نے

بار بار جیل کی مشقتیں برداشت کیں۔ حسرت کی ادبی خدمات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے 'اردوئے معلّیٰ' کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا جس کا شمار اردو کے اہم رسالوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بہت سے شعرا کے انتخابات بھی شائع کیے۔

حسرت موہانی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے کلام میں خوب صورت الفاظ، حسین تراکیب اور مترنم بحروں کا استعمال کرتے ہیں۔ عشقیہ جذبات اور احساسات کی ترجمانی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے معاملہ بندی کے شعر بھی کہے ہیں۔ شاعری میں ان کا سلسلہ منشی امیر اللہ تسلیم اور نسیم دہلوی سے ہوتا ہوا مومن سے جا ملتا ہے۔ غزل کی صنف کو اس کا کھویا ہوا وقار اور مرتبہ عطا کرنے میں حسرت کا رول بہت نمایاں ہے۔

نہیں آتی، تو اُن کی یاد برسوں تک نہیں آتی ‏ ‏ مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا ‏ ‏ کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا
اللہ رے! جسمِ یار کی خوبی، کہ خود بخود ‏ ‏ رنگینیوں میں ڈوب گیا، پیرہن تمام
توڑ کر عہدِ کرم، نا آشنا ہو جایئے ‏ ‏ بندہ پرور جایئے اچھّا، خفا ہو جایئے

یگانہ چنگیزی (1883/84-1956): ان کا نام مرزا واجد حسین تھا۔ یگانہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور فارسی زبانوں پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ وہ شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ابتدا میں یاس اور بعد میں یگانہ تخلص اختیار کیا۔ لکھنؤ میں انھوں نے ایک طویل عرصہ گزارا۔ ان کے مزاج میں انانیت بہت زیادہ تھی جس کی وجہ سے شعرائے لکھنؤ سے زبردست اختلافات رہے۔ لکھنؤ ہی میں انھوں نے وفات پائی۔

یگانہ کی شاعری میں ان کے مزاج کا تیکھا پن نمایاں ہے۔ ان کا تیکھا اور زندگی سے بھرپور لب و لہجہ آتش کی یاد دلاتا ہے۔ یگانہ نے غزلوں کے علاوہ رباعیاں بھی کہی ہیں جو 'ترانہ' کے نام سے شائع ہوئیں۔ ان کے چند شعر یہ ہیں۔

خودی کا نشّہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا ‏ ‏ خدا بنے تھے یگانہ، مگر بنا نہ گیا
چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا ‏ ‏ چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے
ہر شام ہوئی صبح کو اک یادِ فراموش ‏ ‏ دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
بلند ہو تو کُھلے تجھ پہ راز پستی کا ‏ ‏ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

اصغر گونڈوی (1884-1936): ان کا نام اصغر حسین تھا۔ گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بہت دِنوں تک ملازمت کے سلسلے میں گونڈہ میں رہے اس لیے اصغر گونڈوی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اصغر نے شروع میں منشی

خلیل احمد وجدؔ بلگرامی سے اصلاح لی۔ بعد میں امیر اللہ تسلیمؔ کے شاگرد ہوئے۔ وہ نیک طبیعت اور مذہبی مزاج رکھنے والے انسان تھے اور شاہ عبدالغنی منگلوری کے مرید تھے۔ تصوّف کی طرف جھکاؤ ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری میں مضامینِ تصوّف کا غلبہ ہے۔ ان کے یہاں ایک قسم کی افسردگی پائی جاتی ہے۔ 'نشاطِ روح' اور 'سرودِ زندگی' ان کے شعری مجموعے ہیں۔

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا	جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے	جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے	اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

جگرؔ مرادآبادی (1960-1890): ان کا نام علی سکندر تھا۔ جگرؔ کے والد مولوی علی نظرؔ بھی شاعر تھے۔ جگر کم عمری ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ شروع میں والد سے اصلاح لی۔ پھر داغؔ کے شاگرد ہوئے۔ منشی امیر اللہ تسلیمؔ اور اصغرؔ گونڈوی سے بھی مشورۂ سخن کیا۔

جگر کی شاعری میں عشقِ مجازی نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں والہانہ پن اور سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ آخر عمر میں اصغر گونڈوی کے زیرِ اثر تصوف کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ 'داغِ جگر'، 'شعلۂ طور' اور 'آتشِ گل' اُن کے شعری مجموعے ہیں۔ 'آتشِ گل' پر وہ ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازے گئے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی تھی۔

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے	گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں	فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں
آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں	نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے
یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے	اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
دل گیا، رونقِ حیات گئی	غم گیا، ساری کائنات گئی

فراقؔ گورکھپوری (1982-1896): ان کا نام رگھوپتی سہائے تھا۔ وہ گورکھپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی زندگی کا بیش تر حصّہ الہ آباد میں گزرا۔ الہٰ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے۔ غزل گو کی حیثیت سے انھوں نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ ہندو دیومالا کے حوالے سے انھوں نے اپنی شاعری کو ایک نیا حسن بخشا۔ انھوں نے ہندی کے شیریں الفاظ بھی بڑی خوب صورتی سے استعمال کیے ہیں۔ وہ ایک منفرد لہجے کے شاعر ہیں۔ انھوں نے تنقیدی

مضامین بھی لکھے اور رباعیاں بھی کہیں۔ 'شعرستان'، 'شبنمستان'، 'روحِ کائنات'، 'گلِ نغمہ' وغیرہ اُن کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ رباعیوں کا مجموعہ 'روپ' بھی بہت مشہور ہے۔ ان کی نثری تصانیف میں 'حاشیے'، 'اندازے'، 'اردو کی عشقیہ شاعری' اور 'اردو غزل گوئی' مشہور ہیں۔ انھوں نے انگریزی اور ہندی میں بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔ آخری رسوم اِلٰہ آباد میں ہوئیں۔

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست! وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں
اس دور میں زندگی بشر کی بیمار کی رات ہوگئی ہے
بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
اک مدّت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

شاؔد عارفی (1900/03-1964): ان کا نام احمد علی خاں تھا۔ شاؔد عارفی کا وطن رام پور (یوپی) تھا۔ انھوں نے شاعری کا جو اسلوب اختیار کیا اس میں تیکھے پن، طنز اور تلخی کے عناصر بہت نمایاں ہیں۔ غزل میں ان کا رنگ یگاؔنہ سے مشابہ ہے۔ اس میں شگفتگی اور لطافت سے زیادہ کھردراپن اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ نئی غزل کے اوّلین نشانات جن شاعروں کے یہاں ملتے ہیں، ان میں شاؔد کا نام بھی شامل ہے۔ زندگی سے ان کا رشتہ ہمیشہ حریفانہ رہا۔ ان کی شاعری میں بھی مزاحمت کا عنصر بہت واضح ہے۔ ان کے مجموعے 'شوخیِ تحریر' اور 'سفینہ چاہیے' جدید شاعری کے نمائندہ مجموعوں میں شامل ہیں۔

جو بھی عِرفانِ مشیّت کا اڑاتے ہیں مذاق وہ نہ جانے کیا سمجھتے ہیں خدا کی ذات کو
ہاتھ میں جام اٹھانا تو بڑی بات نہیں کوئی پتھر، کوئی کانٹا رہِ منزل سے اٹھا
تمھیں رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے ہماری بے کسی کی انتہا ہے

اس عہد کے رباعی گو شعرا

رباعی چار مصرعوں کی مختصر نظم ہوتی ہے۔ اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ایک ہی قافیے میں ہوتا ہے۔ بعض شعرا نے تیسرے مصرعے میں بھی قافیے کا استعمال کیا ہے۔ رباعی میں عام طور پر حکمت اور پند و نصیحت کے موضوعات بیان ہوتے ہیں۔ یہ ایک قدیم صنفِ سخن ہے۔ اردو میں رباعی کہنے کی روایت اسی وقت سے قائم ہے جب دوسری اصناف جیسے غزل، مثنوی اور قصیدہ وغیرہ کہنے کی روایت پڑی۔ ابتدا ہی سے شعرا کے کلام میں رباعیاں مل جاتی ہیں۔ بعض شعرا بالخصوص اپنی رباعی گوئی کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان شعرا کی رباعیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

امجؔد حیدرآبادی (1886/88-1961) : ان کا نام سیّد احمد حسین تھا۔ وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرسۂ نظامیہ میں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد پنجاب سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصے بنگلور میں مدرّس رہے، پھر حیدرآباد لوٹ آئے اور مدرسہ دارالعلوم میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ بعد میں صدر محاسب کے دفتر سے متعلق ہوگئے۔ ان کی وفات حیدرآباد ہی میں ہوئی۔

امجؔد حیدرآبادی صوفیانہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کے یہاں اخلاق اور تصوف کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ 'رباعیاتِ امجد' کے نام سے ان کی رباعیات کا مجموعہ تین حصّوں میں شائع ہوا۔ ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

شمشیر محبت پہ گلا رہنے دے
ہاں، جان کے ساتھ یہ بلا رہنے دے
امجؔد، شبِ ہجر میں نہ کر بند آنکھیں
وہ آئے گا، دروازہ کھلا رہنے دے

رواؔں اُنّاوی (1889-1934) : ان کا نام جگت موہن لال تھا۔ یہ اناؤ میں پیدا ہوئے۔ رواں بچپن ہی سے بے حد محنتی اور ذہین تھے۔ اُنھوں نے ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔

رواں نے غزل، نظم، مثنوی اور رباعی جیسی اصناف کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انھیں شہرت و مقبولیت رباعی گو کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ اُن کی رباعیوں میں فکر و فن کا گہرا امتزاج ملتا ہے۔ معیاری زبان و اسلوب، لطیف تشبیہات و استعارات اور مؤثر اندازِ بیان ان کی رباعیوں کی خصوصیات ہیں۔ دو شعری مجموعے 'روحِ رواں'، 'رباعیاتِ رواں' اور ایک مثنوی 'نقدِ رواں' اُن کی یادگار ہیں۔

کیا تم کو بتائیں عمرِ فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی، وہ ہوا کا جھونکا
اک موجِ فنا تھی، زندگانی کیا تھی

فراؔق گورکھپوری (1896-1982) : اردو کے رباعی گو شعرا میں بھی فراق گورکھپوری کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ 'روپ' کے نام سے شائع ہوا جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کے شعری مجموعے ''روحِ کائنات'' میں بھی رباعیاں شامل ہیں۔ انھوں نے روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ نئے مضامین

سے بھی اردو رباعی کا دامن وسیع کیا۔فراق سے قبل اردو رباعی میں محض پند ونصیحت اور اخلاق سے متعلق موضوعات برتے جاتے تھے لیکن انھوں نے اسے اس تنگ حصار سے نکال کر حسن وعشق اور زندگی کے دیگر پہلوؤں کا ترجمان بنایا۔انھوں نے اپنی رباعیوں کو شرنگار رس کی رباعیاں کہا ہے۔شرنگار رس سے مراد حسن وعشق سے متعلق احساسات و کیفیات کا بیان ہے۔ ؎

عیسٰی کے نفس میں بھی یہ اعجاز نہیں
تجھ سے چمک اُٹھتی ہے عناصر کی جبیں
اک معجزۂ خموش طرز رفتار
اٹھتے ہیں قدم کہ سانس لیتی ہے زمیں

جوشؔ ملیح آبادی(1898-1982) : جوش ملیح آبادی کو شاعر انقلاب اور شاعر شباب کے نام سے شہرت حاصل ہے۔وہ نظم گو اور مرثیہ گو کے علاوہ رباعی گو شاعر کے طور پر بھی معروف ہیں۔اس صنف میں انھوں نے اختصار اور وضاحت وقطعیت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو :

ہر آن جفا سے قلب ڈر جاتا ہے
ہر بات پر آسماں بپھر جاتا ہے
کرتا ہوں اسے مالِ غنیمت میں شمار
جو لمحہ فراغت سے گزر جاتا ہے

باب 11

منشی پریم چند کا عہد

اردو ادب کی تاریخ میں پریم چند کا عہد کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس عہد میں اردو کے افسانوی ادب نے بڑی تیز رفتاری سے ارتقا کی منزلیں طے کیں اور اس کے سرمایے میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ پریم چند کے عہد سے قبل اردو میں افسانے اور ناول کی روایت موجود تھی لیکن موضوع، فکر اور فن کے لحاظ سے اس کا دامن بہت محدود تھا۔ افسانہ نگاری اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی۔ ناول نگاری بھی بندھے ٹکے موضوعات و مسائل میں محدود تھی۔ فنی نقطۂ نظر سے اردو کا افسانوی ادب کچھ زیادہ وقیع نہ تھا۔ پریم چند کی عہد ساز شخصیت نے افسانوی ادب کو فکر و فن دونوں سطح پر ایک ایسی بلندی عطا کی جس کے سبب اس عہد کی اپنی الگ شناخت قائم ہوئی۔ اس سے قبل ہمارے ادب میں شہری زندگی اور اس کے اقدار و مسائل ہی کو مرکزیت حاصل تھی۔ پریم چند نے اپنے قلم کا رُخ دیہات کی اس زندگی کی طرف موڑ دیا جو اب تک ادب کے دائرے سے خارج تھی۔ انھوں نے دیہات میں زندگی بسر کرنے والی ہندوستان کی 80 فی صد آبادی کو جو صدیوں سے اقتصادی و مذہبی استحصال سے دوچار تھی، اپنے افسانوں اور ناولوں میں مرکزیت عطا کی۔ اس طرح پریم چند سے اردو فکشن میں حقیقت نگاری کی ایک نئی روایت شروع ہوئی۔

پریم چند کی ادبی کاوشوں نے اس پورے عہد کو شدّت سے متاثر کیا۔ اس عہد کے دوسرے ادیبوں نے بھی پریم چند کی پیروی کرتے ہوئے دیہی اور عوامی زندگی کے مسائل و موضوعات کو اپنی تخلیقات میں مرکزی حیثیت دی۔ پریم چند سے متاثر ادیبوں کے اس گروہ کو ہم پریم چند اسکول کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ ایسے ادیبوں میں سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی، سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری اور دیویندر ستیارتھی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ سیّد رفیق حسین اور صالحہ عابد حسین بھی اسی عہد کے دیگر اہم افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔

پریم چند (1880-1936) : منشی پریم چند بنارس کے ایک گاؤں لمہی (پانڈے پور) میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ اپنی ادبی زندگی کا آغاز انھوں نے نواب رائے کے نام سے کیا۔ پھر وہ پریم چند کے قلمی نام

سے لکھنے لگے اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے گاؤں میں حاصل کی۔ ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔ اسی دوران بی۔ اے۔ کیا پھر ہیڈ ماسٹر اور ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز بھی رہے۔ مہاتما گاندھی کے خیالات سے متاثر ہو کر 'عدم تعاون' کی تحریک کے زمانے میں انھوں نے ملازمت ترک کر دی۔

پریم چند کے دور میں داستانوں کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کے مطالعے میں اس وقت کی معروف داستانیں تھیں۔ انھیں کے زیرِ اثر پریم چند کو افسانوی ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ آگے چل کر انھوں نے سرشار، شرر، رسوا اور محمد علی طبیب کے ناولوں کا مطالعہ بھی کیا۔ 1903 میں انھوں نے اپنا پہلا ناول 'اسرارِ معابد' لکھا۔ جو ہفت روزہ 'آوازۂ خلق' بنارس میں قسط وار شائع ہوا۔ 1907 میں ان کا پہلا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' شائع ہوا۔ 1908 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سوزِ وطن' کے نام سے چھپا جسے انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا۔

پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں انسانی زندگی کی سچّی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے سیاسی، مذہبی اور جاگیردارانہ استحصال کے شکار لوگوں کے گرد اپنے افسانوں اور ناولوں کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں دیہی ماحول اور غریب و کمزور طبقوں کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں کسانوں، مزدوروں، محنت کشوں اور سماج کے نچلے طبقے کے لوگوں کے دُکھ درد، احساسات اور جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

پریم چند نے بارہ ناول لکھے جن میں 'غبن'، 'میدانِ عمل'، 'چوگانِ ہستی'، 'گوشۂ عافیت'، 'بازارِ حُسن' اور 'گئودان' اہم ہیں۔ 'پریم پچیسی'، 'پریم بتیسی'، 'واردات'، 'خواب و خیال'، 'آخری تحفہ' اور 'زادِ راہ' ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔

رفیق حسین (1894/95-1946) : سیّد رفیق حسین لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ شکار کے شوق کے ساتھ ساتھ انھیں فطرت کے مطالعے سے بھی دل چسپی تھی۔ انھوں نے جانوروں کی نفسیات پر متعدد افسانے لکھے۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ 'آئینۂ حیرت' کے نام سے شائع ہوا۔ یہی مجموعہ 'شیر کیا سوچتا ہوگا' کے نام سے بھی چھپ چکا ہے۔

رفیق حسین کے افسانوں میں مناظرِ فطرت کی حسین اور سچّی تصویریں ملتی ہیں۔ انھیں الفاظ کے صوتی آہنگ سے تاثر پیدا کرنے میں کمال حاصل ہے۔ مختلف جانوروں کی آوازوں، پرندوں کی بولیوں، پانی کے بہنے کے

شور، ہوا کے چلنے کی دھیمی اور تیز آوازوں، جنگل کی سائیں سائیں سے وہ اپنے افسانوں میں حیرت کا سماں پیدا کر دیتے ہیں۔

سدرشن (1896-1967) : پنڈت بدری ناتھ سدرشن سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ وہ متعدد اردو ہندی رسالوں کے مدیر رہے۔ 'چندن' نام سے اردو میں ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ بعد میں وہ لاہور سے کلکتہ چلے گئے۔ وہاں انھوں نے ڈرامے بھی لکھے۔ کچھ دنوں بعد ممبئ منتقل ہو گئے اور فلموں کے لیے کہانیاں، گانے اور مکالمے لکھنے لگے۔

انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو سے کیا پھر وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے۔ وہ افسانہ نگاری میں پریم چند کے مقلّد تھے۔ ان کا انتقال ممبئ میں ہوا۔ 'چندن' اور 'سدا بہار پھول' ان کے افسانوں کے مجموعوں کے نام ہیں۔

علی عبّاس حسینی (1897-1969) : علی عباس حسینی غازی پور کے ایک قصبے بارہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 1915 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور 1924 میں الہٰ آباد سے ایم۔ اے۔ کی سند حاصل کی۔

علی عبّاس حسینی رابندر ناتھ ٹیگور اور شرت چندر کی تخلیقات سے بے حد متاثر تھے۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور پریم چند کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے ناول، ڈرامے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ 'اردو ناول کی تنقیدی تاریخ' ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ ان کے بعض افسانے بچّوں کی نفسیات سے متعلق ہیں۔

اعظم کریوی (1898-1954) : ان کا اصل نام اعظم حسین تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں اور اعلیٰ تعلیم الہٰ آباد میں حاصل کی۔ وہ شاعر بھی تھے لیکن شہرت انھیں افسانہ نگاری سے ملی۔ اعظم کریوی کے فکر و فن پر پریم چند کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ مغرب پرستی کے مُضِر اثرات کو انھوں نے اپنے افسانوں میں نمایاں کیا ہے۔

'پریم کی چوڑیاں'، 'کنول کے پھول' اور 'روپ سنگھار' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

ستیارتھی (1908/26-2003) : دیویندر ستیارتھی کی پیدائش بدھوڑ (پٹیالہ) میں ہوئی۔ انھوں نے ڈی۔ اے۔ وی کالج ،لاہور سے بی اے کیا۔ اردو اور ہندی میں متعدد افسانے تحریر کیے۔ ان کے افسانوں کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کا تانا بانا لوک گیتوں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ان کے افسانوں میں ہندوستانی عوام کی سیدھی سادی زندگی کی حقیقی تصویریں ملتی ہیں۔

ستیارتھی کے طرزِ بیان پر بھی ہندوستانی لوک کتھاؤں کا اثر صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔'دیا جلے ساری رات'، 'لا چی'، 'ہرنی'، 'جنگلی کبوتر'، 'لال دھرتی'، 'نئے دیوتا'، 'نئے دھان سے پہلے'، 'دوراہا'، 'پھر وہی کنجِ قفس' اور 'قبروں کے بیچوں بیچ' ان کے مشہور افسانے ہیں۔ اردو، ہندی اور پنجابی میں ان کی 45 کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

اشک (1910-1996) : ان کا نام اُپندر ناتھ تھا۔ ان کی پیدائش جالندھر میں ہوئی۔ زندگی کا بڑا حصہ الہ آباد میں گزرا۔ انھوں نے کئی ادبی رسالوں کی ادارت بھی کی۔

ان کے افسانوں میں اصلاحی اور اخلاقی پہلو نمایاں ہے۔ ان کا اسلوب سادہ اور پر اثر تھا۔ 'کونپل'، 'قفس'، 'چٹان'، 'پلنگ' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ انھیں اقبال سمان کے علاوہ کئی دیگر اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

حیات اللہ انصاری (1911-1999) : حیات اللہ انصاری لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم انھوں نے گھر میں حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے۔ کیا۔ انھیں سیاست اور صحافت میں خاص دلچسپی تھی۔ وہ ملک کے مشہور اردو اخبار 'قومی آواز' سے بحیثیت مدیر منسلک رہے۔ حیات اللہ انصاری مہاتما گاندھی کے افکار سے متاثر تھے۔ 'بھرے بازار میں'، 'شکستہ کنگورے'، 'موزوں کا کارخانہ' اور 'انوکھی مصیبت' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں انسان کے داخلی کردار اور زندگی کی بے رحم حقیقتوں کا بیان ملتا ہے۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے ایک ضخیم ناول 'لہو کے پھول' پانچ جلدوں میں لکھا ہے۔ اس ناول کی پوری کہانی 'تحریکِ آزادی' کے پس منظر میں بیان کی گئی ہے۔ اس ناول کے علاوہ 'گھروندا' اور 'مدار' جیسے ناول بھی اپنے موضوع کے نئے پن کی وجہ سے کافی اہم خیال کیے جاتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی (1911-1979) : ان کا اصل نام مجیب الرحمٰن تھا لیکن سہیل عظیم آبادی کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ وہ بہار کے ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کلکتہ گئے۔ وہاں

انھوں نے اخباروں میں بھی کام کیا۔ واپس آکر پٹنہ سے ایک روزنامہ 'ساتھی' جاری کیا۔ اس کے بعد ماہنامہ 'تہذیب' نکالا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے۔

سہیل عظیم آبادی نے اپنے فن پر پریم چند کے اثرات کا اعتراف کیا ہے۔ 'الاؤ'، 'نئے پرانے' اور 'چار چہرے' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ انھوں نے ایک ناولٹ 'بے جڑ کے پودے' بھی لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی عورت کی نفسیات کو ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کی زبان پریم چند کی زبان کی طرح سادہ اور سہل ہے۔

صالحہ عابد حسین (1913-1988) : ان کا نام مصداق فاطمہ تھا۔ وہ پانی پت میں پیدا ہوئیں۔ خواجہ غلام الثّقلین کی صاحب زادی اور ڈاکٹر سیّد عابد حسین کی بیوی تھیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔ وہ ناول نویس اور افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ صالحہ عابد حسین نے اپنے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کے ذریعے انسانی اور تہذیبی قدروں کو عام کیا اور عورتوں کے مسائل اور سماجی خرابیوں کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ حکومتِ ہند نے ان کو 'پدم شری' کا اعزاز عطا کیا۔ ان کے ناولوں میں 'عذرا'، 'آتشِ خاموش'، 'قطرے سے گہر ہونے تک'، 'یادوں کے چراغ' اور 'اپنی اپنی صلیب' قابلِ ذکر ہیں۔ 'یادگارِ حالی' بھی ان کی اہم کتاب ہے۔

اس طرح پریم چند کا عہد اردو کے افسانوی ادب میں اہم موڑ کے طور پر اپنی شناخت رکھتا ہے۔ اس عہد میں پریم چند اور ان کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے اردو میں نہ صرف افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے فن کو جلا بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا بلکہ فکری و لسانی اعتبار سے بھی اردو فکشن کو کئی نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

باب 12

ترقی پسند دور

13085CH12

اردو ادب میں انقلابی تبدیلیوں کے لحاظ سے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس دوران ادیبوں کے طرزِ فکر میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ انھوں نے اشرافیہ طبقے کی جگہ غریبوں اور پس ماندہ طبقات کی طرف خاص توجہ دی۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل چند نوجوانوں نے 1932 میں 'انگارے' نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں انقلابی فکر نمایاں تھی۔ یہ افسانے اپنی فکر کے ساتھ اپنی زبان اور اسلوب کے اعتبار سے بھی نئے تھے۔ اس کے بعد 1935 میں لندن میں مقیم چند نوجوانوں نے 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کی داغ بیل ڈالی۔ بعد ازاں ہندوستان میں 1936 میں باقاعدہ 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کا قیام عمل میں آیا جس کے نتیجے میں اس تحریک کے اثرات پورے ملک میں پھیل گئے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک کو نمایاں حیثیت حاصل ہے جس نے بہ یک وقت تمام اصنافِ ادب کو متاثر کیا اور ایسے موضوعات کو بنیاد بنایا جن کا تعلق جدید عہد کے عوامی مسائل سے تھا۔ اسی بنا پر ترقی پسند ادب کا آہنگ بلند اور فکر احتجاجی ہے۔

چوتھی دہائی سے چھٹی دہائی تک کا دور اردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسند ادب کے غلبے کا دور رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک و فکر سے وابستہ ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی تخلیقی کاوشوں سے مختلف اصنافِ ادب میں ترقی پسند ادب کا ایک بڑا سرمایہ جمع ہو گیا۔ شاعری ہو یا فکشن یا تنقید، ہر شعبے میں ترقی پسند تخلیق کاروں اور ناقدین کی بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ ان میں بہ طور شاعر مخدوم محی الدین، مجاز، فیضؔ، جذبی، علی سردارؔ جعفری، وامقؔ، جاں نثار اخترؔ، احسان دانشؔ، کیفی، ساحرؔ اور مجروحؔ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ فکشن نگار کے طور پر کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، عزیز احمد، رشید جہاں، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، رتن سنگھ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جب کہ تنقید نگاروں میں مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، عبدالعلیم، احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین، محمد حسن وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

نمائندہ شعرا

مخدؔوم محی الدّ ین (1908-1969): مخدؔوم ان ترقی پسند شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے عملی طور پر بھی اس تحریک کو توانائی بخشی۔ وہ سابق ریاست حیدرآباد کے ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک مذہبی خانوادے سے تھا۔ تعلیم کے مراحل طے کرنے کے بعد انھوں نے 'مشیرِ دکن'، 'الاعظم' اور 'پیام' جیسے اخبارات میں ملازمت کی۔ کچھ عرصے تک سٹی کالج حیدرآباد میں اردو کے استاد بھی رہے۔ بعد میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر مستقل طور پر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوگئے۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے انھیں کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ وہ اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔

مخدوم عملی سیاست میں داخل ہونے کے بعد ہمیشہ پس ماندہ، مزدور اور غریب طبقوں کی حمایت کرتے رہے۔ انھوں نے حیدرآباد دکن میں جاگیرداری نظام کے خلاف لڑتے ہوئے وہاں کے کسانوں کی قیادت بھی کی۔ مخدؔوم نے 1936 میں حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ ان کی شاعری میں انقلابی تصورات کے ساتھ غنائیت کا رنگ حاوی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری انقلاب اور رومان کا سنگم ہے۔ 'چاند تاروں کا بن' اور 'اِک چنبیلی کے منڈوے تلے' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ نظموں کے علاوہ انھوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ 'سرخ سویرا' 1944 میں اور دوسرا 'گلِ تر' 1961 میں شائع ہوا۔ 'بساطِ رقص' ان کا کلّیات ہے۔ دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ تدفین حیدرآباد میں ہوئی۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے	سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو	چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

مجاؔز (1911-1955): ان کا نام اسرار الحق تھا۔ وہ قصبہ ردولی، ضلع بارہ بنکی، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے اور وہیں سے 1936 میں انھوں نے بی۔اے۔ کی سند حاصل کی۔ اسی زمانے میں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور انھیں اپنے ساتھی شعرا میں بڑی شہرت ملی۔ مجاؔز نے آل انڈیا

ریڈیو، دہلی کے علاوہ ممبئی کے محکمۂ اطلاعات میں بھی ملازمت کی۔ کچھ عرصے تک ہارڈنگ لائبریری، دہلی سے بھی وابستہ رہے۔ رسالہ 'نیا ادب' لکھنؤ سے بھی ان کا تعلق رہا۔

مجاز کا مجموعۂ کلام 'آہنگ' 1938 میں شائع ہوا۔ ان کی شاعری میں انقلاب، رومان اور تغزل کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی اور دونوں میں شہرت حاصل کی۔ نظموں میں 'آوارہ'، 'اندھیری رات کا مسافر'، 'رات اور ریل'، اور 'ترانۂ علی گڑھ' بہت مقبول ہوئیں۔ مجاؔز کی شاعری میں انقلابی آہنگ ملتا ہے۔ خوب صورت استعارات وتشبیہات ان کی شاعری کی تاثیر میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک خاص قسم کی غنائیت پائی جاتی ہے۔

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا　　تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے　　وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

فیضؔ (1911-1984) : ان کا نام فیض احمد تھا۔ سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایک مدرسے میں حاصل کی۔ اسکاچ مشن ہائی اسکول سے میٹرک اور مرے کالج، سیال کوٹ سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے انگریزی میں اور اورینٹل کالج، لاہور سے عربی میں ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ امرتسر اور لاہور کے کالجوں میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے۔ فیض انجمن ترقی پسند مصنفین کی پنجاب شاخ کے بانی رکن اور ماہنامہ 'ادبِ لطیف' کے مدیر بھی تھے۔ پھر 1942 سے 1946 تک بہ حیثیت لیفٹیننٹ کرنل فوج کے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ سے منسلک رہے۔ انھوں نے انگریزی روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' کی ادارت بھی کی۔ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر اور ملک اور بیرونِ ملک مزدور یونین کے رکن بھی رہے۔ راولپنڈی سازش کیس میں انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ انھیں مختلف قومی اور بین الاقوامی اعزازات بھی پیش کیے گئے جن میں سوویت روس کا لینن انعام بھی شامل تھا۔

فیضؔ کا پہلا مجموعۂ کلام 'نقشِ فریادی' 1941 میں منظرِ عام پر آیا۔ ان کے دوسرے مجموعے 'دستِ صبا'، 'زنداں نامہ'، 'دستِ تہِ سنگ'، 'سرِ وادیِ سینا'، 'شامِ شہرِ یاراں'، 'مرے دل مرے مسافر' کے نام سے شائع ہوئے۔ 'نسخہ ہائے وفا' ان کا کلّیات ہے۔ 'میزان' فیضؔ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ 'صلیبیں مرے دریچے میں' خطوط کا، 'متاعِ لوح و قلم'، 'تقاریر کا اور 'مہ وسالِ آشنائی' یادوں اور تاثرات کا مجموعہ ہے۔

فیضؔ کی شاعری رومان اور حقیقت کا سنگم ہے۔ ان کی شاعری عشقِ محبوب سے عشقِ وطن اور انقلاب تک کا سفر کرتی ہے۔ جس میں غمِ ذات کے مقابلے میں غمِ جہاں کا درد زیادہ ہے۔

'دو عشق'، 'تنہائی'، 'بول'، 'نثار میں تری گلیوں کے...'، 'دستِ صبا'، 'چمک اٹھے ہیں سلاسل'، 'زنداں کی ایک شام'، 'یاد'، 'ملاقات'، 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'، 'صبحِ آزادی' اور 'شیشوں کا مسیحا' ان کی اہم نظمیں ہیں۔ ان کی غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمھارے بام پر آنے کا نام

وہ بات، سارے فسانے میں جس کا ذِکر نہ تھا
وہ بات، اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

مقام، فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

احسان دانشؔ (1911/14-1982): ان کا نام احسان الحق اور دانشؔ تخلص تھا۔ وہ کاندھلہ، ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے لیکن مطالعے کا شوق انھیں بچپن سے تھا۔ انھوں نے زندگی کا بڑا حصّہ لاہور میں گزارا۔

احسان دانشؔ کی نظموں میں غریب اور کمزور طبقوں کی زندگی کا عکس نمایاں ہے۔ انھوں نے مزدوروں پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں، اسی لیے 'شاعرِ مزدور' کے لقب سے جانے جاتے ہیں۔ 'نوائے کارگر'، 'چراغاں' اور 'آتشِ خاموش' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کی زبان سہل اور رواں ہے۔ عام بول چال کے لفظوں کو بہت خوبصورتی سے برتتے ہیں۔ ان کی نظموں میں 'صبحِ بنارس' اور 'بیتے ہوئے دن' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کچھ لوگ جو سوار ہیں کاغذ کی ناؤ پر
تہمت تراشتے ہیں ہوا کے دباؤ پر

سورج کے سامنے ہیں نئے دن کے مرحلے
اب رات جا چکی ہے گذشتہ پڑاؤ پر

جذبیؔ (1912-2005): ان کا نام معین احسن تھا۔ وہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے جھانسی، آگرہ، لکھنؤ، دہلی اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ ابتدا میں بھوپال کے ایک اسکول میں بہ حیثیت مدرّس کام کیا۔ پھر رسالہ 'آجکل'، دہلی سے وابستہ ہوگئے۔ بعدازاں علی گڑھ کے شعبۂ اردو سے منسلک ہوگئے۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد علی گڑھ ہی میں مستقل قیام رہا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ جذبی کو 'امتیازِ میر'، 'غالب ایوارڈ' اور 'اقبال سمّان'

سے سرفراز کیا گیا۔ 'فروزاں'، 'سخنِ مختصر' اور 'گدازِ شب' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'حالؔی کا سیاسی شعور' ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔

جذبی نے ابتدا میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر سماجی اور سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ انھوں نے غزل اور نظم دونوں میں اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔

زندگی ہے تو بہرحال بسر بھی ہوگی — شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہوگی
جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنّا کس کو تھی — اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنّا کون کرے
کلیاں نہ کھِل سکیں تو یہ بادِ سحر کا جرم — خوفِ خزاں کو موردِ الزام کیا کریں

وامقؔ جونپوری (1912/13-1998): ان کا نام احمد مجتبیٰ تھا۔ پیدائش جونپور میں ہوئی۔ وہ عربی، فارسی کے علاوہ سنسکرت پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے وکالت کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ان کے کلام کے دو مجموعے 'جرس' اور 'شبِ چراغ' شائع ہوئے۔ انھوں نے سماجی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ 'بھوکا ہے بنگال' اور 'مینا بازار' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ وہ گیت نما احتجاجی نظموں کی وجہ سے عوام میں بہت مقبول تھے۔

دست و پا شل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں — لیکن اس شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں
آکے پھر لوٹ چلی کشتیِ دل ساحل سے — پھر کسی موجۂ طوفاں نے پکارا تو نہیں

علی سردار جعفری (1913-2000) : ان کا پورا نام علی سردار جعفری تھا۔ ان کی پیدائش بلرامپور (یو۔ پی) میں ہوئی۔ دہلی، علی گڑھ اور لکھنؤ میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ انگریزی، اردو اور فارسی ادب کا اچھا مطالعہ تھا۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے۔ کچھ عرصے تک اتر پردیش کی صوبائی شاخ کے سکریٹری رہے۔ 'قومی جنگ'، 'نیا ادب'، 'پرچم' جیسے رسائل میں بھی انھوں نے کام کیا اور انھوں نے 'گفتگو' کے نام سے ممبئی سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا تھا۔ ان کا انتقال ممبئی میں ہوا۔

سردار جعفری نے ابتدا میں مرثیے اور افسانے لکھے۔ ان کی تخلیقات میں سب سے پہلے ان کا افسانوی مجموعہ 'منزل' 1939 میں شائع ہوا۔ لیکن ان کا اصل میدان شاعری اور تنقید ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں 'پرواز'، 'خون کی لکیر'، 'امن کا ستارہ'، 'ایشیا جاگ اٹھا'، 'پتھّر کی دیوار'، 'ایک خواب اور'، 'پیراہنِ شرر' اور 'لہو پکارتا ہے'

شامل ہیں۔ 'ترقی پسند ادب'، 'لکھنؤ کی پانچ راتیں'، 'پیغمبرانِ سخن'، 'اقبال شناسی' ان کی نثری تصانیف ہیں۔ ان کی ادبی و سماجی خدمات کے اعتراف میں انھیں متعدد انعامات پیش کیے گئے جن میں ادب کا سب سے بڑا انعام 'گیان پیٹھ ایوارڈ' اور 'اقبال سمّان' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی شاعری جدو جہد اور عملِ پیہم سے عبارت ہے۔ 'نئی دنیا کو سلام' ان کی ایک مشہور ڈرامائی نظم ہے۔ ان کی غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں :

حکایتیں بھی بہت ہیں شکایتیں بھی بہت
مزہ تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے

ستم کو سرنگوں ظالم کو رسوا ہم بھی دیکھیں گے
چل اے جوشِ بغاوت چل تماشا ہم بھی دیکھیں گے

چاند کے کٹورے سے چاندنی چھلکتی ہے
دل کے سبزہ زاروں میں، پھر بھی اک اندھیرا ہے

جاں نثار اختر (1914-1976) : ان کا نام جاں نثار حسین رضوی اور تخلص اختر تھا۔ وہ گوالیار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ علی گڑھ سے ایم۔اے کرنے کے بعد ان کا تقرر وکٹوریہ کالج، گوالیار میں ہو گیا۔ پھر بھوپال کے حمیدیہ کالج میں صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے۔ بعد میں وہ ممبئی چلے گئے اور وہاں فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ جاں نثار اختر کا شمار اہم ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ 'سلاسل'، 'جاوداں'، 'تارِ گریباں'، 'خاکِ دل'، 'پچھلے پہر' اور 'گھر آنگن' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ انھوں نے غزل، نظم، مرثیہ، رباعی اور مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مثنوی 'امن نامہ' بھی مشہور ہے۔

جاں نثار اختر نے 'ہندوستان ہمارا' کے نام سے قومی اور وطنی شاعری سے متعلق ایک مجموعہ بھی دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ 1974 میں انھیں 'سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ' پیش کیا گیا۔

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم تو یہ رسم اٹھا دی جائے

چلو نہ عشق ہی جیتا، نہ عقل ہار سکی
تمام وقت مزے کا مقابلہ تو رہا

ہم سے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح
ہم نے چاہا ہے تمھیں چاہنے والوں کی طرح

ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اُڑا دی جائے

اختر الایمان (1915-1996) : اختر الایمان نجیب آباد، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر کا ابتدائی حصہ دلّی میں گزرا۔ دلّی کالج سے بی۔اے کرنے کے بعد دلی میں ملازمت کی اور پھر آل انڈیا ریڈیو میں کام کیا۔ اس کے بعد وہ ممبئی چلے گئے جہاں وہ فلموں کے لیے لکھتے رہے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

اختر الایمان اردو نظم کے ممتاز شاعر ہیں۔ میرا جی اور ن۔م۔ راشد کے بعد جن شاعروں نے اردو نظم کو استحکام بخشا اور اُس کے ارتقا میں نمایاں کردار ادا کیا، اُن میں اختر الایمان کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اختر الایمان کی نظمیں اپنے انفرادی لب و لہجے اور زبان کے مخصوص آہنگ کی بنا پر الگ سے پہچانی جاتی ہیں۔ ان کا ایک خاص وصف ڈرامائی پہلو ہے۔ 'گرداب'، 'تاریک سیّارہ'، 'آب جو'، 'یادیں'، 'بنتِ لمحات' اور 'نیا آہنگ' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کا کلّیات 'سروساماں' کے نام سے 1984 میں منظرِ عام پر آیا۔ 'اس آباد خرابے میں' ان کی خودنوشت سوانح ہے۔ اختر الایمان کے چوتھے مجموعے 'یادیں' پر 1962 میں 'ساہتیہ اکادمی ایوارڈ' دیا گیا۔ اس کے علاوہ انھیں 'اقبال سمّان' اور بعض دوسرے اعزازات اور انعامات بھی پیش کیے گئے۔

مجروحؔ سلطان پوری (1915-2000) : ان کا نام اسرارالحسن خاں تھا۔ ان کی پیدائش اعظم گڑھ میں ہوئی، اصل وطن سلطانپور تھا۔ اعظم گڑھ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے فیض آباد اور الہ آباد گئے۔ انھوں نے تکمیل الطِب کالج، لکھنؤ سے طِب کی سند بھی حاصل کی تھی۔

مجروح نے ترقی پسندی کے اس دور میں بھی غزل کی کلاسیکی روایت سے خود کو وابستہ رکھا جب کہ ترقی پسند شعرا کے اظہار کا خاص وسیلہ نظم تھی۔ مجروح کی غزلوں میں ترقی پسند فکر کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام 'غزل' کے نام سے شائع ہوا۔ اُنھیں 'غالب ایوارڈ' اور 'اقبال سمّان' سے بھی نوازا گیا۔ مجروح ایک مقبول فلمی نغمہ نگار بھی تھے۔ ان کا انتقال ممبئی میں ہوا۔ ان کی غزلوں کے نمائندہ شعر دیکھیے :

سر پر ہوائے ظلم چلے، سو جتن کے ساتھ	اپنی کلاہِ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار	رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
ستونِ دار پر رکھتے چلو سروں کے چراغ	جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر	لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

کیفیؔ اعظمی (1918/24-2002) : ان کا نام سید اطہر حسین رضوی تھا۔ ان کی پیدائش ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مذہبی تعلیم کی غرض سے وہ لکھنؤ کے ایک مدرسہ میں داخل کیے گئے۔ ان کا شمار ممتاز ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ کیفی کمیونسٹ پارٹی کے ایک سرگرم رکن بھی تھے۔ ان کی شاعری میں سماجی مسائل کی ترجمانی ملتی ہے۔ 'تبسّم'، 'حوصلہ'، 'پامسٹ'، 'پشیمانی'، 'عورت' اور 'سپردگی' وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ وہ ایک معروف فلمی نغمہ نگار بھی تھے۔ 'جھنکار' اور 'آخرِ شب' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'کیفیات' کے نام سے ان کا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔

ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ملینیم ایوارڈ (Millenium Award) اور دیگر دوسرے اعزازات بھی پیش کیے گئے۔ ان کی وفات ممبئی میں ہوئی۔

جنگل کی ہوائیں آ رہی ہیں کاغذ کا یہ شہر اُڑ نہ جائے
سب اپنے پاؤں پہ رکھ رکھ کے پاؤں چلتے ہیں خود اپنے دوش پہ ہر آدمی سوار سا ہے

ساحرؔ لدھیانوی (1980-1921) : ان کا نام عبدالحئی تھا۔ وہ لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد انھوں نے لاہور کے مشہور رسالے 'ادبِ لطیف' اور 'سویرا' کی ادارت کی۔ کچھ عرصہ وہ 'شاہراہ' دہلی سے بھی وابستہ رہے۔ اس کے بعد روزگار کی تلاش میں ممبئی پہنچے اور فلموں کے لیے گیت لکھنے لگے۔ یہاں وہ ایک کامیاب نغمہ نگار ثابت ہوئے۔ ساحرؔ کا شمار اہم ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ انسان دوستی ساحرؔ کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بھی ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

ان کے شعری مجموعے 'تلخیاں'، 'آؤ کہ خواب بنیں' اور فلمی گیتوں کا مجموعہ 'گاتا جائے بنجارا' کے نام سے شائع ہوا۔

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے
انھیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے کہ کچھ مدّت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے
اے غمِ دنیا تجھے کیا علم تیرے واسطے کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی

سلامؔ مچھلی شہری (1973-1921) : ان کا نام عبدالسلام تھا۔ وہ قصبہ مچھلی شہر، ضلع جون پور، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی کی لائبریری میں ملازمت کی۔ بعد میں آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے بہ حیثیت پروڈیوسر وابستہ ہو گئے۔ اپنی رومانی نظموں میں انھوں نے جدّت طرازی کی بہت اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔ گفتگو کے انداز اور ڈرامائی عناصر کے استعمال سے انھوں نے اپنی بعض نظموں کو افسانے کی طرح دل چسپ بنا دیا ہے۔ انھوں نے نظم میں ہیئت کے کئی تجربے کیے۔ 'میرے نغمے'، 'پایل' اور 'وسعتیں'، ان کے شعری مجموعے ہیں۔ انھوں نے گیت آمیز زبان بھی کامیابی سے استعمال کی اور گیتوں کے عمدہ نمونے بھی پیش کیے ہیں۔

سلام مچھلی شہری کو ان کی ادبی وشعری خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے 'پدم شری' کے اعزاز سے نوازا۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

اس دور کے دیگر اہم شعرا میں شمیم کرہانی، روش صدیقی، سکندر علی وجد، غلام ربّانی تاباں اور نشور واحدی شامل ہیں۔

نمائندہ فکشن نگار

کرشن چندر (1914-1977) : ان کی پیدائش وزیرآباد (پاکستان) میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کشمیر میں حاصل کی۔ بعد میں لاہور سے ایم۔ اے اور ایل ایل۔ بی کے امتحان پاس کیے۔ کچھ عرصے تک وکالت کی اور درس وتدریس سے بھی وابستہ رہے۔ ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت بھی کی۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ ممبئی میں گذرا۔ انھوں نے فلموں کے لیے کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے۔ ان کا انتقال ممبئی ہی میں ہوا۔

کرشن چندر نے افسانوں اور ناولوں کے علاوہ ڈرامے، رپورتاژ اور طنزیہ مضامین بھی لکھے لیکن انھیں مقبولیت ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ملی۔ ترقی پسند تحریک سے گہری وابستگی تھی۔ ان کے افسانوں کے مجموعوں میں 'ان داتا'، 'زندگی کے موڑ پر'، 'نظارے'، 'اجنتا سے آگے'، 'میں انتظار کروں گا' اور 'سمندر دور ہے'، بہت مقبول ہوئے۔ کشمیر کی شادابی، فطرت کا حسن اور مظلوموں اور سماج کے دبے کچلے طبقات کی زندگی کے مسائل ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ ناولوں میں 'شکست'، 'ایک گدھے کی سرگزشت'، 'جب کھیت جاگے'، 'باون پتّے'، 'میری یادوں کے چنار'، 'ایک عورت ہزار دیوانے'، 'الٹا درخت' کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ان کا ڈراما 'دروازے کھول دو' بہت مشہور ہے۔ کرشن چندر نے 'پودے' کے علاوہ دو اور رپورتاژ لکھے۔ ان کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ 'ہوائی قلعے' کے نام سے شائع ہوا۔ وہ ایک صاحبِ طرز فکشن نگار ہیں۔ ان کی تخلیقات میں حقیقت اور رومانیت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

خواجہ احمد عباس (1914-1987) : خواجہ احمد عباس پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق الطاف حسین حالؔی کے خاندان سے تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم مختلف شہروں میں حاصل کی۔ وہ 1935 میں ممبئی چلے گئے اور انگریزی اخبار 'بامبے کرانیکل' میں ملازم ہو گئے۔ انھوں نے 1942 میں فلمی دنیا کے لیے

ایک کہانی 'نیا سنسار' لکھی جسے بامبے ٹاکیز نے فلمایا تھا۔ انھوں نے فلموں کے لیے نہ صرف کہانیاں لکھیں بلکہ فلمیں بھی بنائیں۔ اس کے علاوہ انگریزی اخبار 'بلٹز' اور اس کے اردو ایڈیشن کے لیے 'آخری صفحہ' کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے رہے۔

'ایک لڑکی'، 'پاؤں میں پھول'، 'زعفران کے پھول' اور 'دیا جلے ساری رات' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک صحت مند معاشرے کی جستجو نظر آتی ہے۔ 'انقلاب' ان کا ایک مشہور ناول ہے۔

عزیز احمد (1978-1914): عزیز احمد کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ وہیں تعلیم بھی حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں ترقی پسند مصنفین کے کئی جلسوں میں شریک ہوئے۔ وہ ترقی پسند نظریات کے زبردست حامی تھے۔ افسانوں اور ناولوں کے علاوہ انھوں نے تنقیدی موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا۔ ان کے ترجمے بھی مقبول ہوئے۔ وہ ایک ناول نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد انھوں نے پاکستان کی شہریت حاصل کر لی۔ پھر وہاں سے وہ کناڈا چلے گئے۔ ان کی وفات وہیں ہوئی۔

عزیز احمد کا پہلا ناول 'ہوس' 1937 میں منظر عام پر آیا۔ 'گریز'، 'ایسی بلندی ایسی پستی'، 'آگ' اور 'شبنم' ان کے دیگر اہم ناول ہیں۔ 'رقصِ ناتمام'، 'بیکار دن بیکار راتیں'، اور 'تیری دلبری کا بھرم' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ عزیز احمد نے 'ترقی پسند ادب' اور 'اقبال نئی تشکیل' نام کی کتابیں بھی لکھیں۔

عِصمت چغتائی (1991-1915): ان کی پیدائش جودھ پور، راجستھان میں ہوئی۔ ان کا بچپن جے پور اور آگرہ میں گزرا۔ وہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم پائی۔ بی۔ اے۔ اور بی۔ ایڈ۔ کی ڈگریاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ انھوں نے مختلف اسکولوں میں ملازمت بھی کی۔ ممبئی میں مدارس کی انسپکٹرلیس بھی رہیں۔ پھر فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئیں۔ ان کی ذہنی تربیت ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ہوئی۔ مسلم گھرانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے طرزِ زندگی اور نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے ممبئی ہی میں وفات پائی۔

عصمت چغتائی نے ناول، افسانے اور رپورتاژ لکھے۔ انھیں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت ملی۔ 'دو ہاتھ'، 'چھوئی موئی'، 'کلیاں' اور 'چوٹیں' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ 'ضدّی'، 'ٹیڑھی لکیر'، 'معصومہ'، 'سودائی' اور 'ایک قطرۂ خون'

ان کے اہم ناول ہیں۔ انھیں عورتوں کی زبان اور محاورات کے استعمال میں مہارت حاصل تھی۔ عصمت نے کچھ خاکے بھی لکھے۔ ان میں 'دوزخی' بہت مشہور ہوا جو انھوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر لکھا تھا۔ 'بمبئی سے بھوپال تک' ان کا ایک یادگار رپورتاژ ہے۔ عصمت کی تحریروں کی خاص پہچان ان کی طنز آمیز زبان ہے جس میں نشتریت اور بے باکی پائی جاتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی (1915-1984) : بیدی لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بچپن ہی سے انھیں قصّے اور کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق تھا۔ انھوں نے کچھ عرصے تک ڈاک خانے میں اور پھر ریڈیو میں ملازمت کی۔ تقسیمِ ملک کے بعد وہ لاہور سے دہلی چلے آئے پھر کچھ دنوں تک جمّوں ریڈیو اسٹیشن سے منسلک رہے۔ اس کے بعد وہ ممبئی میں فلموں سے وابستہ ہوگئے۔

بیدی کا اصل میدان افسانہ نگاری ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے 'گرہن'، 'کوکھ جلی'، 'دانہ و دام' اور 'اپنے دکھ مجھے دے دو' مشہور ہیں۔ زندگی کے چھوٹے موٹے واقعات ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ انسانی زندگی کی تہہ میں اتر کر اس کی نفسیات کا راز پا لینے میں بیدی کو کمال حاصل تھا۔ ایسے افسانوں میں، 'زین العابدین'، 'گرہن'، 'کوکھ جلی'، اور 'لاجونتی' کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ بیدی زندگی کے تاریک گوشوں میں محبت، ہمدردی اور انسانیت کی کرن دیکھ لیتے تھے جس کی عکاسی 'گرم کوٹ'، 'من کی من میں'، 'دس منٹ بارش میں' وغیرہ افسانوں میں ملتی ہے۔ بچوں کی نفسیات پر 'تلادان' اور 'بھولا' ان کے بہترین افسانے ہیں۔ انھوں نے افسانوں میں عورت کے کردار کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ 'ایک چادر میلی سی' ان کا مشہور ناولٹ ہے۔

احمد ندیم قاسمی (1916-2006) : قاسمی ضلع شاہ پور (پاکستان) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم آبائی گاؤں میں ہوئی۔ 1935 میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے انھوں نے بی۔اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ رسالہ 'تہذیبِ نسواں' اور 'پھول' کی ادارت کی۔ انھوں نے 'فنون' کے نام سے ایک سہ ماہی جریدہ جاری کیا جس کے وہ آخر وقت تک مدیر رہے۔ ان کا انتقال لاہور میں ہوا۔

احمد ندیم قاسمی بیک وقت افسانہ نگار، شاعر اور صحافی بھی تھے۔ ان کے کئی افسانوی اور شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ادبی مضامین اور اخباری کالم نویسی کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ انھوں نے سب سے زیادہ شہرت اپنے

افسانوں کی وجہ سے پائی۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کی دیہی زندگی اور عام انسانوں کے مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ 'چوپال'، 'بگولے'، 'گرداب'، 'آنچل' اور 'طلوع وغروب' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

بلونت سنگھ (1921-1986) : وہ ضلع گوجراں والا میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں ہوئی۔ دہرہ دون کے کیمبرج اسکول سے انھوں نے میٹرک کیا۔ کرسچین کالج الٰہ آباد سے انٹر اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے۔ کرنے کے بعد معاش کی تلاش میں لاہور اور کراچی بھی گئے۔ دہلی میں رسالہ 'آج کل' کے نائب مدیر رہے۔ بلونت سنگھ نے الٰہ آباد سے اردو میں 'فسانہ' اور ہندی میں 'اردو ساہتیہ' کے نام سے دو رسالے بھی جاری کیے۔ ان کا انتقال الٰہ آباد میں ہوا۔

بلونت سنگھ نے کئی طویل اور مختصر ناول لکھے۔ 'رات چور اور چاند' اور 'چک پیراں کا جسّا' ان کے نمائندہ ناول ہیں۔ 'جگّا'، 'تارو پود'، 'ہندوستان ہمارا'، 'پہلا پتھر' اور 'سنہرا دیس' ان کے افسانوں کے اہم مجموعے ہیں۔ بلونت سنگھ نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں پنجاب کی دیہی زندگی کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچا ہے۔

خدیجہ مستور (1927-1982) : خدیجہ مستور کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کا پہلا افسانہ 'پہیا' 1941 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانے مؤقر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ خدیجہ مستور کے افسانے 'جوانی'، 'موہنی'، 'یہ بڈھے'، 'یہ ہم ہیں'، 'لاشیں'، 'پتنگ' وغیرہ بہت مقبول ہوئے۔ 'چند روز اور'، 'تھکے ہارے' اور 'ٹھنڈا میٹھا پانی' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ آزادی کی تڑپ، غریبی ومحرومی اور جنسی گھٹن ان کے خاص موضوعات ہیں۔ وہ ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ آزادی کے بعد وہ پاکستان منتقل ہوگئیں۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ 'آنگن' ان کا مشہور ناول ہے۔

رتن سنگھ (پ۔1927): رتن سنگھ ضلع سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہیں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ ملک کی تقسیم کے بعد دہلی چلے آئے اور کچھ عرصہ لکھنؤ میں بھی رہے۔ 1969 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'پہلی آواز' منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں 'پنجرے کا آدمی'، 'مانک موتی'، 'کاٹھ کا گھوڑا' اور 'پناہ گاہ' شامل ہیں۔ 'صبح کی پری' بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے مختصر ترین کہانیاں لکھی ہیں جو ایک منفرد پہچان رکھتی ہیں۔ 'سانسوں کا سنگیت' ان کا ناول ہے۔ انھوں نے دوہے بھی لکھے ہیں۔

رتن سنگھ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی اردو اکادمیوں اور تنظیموں نے انھیں اعزازات پیش کیے ہیں۔ انھوں نے اردو میں بعض پنجابی افسانوں اور ناولوں کے ترجمے بھی کیے۔ رتن سنگھ کا تعلق ادیبوں کی اس نسل سے ہے جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ ذہنی اور نظریاتی وابستگی رکھتی ہے۔

ہاجرہ مسرور (2012-1929) : ہاجرہ مسرور لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ ان کا پہلا افسانہ 'لاوارث لاشیں' تھا۔ ان کا مشہور افسانہ 'بندر کا گھاؤ' ساقی میں 1944 میں شائع ہوا۔ 'اوپر تلے'، 'تِل اوٹ پہاڑ'، 'نیلم'، 'میرا بھیّا' وغیرہ سے ادبی حلقوں میں انھوں نے خاصی شہرت حاصل کر لی۔ ان کے افسانوں میں سماجی مسائل پر تیکھا طنز ملتا ہے۔

ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'چرکے' ہے۔ اس میں شامل افسانے عورتوں کی مظلومیت اور بے بسی کی داستان بیان کرتے ہیں۔ 'ہائے اللہ'، 'چوری چھپے'، 'اندھیرے اجالے'، 'تیسری منزل' اور 'چاند کی دوسری طرف' ان کے دیگر مجموعے ہیں۔

قاضی عبدالستّار (2018-1930/33) : قاضی عبدالستّار، ضلع سیتاپور (اترّ پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیتاپور اور اعلیٰ تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بہ حیثیت استاد وابستہ رہے اور وہیں سے سبک دوش ہوئے۔

قاضی عبدالستّار نے ناول اور افسانے لکھے۔ تاریخی ناولوں کی وجہ سے انھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جاگیردارانہ اقدار و ماحول کو احساسِ تفاخر کے ساتھ پیش کیا۔ 'پہلا اور آخری خط'، 'شب گزیدہ'، 'غبارِ شب'، 'صلاح الدین ایوّبی'، 'دارا شکوہ'، 'غالب' اور 'خالد بن ولید' وغیرہ ان کے خاص ناول ہیں۔ 'پیتل کا گھنٹا'، 'رضو باجی'، 'ٹھاکر دوار' ان کے مشہور افسانے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے انھیں 'پدم شری' کا خطاب دیا۔ انھیں غالب ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔

جیلانی بانو (پ۔1936) : ان کا اصل وطن بدایوں (اترپردیش) ہے۔ ان کے والد حیدرآباد جا کر بس گئے تھے۔ وہیں ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ 'روشنی کے مینار'، 'نروان' اور 'کُن' اُن کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ انھوں نے کئی ناولٹ بھی لکھے جن میں 'جگنو اور ستارے' اور 'نغمے کا سفر' نمایاں ہیں۔ ان کے دو ناول 'ایوانِ غزل' اور 'بارشِ سنگ' بہت مقبول ہوئے۔

جیلانی بانو کے افسانوں اور ناولوں کا اصل موضوع حیدرآباد کے بعض جاگیرداروں کی بکھرتی ہوئی زندگی ہے۔ وہ حیدرآباد کی مخصوص بولی کا استعمال بھی بڑی چابک دستی سے کرتی ہیں۔ کئی ادبی اداروں نے انھیں اعزازات اور انعامات سے نوازا ہے۔

ترقی پسند دور کے دوسرے نمائندہ فکشن نگار

ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ایک ایسی نسل بھی پروان چڑھ رہی تھی جس نے روشن خیالی کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور ایسا ادب تخلیق کیا جس میں ضمیر کی آزادی کو ترجیح دی گئی تھی۔ یہ نسل نئے اسالیب اور نئی تکنیکوں کی طرف متوجہ تھی اسی لیے اس کے یہاں تازہ کاری بھی پائی جاتی ہے۔ اس طرح نئی فکر اور نئے لب و لہجے کے ساتھ اردو افسانے نے ایک نئی کروٹ لی۔ نئی جمالیاتی ونفسیاتی بصیرت نے اردو افسانے کو نئی بلندیوں اور وسعتوں سے آشنا کیا۔ اس دور کے ممتاز فکشن نگاروں میں منٹو، انتظار حسین اور قرۃ العین کے نام شامل ہیں۔

منٹو (1912-1955) : سعادت حسن منٹو لدھیانہ کے گاؤں سرالہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم امرتسر میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ بھی گئے لیکن زیادہ دنوں تک تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور جلد ہی ملازمت اختیار کر لی۔ اخبار 'مساوات' (امرتسر) اور ہفت روزہ 'مصوّر' (ممبئی) میں بھی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ آل انڈیا ریڈیو کے لیے ریڈیائی ڈرامے اور فیچر لکھے۔ بعد میں وہ ممبئی میں فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ تقسیم وطن کے بعد انھوں نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

منٹو کو اردو کا بڑا افسانہ نگار مانا جاتا ہے۔ موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے ان کے افسانے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ 1936 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'آتش پارے' شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ 'نیا قانون'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'کالی شلوار'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'موذیل' اور 'ہتک' ان کے اہم اور مشہور افسانے ہیں۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے اور کئی فلموں کے اسکرپٹ بھی لکھے۔ 'گنجے فرشتے' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔

انتظار حسین (1922/25-2016) : انتظار حسین اتر پردیش، ضلع بلند شہر اتر پردیش کے قصبہ ڈبائی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انھوں نے ہاپوڑ سے ہائی اسکول اور میرٹھ کالج سے اردو میں ایم۔ اے۔ کیا۔ وہ شروع سے ہی صحافی بننا چاہتے تھے۔ 1947 میں پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد وہ کئی اخبارات و رسائل سے منسلک رہے۔ ان میں 'امروز'، 'آفاق'، 'مشرق'، 'نظام'، 'نوائے وقت' شامل ہیں۔ انھوں نے ایک ادبی رسالہ 'خیال' بھی نکالا لیکن وہ جلد ہی بند ہو گیا۔ انتظار حسین کچھ دنوں تک 'ادبِ لطیف' لاہور کے مدیر بھی رہے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں داستانی رنگ پایا جاتا ہے لیکن انھوں نے اپنے افسانوں میں اساطیری روایات کو بھی عصری تناظر میں پیش کیا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'قیوما کی دکان' تھا۔ افسانوں کے پہلے مجموعے 'گلی کوچے'، کے بعد 'کنکری'، 'آخری آدمی'، 'شہرِ افسوس'، 'چیشمے سے دور'، 'خالی پنجرہ' اور 'شہرزاد' کے نام سے ان کے دوسرے مجموعے شائع ہوئے۔ 'چاند گہن'، 'بستی'، 'دن اور داستان'، 'تذکرہ' اور 'آگے سمندر ہے' ان کے مشہور ناول ہیں۔ انھوں نے کچھ معروف کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں اور حکیم اجمل خاں کی سوانح حیات 'اجملِ اعظم' کے نام سے لکھی۔ ان کے دو تنقیدی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

قرۃ العین حیدر (2007-1926/27) : قرۃ العین حیدر کا وطن نہٹور، ضلع بجنور ہے۔ ان کے والد کا نام سید سجاد حیدر یلدرم اور والدہ کا نام نذر سجاد حیدر تھا۔ ان کے والد اردو کے معروف ادیب ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ پھر دہلی یونیورسٹی سے بی۔اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ جدید انگریزی ادب، صحافت اور آرٹ (مصوری) کی تعلیم انھوں نے لندن میں حاصل کی۔

قرۃ العین حیدر نے مختلف سرکاری محکموں اور نجی اداروں میں ملازمت کی۔ وزارتِ اطلاعات ونشریات، پاکستان میں وہ انفارمیشن آفیسر رہیں۔ ہندوستان آنے کے بعد اخبار 'امپرنٹ' کی منیجنگ ایڈیٹر بن گئیں، وہ 'السٹریٹیڈ ویکلی' سے بھی وابستہ رہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی میں اردو کی وزیٹنگ پروفیسر تھی۔ انھوں نے امریکہ کی پانچ مشہور یونیورسٹیوں میں لکچر بھی دیے۔ انھیں مختلف اعزازات کے علاوہ حکومتِ ہند کی جانب سے 'پدم شری' اور 'پدم بھوشن' نیز ملک کا سب سے بڑا ادبی اعزاز 'گیان پیٹھ ایوارڈ' اور 'اقبال سمّان' بھی دیا گیا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ' برائے تراجم بھی ملا تھا۔

قرۃ العین حیدر نے اردو میں چار افسانوی مجموعے، چھے ناولٹ، نو ناول اور کئی رپورتاژ اور سفرنامے یادگار چھوڑے ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں مرتب بھی کیں۔ انھوں نے انگریزی اور دوسری زبانوں سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں متعدّد ترجمے بھی کیے۔ ان میں بچّوں کے لیے انگریزی کہانیوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی نظر میں بڑی وسعت اور فن میں گہرائی تھی۔ جیمس جوائس اور ورجینیا وولف جیسے نامور مغربی ادیبوں کا اثر ان کے یہاں بہت واضح نظر آتا ہے۔ ان کے کردار شعور کی رو کے سہارے ماضی کی بے کراں

وسعتوں میں سفر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول 'آگ کا دریا' میں ہندوستان کی ہزاروں برسوں پر پھیلی تہذیب اور فلسفے کو بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا مشاہدہ گہرا ہے اور عام طور پر انھوں نے اپنی کہانیوں میں اعلیٰ طبقے ہی کو توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات وغیرہ منفرد ہوتے ہیں۔ تاریخ اور جغرافیہ سے لے کر سماجیات، اخلاقیات، مذہب اور اساطیر کے عناصر تک ان کے افسانوں اور ناولوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ، دل کش اور رواں ہے۔

'میرے بھی صنم خانے'، 'سفینۂ غمِ دل'، 'آگ کا دریا'، 'آخرِ شب کے ہم سفر'، 'گردشِ رنگ چمن' اور 'چاندنی بیگم' ان کے اہم ناول ہیں۔ 'کارِ جہاں دراز ہے' ان کا سوانحی ناول ہے۔ 'ستاروں سے آگے'، 'شیشے کے گھر'، 'پت جھڑ کی آواز' اور 'روشنی کی رفتار' قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

نمائندہ ترقی پسند تنقید نگار

ترقی پسند تحریک کے اثرات شعر و افسانہ کے ساتھ ادبی تنقید پر بھی مرتّب ہوئے۔ ترقی پسند تنقید نے مارکسی نظریۂ ادب کے تحت ادب اور زندگی کے سماجی اور فکری رشتے کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا۔ ادب کا مقصد محض لطف اندوزی، حسنِ بیان نہیں ہے، زندگی کی تنقید اور زندگی کو ایک نئے معنی مہیا کرنا بھی اس کا ایک اہم مقصد ہے۔ ترقی پسند نظریۂ ادب ہر ایسے تصور کو مسترد کرتا ہے جس کی بنیاد ماضی پرستی پر قائم ہے۔ ترقی پسند تنقید نے ادب کو وقت کے تقاضوں کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے پر زور دیا۔ اس تصوّر پر اصرار کیا کہ انسانی شعور کی تشکیل میں سماج کے مادّی عناصر کا خاص دخل ہوتا ہے۔ زندگی ایک تغیّر پذیر حقیقت ہے، اسی معنی میں ادب میں بھی موضوعات اور اظہار کے طریقوں میں مختلف قسم کی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔

مجنوں گورکھپوری (1988-1904) : مجنوں پلڈہ، ضلع بستی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور اعلیٰ تعلیم گورکھپور میں حاصل کی۔ ان کا شمار صفِ اوّل کے اُن ترقی پسند نقادوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ترقی پسند فکر اور نظریۂ ادب کی ترویج و اشاعت میں حصّہ لیا۔ اُن کی ابتدائی تنقید پر تاثراتی رنگ غالب ہے۔ 'تنقیدی حاشیے' اور 'غزل سرا' کے مضامین اسی نوعیت کے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر مجنوں کے طرزِ فکر میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ 'نقوش و افکار'، 'جمالیات' اور 'شوپنہار' ان کی معروف کتابیں ہیں۔ ترقی پسند تنقید کی تاریخ میں مجنوں کے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'ادب اور زندگی' کو خاص مقام حاصل ہے۔

سجاد ظہیر (1905-1973) : سجاد ظہیر مچھلی شہر ضلع جونپور میں پیدا ہوئے۔ لندن میں دورانِ تعلیم ان کی ملاقات مُلک راج آنند اور دوسرے روشن خیال ہندوستانی نوجوانوں سے ہوئی۔ ان سبھی کی کوششوں سے ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔

سجاد ظہیر کی ادبی خدمات کے کئی پہلو ہیں۔ انھوں نے 'لندن کی ایک رات' نام کے ناولٹ کے علاوہ 'انگارے' کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا۔ صحافت کے میدان میں بھی انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ 'چنگاری'، 'نیا ادب'، 'عوامی دور' اور 'حیات' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ 'روشنائی' ان کی اہم تصنیف ہے جو صرف ایک رپورتاژ ہی نہیں، ترقی پسند ادب و تحریک کے ارتقا کی ایک غیر رسمی تاریخ بھی ہے۔ 'اردو ہندی ہندوستانی' اور 'اردو کی جدید انقلابی شاعری' ان کے اہم تنقیدی مضامین ہیں۔

سجاد ظہیر کارل مارکس کے نظریات سے متاثر تھے۔ 'اردو کی جدید انقلابی شاعری' میں انھوں نے ایسے ہی شعرا کے کلام کا تجزیہ کیا ہے جو اشتراکی نظریات کے حامی تھے۔ سجاد ظہیر نے اپنی تصنیف 'ذکرِ حافظ' میں حافظ شیرازی کے ذہن و فکر کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ 'پگھلا نیلم' ان کی نثری نظموں کا مجموعہ ہے۔

سجاد ظہیر کا شمار ہندوستان کی ترقی پسند ادبی تحریک کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ عالمی سیاسیات و اقتصادیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ سجاد ظہیر ادب میں فکر و افادیت کی اہمیت کے ساتھ ساتھ جمالیاتی و فنی پہلو کی پاسداری کے بھی قائل تھے۔

عبدالعلیم (1905-1976) : عبدالعلیم غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ان کی کتاب ایک چھوٹی کتاب ہے جس میں جدید رجحانات پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ مضامین نظریاتی مباحث کے لحاظ سے اہم ہیں۔ تنقید پر ان کا سب سے اہم مضمون 'ادبی تنقید کے بنیادی اصول' ہے۔

عبدالعلیم ادب پاروں میں جمالیاتی پہلو کی اہمیت کے قائل ہیں۔ حُسن کے ساتھ خیر اور صداقت کی اقدار کو بھی انھوں نے خاص اہمیت دی ہے۔ ان کا بیشتر علمی کام اسلامیات سے متعلق ہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

احتشام حسین (1912-1972) : سیّد احتشام حسین رضوی کی پیدائش اعظم گڑھ کے ایک قصبے ماہُل میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں اور اعلیٰ تعلیم الہ آباد میں حاصل کی۔ احتشام حسین ایک بلند پایہ ترقی پسند

نقاد تھے۔ ان کے تنقیدی نظریات میں مارکسزم اور سماجی تناظر کو مرکزیت حاصل ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ فن پارے کی تخلیق جس ماحول میں ہوئی ہے اس کا تجزیہ بھی اسی ماحول کے تناظر میں ہونا چاہیے۔ وہ ادب میں انفرادیت پر اجتماعی شعور کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادیب و شاعر کا کام یہ نہیں کہ جو کچھ دیکھے، اسے جوں کا توں پیش کر دے بلکہ جو کچھ دیکھا اُسے کیسا ہونا چاہیے تھا، اس کی وضاحت کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ 'تنقیدی جائزے'، 'روایت و بغاوت'، 'ادب اور سماج'، 'افکار و مسائل'، 'تنقید اور عملی تنقید'، 'ذوقِ ادب اور شعور'، 'عکس اور آئینے' اور 'اعتبارِ نظر' ان کے تنقیدی مجموعے ہیں۔ احتشام حسین نے ترقی پسند تنقید کو وقار عطا کیا۔ ان کی تنقید کو سائنٹفک تنقید کا نام بھی دیا گیا ہے۔

'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' اُن کی ایک اہم کتاب ہے۔ 'اردو کی کہانی' کے عنوان سے انھوں نے اردو زبان و ادب کی آسان تاریخ مرتّب کی ہے۔ احتشام حسین کا سفرنامہ 'ساحل اور سمندر' اور شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے تراجم میں لسانیات کی کتاب 'اردو لسانیات کا خاکہ' بھی شامل ہے۔

اختر حسین رائے پوری (1912-1992): اختر حسین رائے پور، چھتیس گڑھ، میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کے سلسلے میں کولکاتا، علی گڑھ اور دہلی میں بھی رہے۔ بعد میں ریاست حیدرآباد نے انھیں ایک گراں قدر وظیفے سے نوازا۔ انھوں نے پیرس سے ڈی۔ لٹ کی سند حاصل کی۔ واپس آ کر آل انڈیا ریڈیو اور پھر محکمۂ تعلیمات میں بہ حیثیت سکریٹری کام کیا۔ تقسیمِ وطن کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ انھوں نے اپنا کچھ وقت مہاتما گاندھی اور رابندرناتھ ٹیگور کے ساتھ بھی گزارا تھا۔ انگریزی، اردو لغت کی تالیف میں انھوں نے مولوی عبدالحق کی بڑی مدد کی۔

اختر حسین کے تنقیدی نظریات پر مارکسزم کا گہرا اثر ہے۔ وہ ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ اختر حسین کے نزدیک ادب انسانی جذبات کو متاثر کرنے کا وسیلہ ہے۔ ان کے خیال میں ادب سامانِ تفریح نہیں بلکہ سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ 'ادب اور زندگی' ان کا اوّلین مضمون ہے جو رسالہ 'اردو' میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ان کی اسی فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'ادب اور انقلاب' سے ان کے اشتراکی نظریات اور ترقی پسند تحریک کے ادبی میلانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی خودنوشت سوانح 'زادِ راہ' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

ممتاز حسین (1918-1992) : ممتاز حسین غازی پور میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ وطن کے بعد وہ کراچی منتقل ہو گئے۔ ممتاز حسین کے ادبی سفر کا آغاز ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہوا۔ اُس عہد میں جب کہ روایت شکنی کے نام پر ماضی کی ہر اعلیٰ اور مثبت قدر کو شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا، ممتاز حسین نے کلاسیکی یا ماضی کے ادب کو ازسرِ نو سمجھنے پر

زور دیا۔ ’رسالہ درمعرفتِ استعارہ‘ اور ’ماضی کے ادب العالیہ سے متعلق‘ جیسے مضامین میں انھوں نے اسی تصور کے تحت فکروفن کا جائزہ لیا ہے۔

ممتاز حسین کا شمار ان ناقدین میں ہوتا ہے جن کی ذہن سازی میں مارکسی فکر نے خصوصی حصّہ لیا تھا لیکن ان کا مطالعہ محض مارکسی فلسفے تک محدود نہیں تھا۔ مارکسی فلسفہ وفکر کے علاوہ مغربی کلاسیکی اقدارِفن سے بھی انھوں نے اپنے طرزِ استدلال کو استحکام بخشا۔ اسی کے پہلو بہ پہلو مشرقی اقدارِفن کا درجہ بھی ان کے نزدیک بہت بلند تھا۔ خسرو اور غالب پر لکھے ہوئے ان کے مضامین اور کتابوں میں بھی مطالعے کی یہی صورت نمایاں ہے۔ ’نقدِ حیات‘ اور ’ادب وشعور‘ ان کے معروف تنقیدی مجموعے ہیں۔

محمد حسن (2010-1925/26): محمد حسن مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے مرادآباد میں اوراعلیٰ تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ لکھنؤ، علی گڑھ، دہلی اور کشمیر میں اردو کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1990 میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے پروفیسر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ محمد حسن کو ہندوستانی حکومت نے جواہر لعل نہرو فیلوشپ دی تھی جس کے دوران انھوں نے کئی بیرونی ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ اس فیلوشپ کے تحت انھوں نے ’انیسویں صدی میں شمالی ہند کے ادب کے فکری اسالیب‘ کے موضوع پر کام کیا جو انگریزی میں ’Thought Patterns of 19th Century of North India‘ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

محمد حسن مارکسی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ شاعر اور ڈراما نگار بھی تھے۔ انھوں نے ’غمِ دل، وحشتِ دل‘ نام سے ایک ناول بھی لکھا۔ ان کا تنقیدی مزاج مغرب ومشرق دونوں کے امتزاج سے مرتب ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے طرزِ تنقید میں توازن پایا جاتا ہے۔ وہ ہر اس تنقیدی زاویے کو مثبت تصور کرتے ہیں جو ادب فہمی کا شعور پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو۔ وہ ادب میں جمالیاتی اقدار اور صحت مند افکار وتصورات کی کارفرمائی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں ادب پارے کی تفہیم اقتصادیات، نفسیات، جمالیات، عمرانیات اور عصری تاریخ وتہذیب کے تناظر کے بغیر ممکن نہیں۔

’اردو ادب میں رومانوی تحریک‘، ’عرضِ ہنر‘، ’معاصر ادب کے پیش رو‘، ’دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر‘، ’مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ‘، ’ہندی ادب کی تاریخ‘، ’ادبی سماجیات‘ وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں۔ انھوں نے ’عصری ادب‘ کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔

قمر رئیس (2009-1932) : ان کا اصل نام مصاحب علی خاں تھا۔ وہ شاہجہان پور میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں انھوں نے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ قمر رئیس نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا۔ اس کے بعد وہ تنقید کی

طرف مائل ہوئے۔ان کا تحقیقی مقالہ ’پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ‘ تھا جس پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے انھیں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی، اردو میں پریم چند شناسی کے لحاظ سے پہلی مبسوط تصنیف ہے۔ پریم چند شناسی کے فروغ میں قمر رئیس کی کوششوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

قمر رئیس ترقی پسند نقاد ہیں۔انھوں نے نظریاتی تنقید پر عملی تنقید کو ترجیح دی۔افسانوی ادب ان کے مطالعے کا خاص میدان تھا۔ان کے پہلے تنقیدی مضامین کے مجموعے کا نام ’تلاش وتوازن‘ ہے۔’تنقیدی تناظر‘، ’تعبیر وتحلیل‘ اور ’بیسویں صدی میں اردو افسانہ‘ ان کے تنقیدی مضامین کے دوسرے مجموعے ہیں۔

ترقی پسند دور کے دوسرے نمائندہ تنقید نگار

ترقی پسندی کے اس دور میں بعض ایسے نقاد بھی تھے جو پہلے ہی سے معروف ہو چکے تھے اور اپنی سمت کا تعین کر چکے تھے۔بعض ایسے تنقید نگاروں کے ادبی سفر کا آغاز تقسیمِ وطن کے آس پاس ہوا جنھوں نے کسی خاص نظریے کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھا۔

کلیم الدین احمد (1983-1908/09): کلیم الدین احمد، پٹنہ، بہار میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ انھوں نے سٹی ہائی اسکول سے میٹرک اور پٹنہ کالج سے ایم۔اے کی سند حاصل کی۔ وہ مزید تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔وہاں سے واپس آ کر پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہو گئے۔ بعد میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کے عہدے پر مامور ہوئے۔وہ بھاگلپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

’اردو شاعری پر ایک نظر‘ اور ’اردو تنقید پر ایک نظر‘، ’فن داستان گوئی‘ اور ’سخن ہائے گفتنی‘ کلیم الدین احمد کی اہم کتابیں ہیں۔ ان کی خودنوشت کا نام ’اپنی تلاش میں‘ ہے۔وہ مغربی ادب کے تصورات سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے روایتی تنقید سے نہ صرف یہ کہ انحراف کیا بلکہ وہ اپنے نظریات میں بھی سخت واقع ہوئے تھے۔ادب میں وہ سماجی اور معاشی سروکاروں کے قائل نہیں تھے۔انھوں نے تاثراتی تنقید کے برخلاف اردو میں سائنٹی فک تنقید کی زبردست تائید کی۔

آلِ احمد سرورؔ (2002-1911): سرورؔ بدایوں میں پیدا ہوئے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی اور اردو میں ایم۔اے۔کرنے کے بعد وہ وہیں لکچرر ہو گئے۔ پھر رضا کالج کے پرنسپل ہو کر رام پور گئے۔ یہاں سے لکھنؤ یونیورسٹی چلے گئے اور وہیں مقیم رہے۔

'تنقیدی اشارے' ان کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے تنقیدی نظریات کو واضح کیا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کی نثر شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ سرورؔ کا تنقیدی شعور بڑا پختہ تھا۔ متقدمین اور پیش رو ادبا و شعرا کی تخلیقات پر ان کے تنقیدی مضامین بڑے معیاری ہیں۔ انھوں نے اپنے بعض مضامین میں ادب اور پروپیگنڈا، ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی، ادب کا مقصد کیا ہے؟ وغیرہ مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ 'نئے پرانے چراغ'، 'تنقید کیا ہے'، ادب اور نظریہ'، 'نظر اور نظریے' اور 'مسرت سے بصیرت تک' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ان کی خودنوشت کا نام 'خواب باقی ہیں' ہے۔ آلِ احمد سرور کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'اقبال سمّان' اور 'غالب ایوارڈ' کے علاوہ دیگر انعامات و اعزازات بھی دیے گئے۔

خورشیدالاسلام (1919-2006/07) : خورشیدالاسلام بجنور کے ایک گاؤں 'امری' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے دہلی کے فتح پوری اسکول میں حاصل کی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم۔اے۔ کیا۔ بعد میں اسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے اور ترقی کر کے پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کے منصب پر فائز ہوئے۔ علی گڑھ کی ملازمت کے دوران ہی چند برس 'لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز' سے بھی بہ حیثیت استاد وابستہ رہے۔ ان کی وفات علی گڑھ میں ہوئی۔

خورشیدالاسلام صاحبِ طرز نثر نگار اور خوش فکر شاعر تھے۔ ان کے چار شعری مجموعے 'رگِ جاں'، 'شاخِ نہالِ غم'، 'جستہ جستہ' اور 'می رقصم' (نثری نظمیں) شائع ہو چکے ہیں۔

نثری تصانیف میں 'غالب۔ ابتدائی کلام' اور مضامین کا مجموعہ 'تنقیدیں' اہم ہیں۔ رالف رسل کے ساتھ مل کر انگریزی میں ان کی دو کتابیں 'تھری مغل پوئٹس' اور 'غالب: لائف اینڈ لیٹرس' شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے قائم اور سوداؔ کے انتخابات بھی مرتّب کیے ہیں۔ خورشیدالاسلام بہت شگفتہ اور تخلیقی نثر لکھتے تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین میں بھی شگفتگی پائی جاتی ہے۔

حسن عسکری (1919-1978) : محمد حسن عسکری سراوہ، ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے الہ آباد چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کیا۔

عسکری کی تصانیف میں ان کے افسانوں کے دو مجموعے 'جزیرے' اور 'قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'، معروف ہیں۔ 'ستارہ یا بادبان'، 'آدمی اور انسان'، 'وقت کی راگنی'، 'تخلیقی عمل اور اسلوب' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ 'جھلکیاں' ان کے کالموں کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک معروف مترجم بھی تھے۔

انگریزی اور فرانسیسی ادب پر عسکری کی گہری نگاہ تھی۔ ان کی زبان سلیس و سادہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بات کرنے کا وہ اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ ادب پاروں کا تہذیبی نقطۂ نظر سے بھی تجزیہ کرتے ہیں۔ اپنی عمر کے آخری حصّے میں انھوں نے اسلامی مفکروں کے تنقیدی نظریات کی طرف خاص توجہ کی اور انھیں کی روشنی میں ادب کو سمجھنے کی ترغیب دی۔

ممتاز شیریں (1973-1924): ممتاز شیریں میسور کی رہنے والی تھیں۔ تقسیم وطن سے قبل بنگلور ہی سے سہ ماہی رسالہ 'سوغات' ان کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد یہ رسالہ کراچی سے نکلنے لگا۔ 'سوغات' نے نئی نسل کی ذہن سازی کی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جدیدیت سے قبل جدیدیت کے بعض تصورات کی طرف میراجی اور سوغات ہی نے متوجہ کیا تھا۔ ممتاز شیریں بنیادی طور پر افسانہ نگار تھیں۔ افسانے کے فن پر ان کی نگاہ گہری تھی اور سلسلے میں انھوں نے کئی تجربے کیے تھے۔ منٹو شناسی کے بنیاد سازوں میں ان کا اہم درجہ ہے۔ منٹو پر لکھی ہوئی ان کی تحریریں منٹو کے فکر وفن پر لکھنے والوں کے لیے آج بھی مشعل راہ ہیں۔ 'منٹو؛ نوری نہ ناری' کے علاوہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'معیار' افسانے کی تنقید کے تعلق سے ایک انقلاب آفریں تصنیف ہے۔

ان کا مضمون ''تکنیک کا تنوع'' افسانے کی تنقید میں، ایک مستقل حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'اپنی نگریا' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔

حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام 16/اکتوبر 1939 کو لاہور میں عمل میں آیا۔ حلقے کے بنیاد گزاروں میں حفیظ ہوشیار پوری، شیر محمد اختر اور تابش صدیقی کے نام خاص ہیں۔ بعد میں میرا جی اور ن م. راشد بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ میرا جی نے 'حلقۂ اربابِ ذوق' کے اغراض و مقاصد طے کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اسی بنا پر وہ حلقے کا دماغ کہلاتے ہیں۔ ان ادیبوں کا اصرار تھا کہ ادب کی زبان علامتی ہونی چاہیے۔ انسان کی داخلی زندگی کے اظہار کو انھوں نے زیادہ اہمیت دی، جس کے باعث ان کی تخلیقات میں ابہام بھی پیدا ہوا۔ میرا جی اور راشد نے آزاد نظم کی ہئیت کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس حلقے کو ایک تحریک کی شکل دینے میں قیوم نظر، مختار صدیقی، یوسف ظفر اور ضیا جالندھری کے نام بھی اہم خیال کیے جاتے ہیں۔

ن م. راشد (1910-1975): ان کا نام نذر محمد راشد تھا۔ ادبی دنیا میں انھیں ن۔م۔راشد کے نام سے شہرت ملی۔ ان کی پیدائش پاکستان کے ضلع گوجراں والا میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گوجراں والا میں اور اعلیٰ تعلیم لائل پور اور لاہور میں حاصل کی۔ وہ کئی رسالوں کے مدیر رہے۔ انھیں ترجمہ نگاری سے خاص شغف تھا۔ کچھ عرصے فوج میں بھی ملازمت کی۔ اس سلسلے میں ان کا قیام ایران اور بعض دوسرے ممالک میں رہا۔ آخری دنوں میں اقوامِ متحدہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کی وفات برطانیہ میں ہوئی۔

ن م. راشد نے نظم کی ہیئت میں کئی تجربے کیے اور آزاد نظم کو فروغ دیا۔ وہ اپنی شاعری میں ایک دانشور کے طور پر نمایاں ہوئے۔ ان کی نظموں میں تہ داری پائی جاتی ہے۔ 'ماورا'، 'ایران میں اجنبی'، 'لا = انسان' اور 'گمان کا ممکن' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'سبا ویراں'، 'انتقام' اور 'زندگی سے ڈرتے ہو' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

ن م. راشد نے اپنی نظموں میں ایرانی تلمیحات کے علاوہ ہندوستانی اساطیر سے بھی کام لیا ہے۔ انھوں نے علامتی زبان میں سامراجی طاقتوں کی استحصالی سازشوں کو بے نقاب کیا ہے۔

میراجی (1912-1949): میراجی کا نام محمد ثناءاللہ ڈار تھا۔ ان کی پیدائش لاہور میں ہوئی۔ وہ کسی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکے لیکن مطالعے کا شوق انھیں دیوانگی کی حد تک تھا۔ آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے وابستہ رہے۔ پہلے 'کتاب پریشاں' اور پھر 'باتیں' کے عنوان سے ماہنامہ 'ساقی' (دہلی) میں کالم لکھتے رہے۔ میراجی نئی شاعری کے بانی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ وہ فرائڈ کے نظریات اور قدیم ہندو فلسفے سے بھی متاثر تھے۔ انھوں نے جنسی، نفسیاتی اور تہذیبی مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا پورا تخلیقی سفر تلاشِ ذات کا سفر تھا۔

'میراجی کے گیت'، 'میراجی کی نظمیں'، 'گیت ہی گیت'، 'پابند نظمیں' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'تین رنگ'، 'اس نظم میں' اور 'مشرق و مغرب کے نغمے' میں انھوں نے ملک و بیرون ملک کے کئی شعرا کی نظموں کے ترجمے اور تجزیے کیے ہیں۔ 'اجنتا کے غار'، 'یاتری'، 'عدم کا خلا'، 'تنہائی'، 'کلرک کا نغمۂ محبت'، 'دھوبی کا گھاٹ'، 'اونچا مکان' اور 'پاس کی دوری' جیسی نظموں کو بڑی شہرت ملی۔ انھوں نے کچھ فلموں کے اسکرپٹ بھی لکھے تھے۔ میراجی کی وفات ممبئی میں ہوئی۔

قیوم نظر (1914-1989): قیوم نظر لاہور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ بعد میں وہ نظموں کی جانب مائل ہوئے۔ وہ تجربہ پسند شاعر تھے۔ ان کے شعری مجموعوں میں 'قندیل'، 'سویرا'، اور 'پون جھکولے' کو شہرت ملی۔ ان کا کلیات 'قلب و نظر کے سلسلے' کے نام سے شائع ہوا۔ نظموں میں 'اندھی'، 'اپنی کہانی'، 'کل رات' اور 'مآل' نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں۔

قیوم نظر کی نظموں میں دُھند اور مایوسی کی کیفیت نمایاں ہے۔ تہذیبی تنزل ان کی نظموں کا خاص موضوع ہے۔ انھوں نے قُرطُبہ کی تاریخی و تہذیبی حیثیت کو بھی اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ انھوں نے کثیر تعداد میں نعتیں بھی کہی ہیں۔

مختار صدیقی (1917-1972): ان کا نام مختار الحق تھا۔ ان کی پیدائش گوجراں والا، پاکستان میں ہوئی۔ وہ ایک درویش مزاج شاعر تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں میراجی کا خاص رنگ نمایاں ہے۔ لیکن انھوں نے جلد ہی اس اثر سے نکلنے کی کوشش کی اور آزادی کے بعد ان کی شاعری نئے فکری و فنّی رویوں سے آشنا ہوئی۔ مختار صدیقی نے کئی ہیئتی تجربے بھی کیے۔

ان کی نظم 'آخری بات' کا موضوع جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی حملہ اور وہاں کی تباہی ہے۔ انھیں فنِ موسیقی پر مہارت حاصل تھی۔ جس کے اثرات ان کی نظموں میں بھی نمایاں ہیں۔ 'رسوائی'، 'موہن جوداڑو'، 'ٹھٹھ'، 'زوال' اور 'آزمائش' ان کی مقبول نظمیں ہیں ان کا مجموعۂ کلام 'منزلِ شب' کے نام سے شائع ہوا۔

ضیا جالندھری (2012-1923): ان کا نام سید نثار احمد تھا۔ان کی پیدائش جالندھر میں ہوئی۔انھوں نے طویل نظموں کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ ان کی نظموں میں وقت کا ایک منفرد تصور ملتا ہے۔ضیا جالندھری کا طرزِ اظہار تمثیلی ہے۔'خود فریب'، 'ابوالہول'، 'ویرانے'، 'موج ریگ'، 'ایک مجسمہ'، 'زوال' اور 'زمستاں کی شام' نظمیں اس کی مثال ہیں۔ انھیں ماضی کی تہذیبی میراث کھو جانے کا غم ہے۔انھوں نے گیتوں میں رادھے،شیام، درو پدی، راون، رام اور پانڈو کے وسیلے سے ہندوستانی دیو مالائی ماحول و معاشرے کی خوب صورت عکاسی کی ہے۔اسلامی تاریخ و روایات کو بھی انھوں نے موضوع بنایا ہے۔'ہابیل' اسی قسم کی نظم ہے۔ان کا کلیات 'سرِ شام سے پسِ حرف تک' شائع ہو چکا ہے۔جس میں ان کے چاروں مجموعۂ کلام 'سرِ شام'، 'نارسا'، 'خواب سراب' اور 'پس حرف' شامل ہیں۔

حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ دیگر شعرا میں یوسف ظفر اور اعجاز بٹالوی وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں۔

باب 14

جدیدیت کا دور

اردو میں ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد شعروادب کے میدان میں ایک نئے رجحان کی ابتدا ہوئی۔ اسے جدیدیت کے رجحان سے موسوم کیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس نے اس قدر وسعت پائی کہ لکھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ بن گیا۔ یہ رجحان مغرب میں اس وقت شروع ہوا جب انیسویں صدی کے اواخر میں صنعتی انقلاب کے اثرات تیزی سے پھیلنے لگے تھے اور بعد میں اس کے منفی نتائج سامنے آئے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے نظامِ زندگی کو درہم برہم کر دیا تھا۔ نتیجے کے طور پر تخلیق کار خارج کے بجائے اپنی ذات کے اندرون کی دنیاؤں میں پناہ لینے لگے۔

اردو میں جدیدیت کے رجحان کا آغاز 1950 کے آس پاس ہوا۔ اس رجحان سے وابستہ ادیبوں نے ان باتوں پر خاص طور سے زور دیا کہ تخلیقی فن کار تخلیق کے عمل میں آزاد ہوتے ہیں اس لیے ہم ان سے یہ تقاضا نہیں کر سکتے کہ وہ لازماً اپنے ادب سے سماجی اصلاح کا کام لیں۔ جدیدیت کے رجحان کے تحت اس بات پر بھی اصرار کیا گیا کہ فنی اصولوں اور تقاضوں کو مُقدّم رکھنا ادیب و شاعر کا پہلا فرض ہے۔ چنانچہ جدیدیت سے وابستہ ادیبوں نے شعروادب کی تخلیق میں زبان و بیان کی سطح پر نہ صرف استعاراتی اور علامتی طرزِ اظہار کو فروغ دیا بلکہ ادب کی تخلیق کے دوران تازگی اور نیا پن پیدا کرنے کی غرض سے مختلف النوع تجربات بھی کیے۔ اس طرح ادب میں تجربہ پسندی کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔

جدیدیت سے وابستہ ادیبوں نے نظریاتی وابستگی سے خود کو الگ رکھا اور صرف ادبی اصول اور معیاروں کو ترجیح دی۔ انھوں نے نئے زمانے کے عام فکری رجحان کے زیرِ اثر انسان کے انفرادی تجربات اور داخلی دنیا کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ اس طرح جدیدیت میں خارجی دنیا کی سچائیوں سے زیادہ انسان کی باطنی دنیا کے پیچیدہ تجربوں کو بیان کرنے کو اوّلیت دی جانے لگی۔ یہ صورت حال عام طور سے جدیدیت کے فروغ کے زمانے میں اردو شاعری اور فکشن دونوں میں نظر آتی ہے۔

نمائندہ شعرا

ناصؔر کاظمی (1925-1972/74) : ان کا نام ناصر رضا کاظمی تھا۔ وہ انبالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ناصؔر کاظمی جدید غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ اُن کی غزلیں اپنے دھیمے لہجے، دبے دبے دَرد اور جدید طرزِ احساس کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ انھوں نے اکثر ایسے الفاظ استعمال کیے جو غزلیہ شاعری میں عام نہیں تھے۔ ناصؔر کاظمی کے کلام میں بے حد تازگی ہے۔ ان کی غزلیں ان کے عہد کی عام اداسی کی ترجمان ہیں۔

ان کے مجموعۂ کلام 'برگِ نَے'، 'دیوان' اور 'پہلی بارش' ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ 'نشاطِ خواب' ہے۔ ان کی دو نثری کتابیں بھی ہیں، ایک 'ناصر کاظمی کی ڈائری' اور دوسرا ان کے مضامین کا مجموعہ 'خشک چشمے کے کنارے'۔ وہ 'اوراقِ نو' اور 'ہمایوں' کے مدیر بھی رہے۔

شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی	ترے خیال سے لَو دے اُٹھی ہے تنہائی
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں	کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں
اداسی بال کھولے سو رہی ہے	ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر

زیب غوری (1926-1985): ان کا نام خان احمد حسین خان غوری تھا۔ زیب غوری کا شمار جدیدیت کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ کانپور (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ بنیادی طور پر غزل گو ہیں۔ ان کے کلام میں فکر و احساس کی تازگی کے علاوہ زبان و بیان کی سطح پر بھی نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ 'زردزرخیز' اور 'چاک' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔

زندانِ آب و گِل سے چھڑا لے گئی مجھے	میں عکسِ آرزو تھا ہوا لے گئی مجھے
شاخ پر کھلنا، فضاؤں میں مہکنا اپنا	نہ کسی سے کوئی مطلب نہ تقاضا اپنا
میں ہی کھڑا ہوا ہوں سمندر کے پار بھی	ایسا لگا ہے جیسے خموشی میں شام کی

خلیل الرحمٰن اعظمی (1927-1978) : خلیل الرحمٰن اعظمی سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کی ڈِگریاں حاصل کیں۔ پھر وہیں شعبۂ اردو سے وابستہ ہوگئے۔ طویل بیماری کے بعد علی گڑھ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

خلیلؔ الرحمٰن اعظمی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ ان کی نثری تصانیف میں 'اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'، 'مضامینِ نو' اور 'فکر و فن' شامل ہیں۔ 'نوائے ظفر'، 'مقدمہ کلامِ آتش' اور 'نئی نظم کا سفر' مع مقدمہ ان کی مرتّب کی ہوئی کتابیں ہیں۔

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے — مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے
گھر میں بیٹھے سوچا کرتے، ہم سے بڑھ کر کون دکھی ہے — اک دن گھر کی چھت پر چڑھے تو دیکھا گھر گھر آگ لگی ہے
نشۂ مئے کے سوا کتنے نشے اور بھی ہیں — کچھ بہانے مرے جینے کے لیے اور بھی ہیں

قاضی سلیم (1927-2005): قاجی سلیم کی پیدائش اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں ہوئی۔ وہ اصلاً نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں پیچیدہ اور گہرے تجربوں کو زیادہ تر بالواسطہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ قاضی سلیم کا شمار جدیدیت کے نمائندہ نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔

باقر مہدی (1927-2007): باقر مہدی لکھنؤ کے قریب ایک قصبے ردولی کے رہنے والے تھے۔ تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی میں حاصل کی۔ زندگی کا بڑا حصہ ممبئی میں گزارا۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ سیاہ سیاہ (کلیات شاعری) آگہی و بے باکی' اور 'تنقیدی کشمکش' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ باقر مہدی کا شمار جدیدیت سے وابستہ ان شعرا میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری میں نئے نئے تجربوں کو زیادہ راہ دی۔ باقر مہدی نے نظمیں اور غزلیں دونوں میں طبع آزمائی کی۔ زندگی کا بڑا حصہ ممبئی میں گزارا۔

آندھی کو اپنی شاخ میں روکے کھڑے رہے — یوں احتجاج کچھ نئے اشجار کر گئے
اگر یہ آس تڑپتی نہ میری رگ رگ میں — خلش کا نام کوئی انتظار کیوں رکھتا

محمد علوی (1927-2018): محمد علوی کا تعلق گجرات کے شہر احمد آباد سے ہے۔ جدیدیت سے وابستہ جن شاعروں کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ان میں محمد علوی کا نام بہت اہم ہے۔ انھوں نے غزل اور نظم دونوں کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ 'خالی مکان'، 'آخری دن کی تلاش'، 'تیسری کتاب' ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ ان کا کلیات 'رات ادھر ادھر روشن' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

زمین لوگوں سے ڈر گئی ہے — سمندروں میں اُتر گئی ہے
اس سے بچھڑتے وقت میں رویا تھا خوب سا — یہ بات یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا
گھروں میں اداسی ہے، رستوں پہ دھول — درختوں کی شاخوں پہ پتے نہ پھول

عمیق حنفی (1928/29-1985/88): ان کا نام عبدالعزیز تھا۔ وہ مہو چھاؤنی، ضلع اندور کے رہنے والے تھے۔انھوں نے تعلیم اندور میں حاصل کی۔تاریخ اور فلسفہ سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔اصلاً نظم نگار ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں کو انسانی وجود کے کرب کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ انھوں نے کچھ طویل نظمیں بھی لکھیں جو بہت مشہور ہوئیں۔ اردو میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'سنگ پیراہن' کے نام سے شائع ہوا۔انھیں شہرت اپنی طویل نظم 'سندباد' کی اشاعت سے ملی۔دوسری طویل نظموں میں 'شب گشت'، 'سیارگاں'، 'کیوپڈیا'، 'شہرزاد' وغیرہ ہیں۔'صلصلۃ الجرس' ایک طویل نعتیہ نظم ہے۔ 'شعلے کی شناخت' اور 'شعر چیزے دیگر است' ان کی تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔

جاتا نہیں کناروں سے آگے کسی کا دھیان	کب سے پکارتا ہوں یہاں ہوں یہاں ہوں میں
پھول کھلے ہیں، لکھا ہوا ہے توڑو مت	اور مچل کر جی کہتا ہے چھوڑو مت
بہار پھول کھلاتی پھرے چمن میں تو کیا	کسی کے بندِ قبا ٹوٹنے لگیں تب ہے

مظہر امام (1928-2012) : مظہر امام کی پیدائش مونگیر، بہار میں ہوئی۔انھوں نے مگدھ یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ایم۔اے کی ڈگریاں لیں۔ مظہر امام نے غزل کے میدان میں نئے نئے تجربات کیے۔ انھوں نے آزاد غزل کا تجربہ کیا۔نثر میں بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔'زخمِ تمنّا'، 'رشتہ گونگے سفر کا'، 'پچھلے موسم کا پھول' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ان کے مضامین اور خاکوں کا مجموعہ بھی کتابی صورت میں شائع ہوا۔انھیں 'ساہتیہ اکادمی' اور مختلف اردو اکادمیوں نے انعامات سے سرفراز کیا۔

عہدِ نو مجھ کو نگاہوں میں بسا لو کہ میں	ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں
دوستوں سے ملاقات کی شام ہے	یہ سزا کاٹ کر اپنے گھر جاؤں گا

بلراج کومل (1928-2013): بلراج کومل کی پیدائش سیالکوٹ (پاکستان) میں ہوئی۔جدیدیت کے نمائندہ شعرا میں بلراج کومل کا نام بہت نمایاں ہے۔انھوں نے زیادہ تر نظموں ہی کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ان کی نظمیں گہرے انسانی تجربے کی عکاسی کرتی ہیں۔انھوں نے افسانے اور تنقید بھی لکھی ہے ۔شعری مجموعوں میں 'میری نظمیں'، 'سفر مدام سفر'، 'پرندوں بھرا آسمان' معروف ہیں۔ ادب کی تلاش ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔

شفیق فاطمہ شعریٰ (1930-2012): شفیق فاطمہ شعریٰ کی پیدائش ناگپور میں ہوئی۔ انھوں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔بی۔اے۔کا امتحان عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد اور ایم۔اے کا امتحان ناگپور یونیورسٹی سے پاس کیا۔شعریٰ ممتاز کالج حیدرآباد میں اردو کی درس و تدریس سے وابستہ رہیں اور یہیں سے سبکدوش ہوئیں۔

شعریٰ بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں۔ ان کے کلام میں پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ اکثر نظموں میں شِعریٰ نے اسلامی تاریخ اور قرآنی واقعات سے بھی مدد لی ہے۔ انھوں نے موجودہ زمانے کے تہذیبی اور سیاسی مسائل کو جس انداز سے نظموں کا موضوع بنایا ہے، اس سے بھی ان کا منفرد اسلوب نمایاں ہوتا ہے۔ 'یادنگر' ان کی مشہور نظم ہے۔ 'آفاقِ نوا' اور 'گلۂ صفورہ' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'سلسلۂ مکالمات' ان کا کلیات ہے۔

بانؔی (1932-1981) : ان کا نام راجندر منچندہ تھا۔ وہ ملتان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم انھوں نے آزادی سے پہلے ملتان ہی میں حاصل کی۔ تقسیمِ وطن کے بعد دہلی منتقل ہوگئے اور یہیں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ دہلی ہی میں انتقال ہوا۔

بانؔی کا تعلق اردو شاعروں کی اُس نسل سے ہے، جس نے ناصؔر کاظمی کے بعد غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ ان کی زبان اور بیان میں بہت تازگی ہے۔ بعد کے کئی شعرا پر بانؔی کا گہرا اثر ہے۔

زماں مکاں تھے مرے سامنے بکھرتے ہوئے — میں ڈھیر ہوگیا طولِ سفر سے ڈرتے ہوئے

بس ایک زخم تھا دل میں جگہ بناتا ہوا — ہزار غم تھے مگر بھولتے بِسرتے ہوئے

اے صفِ ابرِ رواں، تیرے بعد — ایک گھنا سایہ شجر سے نکلا

احمد مشتاق (پ-1933): احمد مشتاق امرتسر میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں بسر کیا۔ پھر امریکہ میں مقیم ہوگئے۔ جدیدیت کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انھوں نے صرف غزل کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ احمد مشتاق کی غزلوں کی بنیادی صفت کلاسیکی اور جدید طرز کا امتزاج ہے۔ ان کی غزلوں میں نئے انسان کی حسّیت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی سطح پر خوشگوار تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے دو مجموعے 'مجموعہ' اور 'گردِ مہتاب' کے علاوہ کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے — ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے — اور اب کوئی کہیں، کوئی کہیں رہتا ہے

غیر دلچسپ تھا یقین کا کھیل — سب کرشمے گمان کے دیکھے

ظفر اقبال (پ-1933): ظفر اقبال اوکاڑا، مغربی پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ لیکن انھوں نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ غزل کے میدان میں ظفر اقبال نے جدیدیت کے رجحان کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ وہ پُرگو اور قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ 'آبِ رواں'، 'گلافتاب' اور 'رطب و یابس' ان کے شعری مجموعے ہیں۔

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح — اور اس دشت میں رہ جائے گی جھنکار مری

پوچھ آؤ کہ میں ویسا ہی کھڑا سوکھتا ہوں — دیر کتنی ہے مجھے برگ و نوا دینے میں

کمار پاشی (1935-1992) : ان کا نام شنکردت کمار تھا۔ان کی پیدائش بہاولپور میں ہوئی۔تقسیم کے بعد دہلی منتقل ہو گئے۔یہیں ملازمت کی اور یہیں انتقال ہوا۔اپنی وضع کے بہت منفرد شاعر تھے۔غزل اور نظم دونوں اصناف پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ان کے شعری مجموعوں 'پرانے موسموں کی آواز' اور 'خواب تماشا' کو غیر معمولی شہرت ملی۔ 'ولاس یاترا' ان کی طویل نظم ہے۔

کمار پاشی نے ڈرامے، افسانے اور مضامین بھی لکھے ہیں 'سطور' کے نام سے انھوں نے ایک رسالہ بھی نکالا تھا۔

آیا بسنت پھول بھی شعلوں میں ڈھل گئے	میں نے انھیں چھوا تو مرے ہونٹ جل گئے
نہ پوچھ مجھ سے میرا قصّہٗ زوالِ جنوں	میں پانیوں پہ برستا رہا گھٹا کی طرح

شمس الرحمٰن فاروقی (پ- 1935): شمس الرحمٰن فاروقی کا اصل وطن اعظم گڑھ ہے لیکن ان کی پیدائش پرتاپ گڑھ (یوپی) میں ہوئی۔ان کا شمار جدیدیت سے تعلق رکھنے والے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے غزل اور نظم کے علاوہ رباعی کے میدان میں بھی اپنی انفرادیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ان کے کلام کی بنیادی صفت پیچیدہ تخلیقی تجربے کے ساتھ ساتھ استعاراتی اور علامتی طرز بیان ہے۔ان کے اب تک چار مجموعۂ کلام 'گنج سوختہ'، 'سبز اندر سبز'، 'چہار سمت کا دریا' (رباعی) اور 'آسماں محراب' شائع ہو چکے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے اشعار:

عدم میں کچھ نہ خبر تھی کہ کون ہوں کیا ہوں	کھُلی جو آنکھ تو پہلی نظر اُسی سے ملی
تو جا کر رہ گیا کس کی گلی میں اے دل اے دل	مجھے چھوڑا ہے کس کی دوستی میں اے دل اے دل
شہر شگوفہ شرار سے روشن، گلیاں خون کی پیاسی ہیں	اک میں اپنی شہ رگ سے کس کس کی آگ بجھاؤں گا

عادل منصوری (1936-2008): عادل منصوری احمد آباد (گجرات) کے رہنے والے تھے۔انھوں نے گجراتی اور اردو دونوں زبانوں کو تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔جدیدیت کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والے شعرا میں عادل منصوری کو مہم جو اور تازہ کار شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔وہ ایک تجربہ پسند شاعر تھے۔غزلوں اور نظموں دونوں میں انھوں نے ہمیشہ نئے مضامین پر توجہ دی ہے۔ان کے کلام میں پیچیدگی اور اِبہام کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ان کا کلیات 'حشر کی صبح درخشاں' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔وہ طویل عرصے تک امریکہ میں مقیم رہے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

دیکھا تھا سب نے ڈوبنے والے کو دور دور	پانی کی انگلیوں نے کنارے کو چھو لیا
دھول اڑتی ہے منزل جاں میں	راستے میں بکھر گیا ہوں میں
وہ کون تھا جو دن کے اجالے میں کھو گیا	یہ چاند کس کو ڈھونڈنے نکلا ہے شام سے

شہریار (1936-2012) : ان کا نام کنور اخلاق محمد خاں ہے۔ آنولہ، ضلع بریلی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔اے، پی ایچ ڈی کی تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے اور پروفیسر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ علی گڈھ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

شہریار موجودہ دور کے ایک ممتاز شاعر تھے۔ انھیں غزل اور نظم دونوں اصناف پر قدرت حاصل تھی۔ 'اسمِ اعظم'، 'ساتواں در'، 'ہجر کے موسم'، 'خواب کا در بند ہے' اور 'نیند کی کرچیں' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کا کلّیات 'حاصلِ سیرِ جہاں' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ انھیں بہت سے اعزازات ملے جن میں ادب کا سب سے بڑا اعزاز 'گیان پیٹھ ایوارڈ' بھی شامل ہے۔

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس، کہیں کچھ کم ہے

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا

یہ آگ ہوس کی ہے جھلس دے گی اُسے بھی
سورج سے کہو سایۂ دیوار میں آئے

اے شہر ترا نام و نشاں بھی نہیں ہوتا
جو حادثے ہونے تھے اگر ہو گئے ہوتے

مظفر حنفی (پ-1936): ان کا نام محمد ابوالمظفر ہے۔ وہ کھنڈوہ (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں پائی۔ انھوں نے سیفیہ کالج، بھوپال سے اردو میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ کچھ برس سرکاری ملازمت کی۔ پھر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد مقرر ہوئے۔ 1989 میں کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ وہیں سے سبکدوش ہوئے۔ شاعری کی طرف وہ بچپن ہی سے مائل تھے۔ بعد ازاں شاد عارفی کے شاگرد ہوئے۔ مظفر حنفی کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ متعدد شعری مجموعوں کے علاوہ کئی افسانوی اور تنقیدی مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غزل ان کا خاص میدان ہے۔ بڑی بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ گہری اور گمبھیر باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں طنز ایک حاوی رجحان کی حیثیت رکھتا ہے۔

مشورہ پاگل ہواؤں سے بھی لینا چاہیے
عقل مندو! ریت کی دیوار یوں اُٹھتی نہیں

دروازے پہ تحریر، یہاں کوئی نہیں ہے
اندر کوئی زنجیر ہلاتا ہے کہ میں ہوں

آ مرے سینے سے لگ جا تو اگر سیلاب ہے
اور خوشبو ہے تو جا بستی میں گھر گھر پھیل جا

زبیر رضوی (1936-2016) : زبیر رضوی امروہہ کے ایک ممتاز دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے حیدرآباد میں حاصل کی۔ بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحانات دہلی یونیورسٹی سے پاس کیے۔ 1993 میں آل

انڈیا ریڈیو سے ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ جن جدید شعرا نے نئی نسلوں کے لیے فضا سازی کی تھی اُن میں زبیر رضوی کا خاص مقام ہے۔ ان کے رسالے 'ذہن جدید' نے ذہن سازی اور رجحان سازی کا کام کیا ہے۔

زبیر اپنی طرز کے منفرد شاعر ہیں۔ نظم ہی نہیں غزل میں بھی ان کی ایک الگ پہچان ہے۔ 'لہرلہر ندیا گہری'، ''خشتِ دیوار'، 'انگلیاں فگار اپنی'، 'دھوپ کا سائبان'، 'دامن اور پرانی بات ہے' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

وہ ایک طفل جو مجھ میں تھا ہو گیا بوڑھا — جو منتظر تھیں مری وہ شرارتیں بھی گئیں
وہیں پہ برسا ہے بادل جہاں ہوا نے کہا — ہمارے صحن میں بارش برائے نام آئی
وہ جس کو دیکھنے کو بھیڑ اُمڈی تھی سرِ مقتل — اسی کی دید کو ہم بھی ستونِ دار تک آئے

پروین شاکر (1952-1994) : اُن کی پیدائش کراچی میں ہوئی۔ انھوں نے انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے بعد لسانیات اور بینک ایڈمنسٹریشن میں بھی ایم۔اے کیا۔ نو سال تک تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد پاکستان سول سروس جوائن کر کے کسٹم ڈپارٹمنٹ میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہیں۔ کراچی میں ایک سڑک حادثے میں ان کی وفات ہوئی۔

'خوشبو'، 'صد برگ'، 'خودکلامی' اور 'انکار' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'ماہِ تمام' کے نام سے اُن کا کلّیات بھی شائع ہو چکا ہے۔ 1990 میں انھیں پاکستان کے اعلیٰ ترین اعزاز 'نشانِ امتیاز' سے نوازا گیا۔ پروین شاکر کی شاعری نسائی احساسات، کیفیات اور جذبات کی عکّاسی کرتی ہے۔

میں سچ کہوں گی مگر، پھر بھی ہار جاؤں گی — وہ جھوٹ بولے گا، اور لاجواب کر دے گا
کُو بہ کُو پھیل گئی بات شناسائی کی — اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے — موجِ صبا کے ہاتھ میں اس کا سراغ ہے

اس دور کے دیگر اہم شعرا میں، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، مخمور سعیدی، رفعت سروش، بشر نواز، شاذ تمکنت، نذیر بنارسی، کلیم عاجز، محبوب راہی، ظفر کمالی، مدحت الاختر اور شجاع خاور وغیرہ شامل ہیں۔

نمائندہ فکشن نگار

اقبال متین (1924-2015) : ان کا نام سید مسیح الدین خاں ہے۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم چیتا پور میں ہوئی۔ چادر گھاٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد حیدرآباد کے جاگیر ایڈمنسٹریشن آفس میں انھوں نے ملازمت کر لی۔ اقبال متین کو افسانوی فضا سازی کے فن میں کمال حاصل ہے۔ کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کو وہ جس

طرح پیش کرتے ہیں اس میں نکتہ رسی پائی جاتی ہے۔ ان کے اسلوب میں افسانویت اور شعریت کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ 'چراغ تہہِ داماں' ان کا ناول ہے۔ 'نُچا ہوا البم'، 'خالی پٹاریوں کا مداری'، 'آ گہی کے ویرانے' اور 'شہر آشوب' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔

جوگندر پال (1925-2016) : جوگندر پال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1941 میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور مرے کالج سے انٹر میڈیٹ اور گریجویشن کی تعلیم حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی، چندی گڑھ سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ کینیا چلے گئے اور نیروبی میں پہلے ٹیچر بعد میں ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور اسی عہدے سے رضا کارانہ ریٹائرمنٹ لے لیا۔ 1964 میں وہ ہندوستان واپس آ گئے اور اورنگ آباد کے ایس۔بی۔کالج سے بہ طور انگریزی استاد وابستہ ہو گئے۔ 1976 سے دہلی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

جوگندر پال کا شمار آزادی کے بعد کے ممتاز فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اسلوب اور تکنیک کی سطح پر کئی تجربے کیے اور اردو افسانے کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ انھوں نے استعاروں اور علامتوں کے استعمال سے اپنے افسانے کی معنوی جہات میں تنوّع اور وسعت پیدا کی ہے۔ جوگندر پال نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی دیومالا اور اساطیر سے بھی کام لیا ہے۔

'میں کیوں سوچوں'، 'رسائی'، 'مٹی کے ادراک'، 'لیکن'، 'بے محاورہ'، 'بے ارادہ'، 'کھلا'، ''کھودو بابا کا مقبرہ' ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔ 'سلوٹیں' اور 'کتھانگر' ان کے افسانچوں کے مجموعے ہیں۔ 'نادید'، 'پار پرے' اور 'خواب رَو' ان کے اہم ناول ہیں۔

غیاث احمد گدّی (1928-1986) : غیاث احمد گدّی جھریا ضلع دھنباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے افسانے عوامی زندگی سے قریب ہیں۔ وہ بنیادی طور پر علامتی اور تجریدی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ایک مخصوص علاقائی تہذیب کے ترجمان ہیں۔ 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' ان کا مشہور افسانہ ہے۔ اس کے علاوہ 'دیمک'، 'جوہی کا پودا اور چاند'، 'پیاسی چڑیا'، 'اندھے پرندے کا سفر'، 'نارمنی'، 'ڈوب جانے والا سورج' وغیرہ افسانے بھی کافی مقبول ہوئے۔ 'بابا لوگ' اور 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ 'پڑاؤ' ان کا اہم ناول ہے۔

سریندر پرکاش (1930-2001/02): ان کا نام سریندر پرکاش اوبیرائے تھا۔ وہ لائل پور موجودہ فیصل آباد، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں انھوں نے ہفتہ وار 'پارس' جاری کیا۔ بی۔اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ممبئی کی ایک فلم کمپنی سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں لکھنا شروع کیا لیکن اس تحریک سے الگ اپنی راہ نکالی اور تجریدی طرزِ اظہار کو اپنایا۔

ان کے افسانے 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم' سمندر، میدان، پگ ڈنڈیاں، آتش دان، دیواریں اور ان پر لگی تصویریں، اپنے علامتی کردار کے باعث خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ سریندر پرکاش کے افسانوں میں اسطور سازی کا عمل بھی ملتا ہے۔ 'بجوکا' ان کا مشہور افسانہ ہے۔ یہ اس قدر مقبول ہوا کہ بجوکا کے عنوان سے اردو کے علاوہ بعد میں بعض دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی کئی افسانے لکھے گئے۔ 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'، 'برف پر مکالمہ'، 'باز گوئی'، 'حاضر حال جاری' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ 'فساں' نام سے ان کا ایک ادھورا ناول بھی ماہنامہ شاعر میں شائع ہوتا رہا ہے۔

اقبال مجید (1934-2019): اقبال مجید ضلع سیتا پور، اُتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ کچھ عرصے تک اسکول میں پڑھاتے رہے اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے وابستہ ہوگئے۔ جہاں وہ اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

اقبال مجید، عہدِ جدید کے نامور افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں آج کے انسان کی داخلی اور نفسیاتی الجھنوں کو موضوع بنایا ہے۔ افسانوی تکنیک میں بھی انھوں نے بعض اہم تجربے کیے ہیں۔ اقبال مجید نے کئی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ 'نمک' اور 'کسی دن' ان کے دو ناول ہیں۔ 'دو بھیگے ہوئے لوگ'، 'ایک حلفیہ بیان'، 'شہرِ بدنصیب'، 'تماشا گھر' اور 'آگ کے پاس بیٹھی ہوئی عورت' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔

بلراج مینرا (1934 - 2016): بلراج مینرا ہوشیار پور پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے ہوشیار پور میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد آگے کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

1960 کے بعد کی نسل کے افسانہ نگاروں میں بلراج مینرا منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے بہت کم افسانے لکھے لیکن اپنی منفرد شناخت کے سبب شہرت حاصل کی۔ ان کے یہاں اسلوب کی تازگی اور احساس کا نیا پن پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو میں علامتی اور تجریدی افسانے کو پروان چڑھایا۔ بلراج مینرا کا افسانوی مجموعہ 'سرخ و سیاہ' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

شفیع جاوید (پ-1935): شفیع جاوید مظفّر پور، بہار میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے سماجیات میں ایم۔ اے کیا۔ وہ محکمۂ اطلاعات ونشریات، حکومتِ بہار کے ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

شفیع جاوید کے افسانوں میں ماضی کی یادیں، عصرِ حاضر کے ساتھ گھل مل کر ایک فلسفیانہ رنگ پیدا کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں رمزیت اور اشاریت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ 'دائرے سے باہر'، 'کھلی جو آنکھ'،

'تعریف اُس خدا کی'، اور 'وہ اور میں' ان کے مشہور افسانے ہیں۔ 'تیز ہوا کا شور'، 'کہاں ہے ارضِ وفا' اور 'حکایتِ ناتمام' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

نمائندہ تنقید نگار

وزیر آغا (1922-2010) : وزیر آغا کی پیدائش وزیر کوٹ ضلع سرگودھا میں ہوئی۔ ہائی اسکول اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کرنے کے بعد انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے 'اردو ادب میں طنز و مزاح' کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی۔ وزیر آغا بنیادی طور پر ایک ایک شاعر ہیں۔ تقریباً چالیس برس تک اپنے رسالے سہ ماہی 'اوراق' (لاہور) کی انھوں نے ادارت کی۔ اردو میں ایک صنف کے طور پر انشائیہ کو قائم کرنے والوں میں ان کا نام سرِ فہرست ہے۔ وہ ایک مشہور تنقید نگار بھی ہیں۔ وزیر آغا نے نئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی اور نئے ادب کی بنیادوں کو استحکام بخشا۔

وزیر آغا کا مطالعہ وسیع ہے۔ ان کی فکر میں توازن ہے۔ ان کی تنقید کے عمل میں عموماً تحسین کا پہلو حاوی ہوتا ہے۔ جدیدیت سے ذہنی مناسبت کے باوجود ہر ادبی نظریے سے انھوں نے کچھ نہ کچھ اخذ ضرور کیا ہے۔ کہیں کہیں نفسیاتی بصیرت کو بھی کام میں لائے ہیں۔ اکثر تفہیم کے عمل میں لفظ و معنی کو مرکزی حیثیت دینے کے باوجود تاریخ، تہذیب، شخصی اور خاندانی پس منظر کو انھوں نے خاص اہمیت کے ساتھ جگہ دی ہے۔ عمر کے آخری برسوں میں مابعدِ جدید کے تصورات سے بھی وہ متاثر ہوئے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مختلف ادبی نظریات اور مختلف علوم نے ان کے جس تنقیدی تصور کی تشکیل کی ہے اس کا نام 'امتزاجی تنقید' ہے۔ 'امتزاجی تنقید' کی اصطلاح انھیں کی وضع کردہ ہے۔

ان کا اندازِ بیان شگفتہ اور مدلل ہے۔ 'اردو ادب میں طنز و مزاح'، 'نظمِ جدید کی کروٹیں'، 'اردو شاعری کا مزاج'، 'تصوراتِ عقل و خرد' اور 'اقبال اور تصوراتِ عشق' ان کی اہم کتابیں ہیں۔

وارث علوی (1928/36-2014) : وارث علوی ایک جدید نقاد ہیں۔ کسی نظریے کو رہنما بنانے کے بجائے ان کی کوشش یہ جاننے کی ہوتی ہے کہ تخلیق کا اپنا تقاضا کیا ہے؟ وہ خود کیا کہہ رہی ہے؟ یعنی اس کی ہیئت، اس کی تکنیک، اُس کے کردار اور اُس کے سماجی اور تہذیبی تناظر کی نوعیت کیا ہے؟ وارث علوی کے نزدیک محض ہیئت پسندی یا محض لفظ و معنی کے مباحث یا فلسفیانہ قسم کی تفہیم و تعبیر سے تنقید کے وسیع تر تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر نہ تو جدیدیت کے ہیئتی رجحان میں انھیں کوئی کشش نظر آتی ہے اور نہ ترقی پسند ادبی نظریہ اُن کی نگاہ میں سارے مسائل کی کلید ہے۔ وارث علوی کی خاص توجہ فکشن کی طرف رہی۔ منٹو اور بیدی اُن کے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔

وارث علوی کے نزدیک محض تحسین سے تنقید کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ وہ زیرِ بحث تخلیقات کی خامیوں اور کمزوریوں سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں۔ وہ طنز کو حربے کے طور پر استعمال کر کے اپنی تنقید کو تیکھا اور پڑھنے والے کے لیے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ 'ادب کا غیر اہم آدمی'، 'لکھتے رقعہ'، 'لکھے گئے دفتر'، 'بت خانۂ چین' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔

گوپی چند نارنگ (پ-1931): گوپی چند نارنگ کی پیدائش دُکّی (بلوچستان) میں ہوئی۔ تقسیمِ وطن کے زمانے میں ہندوستان آ گئے۔ دہلی یونیورسٹی سے انھوں نے اردو میں ایم۔اے۔ اور پی ایچ۔ڈی۔ کی ڈگریاں حاصل کیں اور شعبۂ اردو میں لکچرر ہو گئے۔ کچھ عرصے تک جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے پروفیسر رہنے کے بعد دوبارہ دہلی یونیورسٹی آ گئے اور یہیں سے سبک دوش ہوئے۔ وہ ساہتیہ اکادمی کے صدر بھی رہے۔ وہ ماہرِ لسانیات کے علاوہ ایک بلند پایہ نقّاد ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' میں نئی تھیوری کو بنیاد بنایا ہے۔ اسی بنا پر انھیں اردو میں مابعد جدیدیت کا بنیاد گزار بھی کہا جاتا ہے۔ تہذیبی مطالعے کی حیثیت سے 'اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب' ان کا ایک اہم تنقیدی و تحقیقی کام ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تالیفی، تحقیقی اور تنقیدی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے جو ان کے اس مسلسل ادبی سفر پر گواہ ہیں جس میں ٹھہراؤ اور ماندگی کا وقفہ کہیں مانع نہیں آیا ہے۔

گوپی چند نارنگ نے اپنی تنقید میں لفظ، معنی اور ہیئت کو ترجیح دی ہے۔ تاہم تاریخ، تہذیب، سماج اور فلسفہ و فکر سے بھی کام لیا ہے۔ ان کا ایک خاص اسلوب ہے جو قاری کی توجہ کو برقرار رکھتا ہے۔ 'ادبی تنقید اور اسلوبیات'، 'فکشن کی شعریات'، 'کربلا بطورِ شعری استعارہ' وغیرہ ان کی اہم تنقیدی کتابیں ہیں۔ ان کا ایک سفرنامہ 'سفر آشنا' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

حامدی کاشمیری (2018-1932): حامدی کاشمیری کی پیدائش بہوری کدل (سری نگر) میں ہوئی۔ ان کا شمار نقادوں کی اس صف میں ہوتا ہے جنھوں نے بیسویں صدی کے چھٹے دہے سے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ یہی وہ دور ہے جب نئی نسل جدیدیت کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ جدیدیت کے سلسلے میں حامدی کاشمیری کی تحریروں نے بھی فضا سازی کا کام کیا۔ انھوں نے نظریاتی مسائل پر بھی لکھا اور عملی تنقید بھی کی۔ وہ اپنی تنقید میں فن پارے کے لفظی نظام اور اس کی توانائیوں کے علاوہ ہیئت، ساخت اور تکنیک کو اکثر مسئلے کے طور پر موضوع بناتے ہیں۔ حامدی کاشمیری نے اکتشافی تنقید کے نام سے جس نئے تصور سے متعارف کرایا ہے اس کے رشتے بھی ہیئتی رجحان سے ملتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی (پ- 1935) : شمس الرحمٰن فاروقی بہ یک وقت شاعر، نقاد اور فکشن نگار ہیں۔ ماہنامہ 'شب خون' کے مدیر کی حیثیت سے ادبی صحافت میں بھی وہ ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ میر اور غالب کے شارح کے علاوہ انھوں نے مترجم کے طور پر اپنی شناخت بنائی ہے۔

1955 کے بعد جن نقادوں نے اردو تنقید کے کینوس کو وسیع کیا اور مغرب کے تنقیدی نظریات سے متعارف کرایا، ان میں فاروقی کا نام سرِفہرست ہے۔ فاروقی نے شاعری میں زبان کی اہمیت اور نوعیت، ہیئت و موضوع کی وحدت اور ترسیل وابلاغ کے مسئلے پر بے حد تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں لفظ و معنی کے رشتے پر خصوصی بحث کی ہے۔

فاروقی نے اپنے نظریات کی تشکیل میں آئی۔ اے۔ رچرڈز کے علاوہ ولیم امپسن اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی تحریروں کو بھی بنیاد بنایا ہے لیکن میر و غالب کے اشعار کی تشریح و تعبیر میں انھوں نے مغربی نظریاتِ نقد کے پہلو بہ پہلو کلاسیکی نظامِ فن کو خصوصی اہمیت کے ساتھ مدِّنظر رکھا ہے۔ 'لفظ و معنی'، 'شعر غیر شعر اور نثر'، 'عروض آہنگ اور بیان'، 'افسانے کی حمایت میں'، 'شعر شور انگیز' اور 'تعبیر کی شرح' وغیرہ ان مشہور کتابیں ہیں۔ 'سوار' ان کے افسانوں کا مجموعہ اور 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' ان کا اہم ناول ہے۔

وہاب اشرفی (1936-2012) : سید عبدالوہاب اشرفی کی پیدائش بی بی پور، بہار میں ہوئی۔ وہاب اشرفی نے جدیدیت کو وقت کے ایک نئے تقاضے سے تعبیر کیا اور نظریاتی مسئلے کو بار بار اپنی بحث کا موضوع بنایا۔ شاعری، افسانوی ادب اور عالمی ادب کی تاریخ ان کی دلچسپی کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کی تنقید کی ایک نمایاں خوبی اس کا معروضی طریقِ کار ہے۔ اسی چیز نے اُن کے عملی مطالعوں کو اعتبار بھی بخشا ہے۔ وہاب اشرفی نے وقتاً فوقتاً نظریاتی مسائل پر جو مضامین لکھے تھے ان کی تعداد عملی مطالعوں سے کم ہے۔ وہ تشریح و ترجمانی کے بجائے تجزیے پر زیادہ زور دیتے ہے۔ 'مابعدِ جدیدیت: مضمرات اور ممکنات' اور 'عالمی ادب کی تاریخ' ان کی اہم کتابیں ہیں۔

شمیم حنفی (پ- 1939) : شمیم حنفی کی پیدائش سلطان پور اترپردیش میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول سے انٹر پاس کیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کرنے کے بعد تاریخ اور اردو میں ایم۔ اے کیا۔ وہیں سے اردو میں ڈی۔ فل کی ڈگری لی۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں انھوں نے پروفیسر کے طور پر درس و تدریس کے فرائض انجام دیے اور وہیں سے سبک دوش ہوئے۔ 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' ان کا ڈی لٹ کا تحقیقی مقالہ ہے جس میں انھوں نے تاریخ وار جدیدیت کے سرچشموں کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی تنقید کے عمل میں فلسفیانہ فکر نمایاں ہے۔ تاریخ اور تہذیب کا عمل ذہنی زندگیوں اور خصوصاً تخلیقی بصیرتوں پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اور نظامِ فن

میں تبدیلیوں کے محرّ کات کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ اس قسم کے سوالوں سے شمیم حنفی بار بار دو چار کراتے ہیں۔ ایک نئی قسم کی روشن خیالی نے ان کی تحریروں کو مزید وقار عطا کیا ہے۔

عتیق اللہ (پ-1942) : عتیق اللہ کی پیدائش اُجّین میں ہوئی۔ انھوں نے وکرم یونیورسٹی، اجین سے انگریزی اور اردو میں ایم۔ اے کیا۔ مراٹھ واڑا یونیورسٹی۔ اورنگ آباد سے اردو میں پی ایچ ڈی کی اور وہیں تقریباً پانچ برس اردو درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے اور مستقل سکونت دہلی میں اختیار کی۔ عتیق اللہ نقاد کے علاوہ نئے لب و لہجے کے اہم شاعر بھی ہیں۔ 'ایک سوغزلیں' اور 'بین کرتا ہوا شہر' ان کے شعری مجموعے اور 'ترجیحات'، 'تعصّبات'، 'بیانات' اور 'تنقید کا نیا محاورہ' ان کے مضامین کے مجموعے ہیں۔

جن نقادوں نے جدید فنی وفکری رجحانات کو اپنی تنقید کے عمل میں خاص اہمیت کے ساتھ جگہ دی تھی ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، محمود ہاشمی، باقر مہدی، وحید اختر، مغنی تبسّم، فضیل جعفری، ابوالکلام قاسمی اور قاضی افضال وغیرہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔

باب 15

اُردو میں داستان گوئی کی روایت

داستان اس طویل مہماتی کہانی کو کہتے ہیں جس میں عام طور پر فرضی اور خیالی واقعات بیان کیے گئے ہوں۔ ان میں ہماری جانی پہچانی دنیا نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس میں جانور اور پرندے بولتے سنائی دیتے ہیں۔ چڑیلیں اور جادوگر ہی نہیں، سونے اور چاندی کے پہاڑ بھی ہماری حیرت میں اضافہ کرتے ہیں۔ جہاں بادشاہ، شہزادے، شہزادیاں، وزیر اور وزیر زادے جیسے کردار ہوتے ہیں، وہیں جنوں، دیووں اور پریوں کے ذکر سے اسے دلچسپ بنایا جاتا ہے۔ داستانیں خیالی اور فرضی ہونے کے باوجود بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ ہمارے قدیم تہذیب وتمدن اور معاشرتی زندگی کے مطالعے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

قصے، کہانیوں کے ذریعے حیرت انگیز، طلسماتی اور مہماتی واقعات کو سننا اور سنانا انسان کا محبوب مشغلہ اور تفریح کا سامان رہا ہے۔ اسی لیے قدیم زمانے سے قصّے سننے اور سنانے کی روایت عوام اور خواص میں یکساں مقبول رہی ہے۔ بادشاہوں کے درباروں اور امرا کی محفلوں میں اس روایت کو مزید فروغ حاصل ہوا جہاں داستانیں کہنے اور سننے کا رواج عام تھا۔

سترھویں صدی سے اردو میں داستان نگاری کا آغاز ہوا اور کئی ادبی داستانیں لکھی گئیں۔ ادب کی دیگر اصناف کی طرح داستانیں بھی پہلے دکن میں وجود میں آئیں۔ ملاوجہی کی 'سب رس' کو اردو کی اوّلین نثری داستان تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ عیسوی خاں، عطاحسین خاں تحسین، شاہ عالم ثانی، میر امن دہلوی اور رجب علی بیگ سرور نے داستان نگاری کی اس روایت کو آگے بڑھایا۔

ملاوجہی (1562-1659) : ان کے حالاتِ زندگی باب دوم میں بیان کیے جاچکے ہیں۔

ملاوجہی کی 'سب رس' اردو میں ادبی نثر کی پہلی تصنیف ہے۔ انھوں نے اسے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1635 میں لکھا تھا۔ اس عشقیہ قصّے کو وجہی نے 'نوی بات' کہا ہے۔ یہ محمد یحییٰ فتاحی نیشاپوری کی فارسی مثنوی 'دستورِ عشاق' کے نثری خلاصے 'قصۂ حسن ودل' سے ماخوذ ہے۔ 'سب رس' ایک تمثیلی داستان ہے۔ اس کے کردار انسانی جسم کے اعضا ہیں۔

'عقل' سیستان کا بادشاہ ہے۔ اس کے لڑکے کا نام 'دل' ہے جو 'تن' کے ملک پر حکمرانی کرتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے 'سب رس' کی اہمیت دو وجہ سے ہے: اوّل یہ کہ یہ اردو نثر کا پہلا ادبی کارنامہ ہے۔ اس سے پہلے کی جو نثری کتابیں یا رسالے اب تک دریافت ہوئے ہیں، ان کی ادبی حیثیت بہت بلند نہیں ہے۔ اس کے برخلاف سب رس میں اسلوب کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ دوسرا یہ کہ تمثیل کے لحاظ سے بھی یہ ایک منفرد داستان ہے۔

'سب رس'، مسجّع و مقفّی اور رنگین اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تشبیہ اور استعارے اور مختلف صنعتوں کا بھی کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔

عیسوی خاں (و۔ 1750) : نواب عیسوی خاں کا خاندان کشمیر سے آکر دہلی میں بس گیا تھا، یہیں ان کی پیدائش ہوئی۔ جوانی میں گوالیار چلے گئے۔ وہ سنسکرت اور ہندو دیومالا سے واقف تھے۔ ان کی تصنیف 'قصۂ مہر افروز و دلبر' شمالی ہند کی اوّلین داستان ہے۔

ڈاکٹر پرکاش مونس 'قصۂ مہر افروز و دلبر' اور 'رس چندریکا' کی عبارت کا باہم مقابلہ کرکے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دونوں کتابوں کے مصنف عیسوی خاں ہیں۔ عیسوی خاں گوالیار کے راجا چھتر سنگھ کے متوسل تھے۔ 'قصۂ مہر افروز و دلبر' کا مخطوطہ بھی گوالیار ہی میں دستیاب ہوا تھا۔ اس سے مونس کے خیال کو تقویت ملتی ہے۔

یہ داستان دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصّے میں اصل قصّہ ہے اور دوسرے حصّے میں نصائح درج ہیں۔ یہ داستان بھی قصّے اور پلاٹ کے لحاظ سے دوسری داستانوں جیسی ہی ہے مثلاً بادشاہ کا بے اولاد ہونا، فقیر کی دعا سے اولاد ہوجانا، شہزادے کا مختلف آفتوں میں گھِرنا، پریوں کے دیس میں پہنچنا، کامیاب ہوکر وطن واپس لوٹنا وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ اس داستان کے اہم کردار مہر افروز اور دلبر ہیں لیکن کہانی کی تکنیک کی وجہ سے کرداروں میں اور جزوی واقعات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ 'مہر افروز و دلبر' کی زبان میں علاقائی اثرات نمایاں ہیں۔

تحسینؔ: ان کا نام میر حسین عطا خاں تھا۔ وہ اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد باقر شوق فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں وہ سہ ہزاری منصب پر فائز تھے۔ انقلاباتِ زمانہ کے تحت تحسین شمالی ہند کو خیر باد کہہ کر بنگال چلے گئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین میں شامل ہوگئے۔ ان کے مربی جنرل اسمتھ ان کی فارسی دانی سے بہت متاثر تھے۔ جب وہ اسمتھ کے ساتھ کشتی میں سوار ہوکر کولکتہ جارہے تھے تو راستے ہی میں 'نوطرزِ مرصّع'

لکھنے کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوا۔ انھوں نے نوطرزِ مرصع کا ابتدائی حصّہ 69-1768 میں لکھ لیا تھا۔ مگر اس کی تکمیل 1775 میں فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ کی ایما پر ہوئی۔

نوطرزِ مرصّع فارسی کے مشہور قصّے 'قصّہ چہار درویش' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کی زبان مرصّع اور دقیق ہے۔ گذشتہ داستانوں کی طرح یہ داستان بھی قصّہ درقصّہ آگے بڑھتی ہے اور اس کا ہیرو اپنی مراد کو پہنچتا ہے۔ تحسین کا یہ ترجمہ زبان و بیان کے لحاظ سے ادق تھا۔ اس لیے جان گلکرسٹ نے میر امّن کو اسی قصّے کو آسان اردو میں لکھنے کے لیے کہا تھا۔

شاہ عالم ثانی (1806-1727/28) : شاہ عالم ثانی کا اصل نام مرزا عبداللہ اور تخلص آفتاب تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ غلام قادر روہیلہ نے ان کی دونوں آنکھیں نکال لی تھیں۔ شاہ عالم ثانی شعر و ادب سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ فنِ خطاطی، فنِ انشا اور سپہ گری میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اردو کے علاوہ برج بھاشا میں بھی شاعری کی۔ 'نوادراتِ شاہی' ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ داستانی ادب میں انھیں 'عجائب القصص' کی وجہ سے شہرت ملی۔ یہ ان کی مشہور داستان ہے۔ نابینا ہونے کی وجہ سے انھوں نے اسے اپنے منشیوں سے املا کرایا ہے۔

عجائب القصص میں خطا و ختن کے بادشاہ مظفر شاہ کے بے اولاد ہونے کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ اس قصے میں کوئی رنگا رنگی اور ندرت نہیں ہے۔ البتہ اس میں آدابِ سلطنت اور نظامِ حکومت کی باریکیاں ضرور سمجھائی گئی ہیں، جن کا خود بادشاہ کے یہاں فقدان تھا۔ اس داستان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں غیر ضروری عربی فارسی الفاظ سے گریز کیا گیا ہے۔ اس کی زبان 'باغ و بہار' سے قریب اور 'نوطرزِ مرصّع' اور 'نو آئینِ ہندی' سے مختلف ہے۔

میر امّن (1837-1750) : میر امّن کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ ان کے بزرگ مغل دربار میں صاحبِ منصب و جاگیر تھے۔ اٹھارھویں صدی کے نصفِ آخر میں جب دہلی سلطنت کی بنیادیں ہلنے لگیں اور ان کی جاگیر ضبط ہوگئی تو وہ دہلی چھوڑ کر پہلے عظیم آباد آئے اور پھر کولکتہ پہنچے۔ منشی میر بہادر علی حسینی کے توسّط سے گلکرسٹ تک ان کی رسائی ہوئی اور 4/مئی 1801ء کو فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے میں منشی مقرر ہوئے۔ میر امّن جون 1806 تک اس کالج میں رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے دو کتابیں 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی' تالیف و ترجمہ کیں۔ انھیں شہرت 'باغ و بہار' سے ملی جس میں چار درویشوں کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ میر امّن نے باغ و بہار میں دہلی کی ٹکسالی زبان استعمال کر کے اردو نثر نگاری میں سادہ اسلوب کی بنیاد ڈالی۔ ان کی دوسری کتاب 'گنج خوبی' ہے جو ملا واعظ کاشفی کی فارسی کتاب 'اخلاقِ محسنی' کا اردو ترجمہ ہے۔ وہ شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کا تخلّص لطف تھا۔

فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی زبانوں کے شعبے کے صدر ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو انگریز افسروں کو اردو سکھانے کے لیے آسان اردو میں لکھی ہوئی کتابیں درکار تھیں۔ انھوں نے میر امن سے فارسی کے مشہور قصے 'قصّۂ چہار درویش' کو آسان اردو میں ترجمہ کرنے کو کہا۔ میر امّن نے یہ کام 1801 میں شروع کیا اور 1802 میں باغ و بہار کے نام سے مکمل کر دیا۔ اس کتاب میں روزمرہ کی زبان استعمال کی گئی ہے جو عوام میں رائج تھی۔ باغ و بہار میں دہلی کے رسم و رواج، لباس، مشاغل وغیرہ کا نہایت خوش اسلوبی سے بیان ہوا ہے۔ اردو کی نثری داستانوں میں اسے زبان و بیان کے اعتبار سے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ دنیا کی کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ گارساں دتاسی اس کتاب کا بڑا شیدائی تھا۔ اس نے اپنے کئی خطبات میں 'باغ و بہار' کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔

انشاءاللہ خاں انشا (1752/56-1817) : ان کے حالاتِ زندگی باب پانچ میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

'رانی کیتکی کی کہانی' ایک تجرباتی نثری قصہ ہے۔ اس میں 'کنور اودے بھان' اور 'رانی کیتکی' کے عشقیہ قصے کو بیان کیا گیا ہے۔ کہانی کے اعتبار سے اس میں بھی وہ سب عناصر موجود ہیں جو دوسری داستانوں میں ملتے ہیں۔ اس کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار شعوری طور پر عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کے استعمال کے بغیر اردو نثر لکھنے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ رانی کیتکی کی عبارت میں سو فی صد الفاظ خالص ہندوستانی ہیں۔ جس سے اس کا اسلوب بالکل اچھوتا ہو گیا ہے لیکن اس میں وہ دل کشی پیدا نہیں ہو سکی جو روزمرہ اور محاوروں کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔

حیدریؔ (1768/69-1813/14) : ان کا نام سید حیدر بخش اور تخلص حیدریؔ تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ان کے والد معاشی پریشانیوں کے سبب دہلی چھوڑ کر بنارس چلے گئے۔ وہاں سے کولکتہ پہنچے اور فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو گئے۔ ان کا شمار کالج کے اہم نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ یہ اس کالج کے مصنفوں میں سب سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تالیفات کی تعداد تیرہ ہے۔ انھوں نے فارسی قصّہ 'حاتم طائی' کا ترجمہ 'آرائشِ محفل' کے نام سے کیا جو میر امّن کی 'باغ و بہار' کے بعد سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے۔ ان کی دوسری کتاب 'طوطا کہانی' ہے جو سید محمد قادری کے فارسی 'طوطی نامہ' کا ترجمہ ہے۔ ان کے علاوہ 'قصّۂ مہر و ماہ'، 'قصّۂ لیلیٰ مجنوں'، 'گلدستۂ حیدری'، 'گلشنِ ہند'، 'گلزارِ دانش'، 'ہفت پیکر' وغیرہ کتابیں بھی لکھیں۔ آخری عمر میں انھوں نے ملازمت چھوڑ دی اور بنارس چلے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

یوں تو سید حیدر بخش حیدری نے متعدد کتابیں لکھیں لیکن ان میں سے اکثر نایاب ہیں۔ البتہ 'طوطا کہانی' اور 'آرائشِ محفل' اب بھی دستیاب ہیں۔ 'آرائش محفل' حاتم طائی کے سات سفروں کی داستان ہے۔ حیدری نے اسے

جان گلکرسٹ کی فرمائش پر 1802 میں فارسی سے ترجمہ کیا تھا۔ حیدری نے ترجمہ کی زبان کو بجائے اردو کے ریختہ کہا ہے۔ یہ کتاب چونکہ سلیس اور روزمرہ زبان میں لکھی گئی ہے اس لیے کافی مقبول ہوئی۔ حیدری کا طرزِ تحریر سادہ اور پُرکشش ہے۔ وہ مقفّٰی اور مرصّع عبارت نہیں لکھتے لیکن عربی فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ آرائشِ محفل کی داستان بھی قصّہ در قصّہ آگے بڑھتی ہے۔ پہلا سفر ختم ہوتے ہی دوسرے سفر کی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ حاتم طائی کی مہمات کا تذکرہ ان کے یہاں بڑے مؤثر انداز میں ہوا ہے۔ منظر کشی اور مہمات کے احوال کا بیان وہ اس طرح کرتے ہیں کہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

رجب علی بیگ سرؔور (1786-1869) : سرؔور لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انھیں عربی فارسی کے علاوہ فنِ خطاطی اور موسیقی پر بھی قدرت حاصل تھی۔ غازی الدین حیدر نے کسی بات پر ناراض ہو کر اُنھیں جلاوطن کر دیا تو سرؔور کان پور چلے گئے۔ اسی جلاوطنی کے زمانے میں انھوں نے اپنی کتاب 'فسانۂ عجائب' لکھی۔ نصیرالدین حیدر نے ان کا قصور معاف کر دیا اور اُنھیں لکھنؤ آنے کی اجازت دے دی۔ 'فسانۂ عجائب' فورٹ ولیم کالج کے باہر کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ اس کتاب کی شہرت کی وجہ اس کا اندازِ بیان ہے۔ اس کی عبارت پُرتکلف اور فارسی آمیز ہے۔ اُس عہد میں نثر کا یہی انداز پسندیدہ تھا۔ اسی لیے 'فسانۂ عجائب' مقبول ہوئی۔ 'سرورِ سلطانی'، 'شگوفۂ محبت'، 'گلزارِ سرور'، 'شبستانِ سرور'، 'فسانۂ عبرت' اور 'شرارِ عشق' سرؔور کی دیگر اہم تصانیف ہیں۔ آخر عمر میں وہ لکھنؤ سے بنارس چلے گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

فسانۂ عجائب سرؔور کی اہم ترین تصنیف ہے۔ یہ حسن و عشق کا افسانہ ہے جس کی عبارت پُرتکلّف، مقفّٰی اور مسجّع ہے۔ یہ داستان لکھنوی اسلوبِ نگارش کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں تشبیہ اور استعارے کے علاوہ کہیں کہیں وزن اور قافیے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

مہر چند مہر کھتری کی 'نوآئینِ ہندی'، نہال چند لاہوری کی 'مذہبِ عشق'، میر بہادر علی حسینی کی 'نثرِ بے نظیر'، سید حسین شاہ حقیقتؔ کی 'جذبِ عشق'، فقیر محمد گویاؔ کی 'بُستانِ حکمت'، محمد بخش مہجوؔر کی 'گلشنِ نو بہار' اور عظمت اللہ نیاؔز دہلوی کی 'قصۂ رنگین گفتار' کا شمار بھی اردو کی اہم داستانوں میں ہوتا ہے۔

باب 16

اُردو میں ڈرامے کی روایت

13085CH16

ڈراما یونانی لفظ ہے۔ اس کے معنی 'کر کے دکھانا' ہیں۔ ارسطو ڈرامے کو زندگی کی نقالی قرار دیتا ہے۔ اس صنفِ ادب میں کسی قصے کو کرداروں، مکالموں اور مناظر کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے یعنی قصّے کے واقعات عملاً کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ کرداروں کی ذہنی کشمکش اور ان کے جذبات و احساسات کو جسمانی حرکات اور چہرے کے تاثرات نیز آواز کے اتار چڑھاؤ کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں ڈرامے کی تاریخ سنسکرت ڈراموں سے شروع ہوتی ہے۔ سنسکرت ڈرامے کا سب سے مشہور نام کالی داس ہے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے اودھ کے آخری تاجدار سلطانِ عالم واجد علی شاہ نے ڈرامے میں خاص دل چسپی لی۔ قیصر باغ، لکھنؤ کے اسٹیج پر ناچ گانے کی محفلیں اکثر ترتیب دی جاتی تھیں۔ 'رہس' کے نام سے ڈرامے بھی کھیلے جانے لگے۔ ان میں بالعموم سری کرشن کی راس لیلائیں پیش کی جاتی تھیں۔

سید آغا حسن امانتؔ (1815-1858) کا ترتیب دیا ہوا رہس 'اندر سبھا' کے نام سے کھیلا گیا۔ یہ واقعہ 1852 کا ہے۔ امانتؔ کی اندر سبھا نے بے مثال مقبولیت حاصل کی۔ اس کے بعد کئی اندر سبھائیں لکھی گئیں۔

امانتؔ سے پہلے ممبئی میں انگریزی ڈرامے اسٹیج کیے جانے لگے تھے۔ ممبئی میں گرانٹ روڈ پر ممبئی تھیٹر قائم کیا جا چکا تھا۔ انگریزوں کی دیکھا دیکھی کچھ مراٹھی نوجوانوں کو بھی ڈرامے اسٹیج کرنے کا شوق ہوا۔ ایک مذہبی مراٹھی ناٹک کھیلا گیا۔ اس کی مقبولیت دیکھ کر کچھ پارسی رئیسوں کو خیال آیا کہ کیوں نہ اردو میں بھی ناٹک کھیلے جائیں۔ یہ بات 1853 کی ہے جب ایک اردو ڈراما 'راجہ گوپی چند اور جلندھر' اسٹیج کیا گیا۔ ڈرامے کے ذریعے لوگوں کو تفریح کا ایک بہانہ مل گیا۔ پارسیوں نے اسے تجارتی کاروبار کی شکل دے دی۔ ایک کے بعد ایک کئی ناٹک کمپنیاں وجود میں آئیں۔ عوام میں اردو ڈراما مقبول ہوتا گیا۔ بہرام جی فریدوں جی کا ڈراما 'خورشید' اردو کا پہلا ڈراما کہا جاتا ہے جو وکٹوریہ کمپنی کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس کے بعد الفریڈ کمپنی نے اپنا ڈراما 'جہاں بخش گل رخسار' پیش کیا۔ ان ڈراموں کی مقبولیت دیکھ کر دوسرے مصنفین بھی اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے جن

میں احسن لکھنوی، رونقؔ بنارسی، ونائک پرساد، طالبؔ بنارسی، فضا علی خنجرؔ، حکیم احمد شجاع اور پنڈت نارائن پرساد بیتابؔ بنارسی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اردو کے ابتدائی ڈراموں میں سیّد ابوالفضل کا ڈراما 'صولتِ عالمگیری' اور مولوی احمد حسین کا ڈراما 'بلبلِ بیمار' شامل ہیں۔ اردو میں ڈرامے کی روایت کا باقاعدہ آغاز آغا حشرؔ کاشمیری سے ہوتا ہے۔

آغا حشرؔ کاشمیری (1935-1879) : ان کا نام آغا محمد شاہ تھا۔ وہ ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو بنارس میں آباد ہو گیا تھا۔ آغا حشر بنارس میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں گھر سے بھاگ کر وہ ممبئی چلے گئے۔ وہاں کاوَس جی کی ڈراما کمپنی میں ڈراما نویس کی حیثیت سے نوکری کر لی۔ اس سے قبل وہ اپنا پہلا ڈراما 'آفتابِ محبت' لکھ چکے تھے جو 1897 میں بنارس سے شائع ہوا تھا۔

کاوَس جی کی کمپنی میں آغا حشر نے 'مارِ آستیں'، 'مریدِ شک'، 'اسیرِ حرص' اور 'شہیدِ ناز' جیسے ڈرامے لکھے۔ پھر ان کا تعلق اردشیر بھائی کی کمپنی سے ہو گیا جس کے لیے 'سفید خون' اور 'صیدِ ہوس' لکھے گئے۔ کئی تھیٹر کمپنیوں سے متعلق رہنے کے علاوہ انھوں نے اپنی کمپنیاں بھی بنائیں۔ ان کے لیے آغا حشرؔ نے جو ڈرامے لکھے ان میں 'خوابِ ہستی'، 'خوب صورت بلا'، 'سلور کنگ'، 'یہودی کی لڑکی'، 'بلوا منگل'، 'بن دیوی' وغیرہ شامل ہیں۔ ممبئی سے کلکتہ منتقل ہونے کے بعد انھوں نے 'مدھر مرلی'، 'بھگیرتھ گنگا'، 'بھارت مُنی'، 'ہندوستان قدیم و جدید'، 'ترکی حور'، 'پہلا پیار'، 'آنکھ کا نشہ'، 'بھیشم پرتگیا' وغیرہ مختلف ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد انھوں نے بنارس میں 'دی گریٹ شیکسپیئرین تھیٹر کمپنی' کے نام سے اپنی کمپنی قائم کی اور اس کے لیے 'سیتا بن باس'، 'رستم سہراب'، 'دھرمی بالک'، 'بھارتیہ بالک'، 'دل کی پیاس' جیسے ڈرامے لکھے۔ یہ تمام ڈرامے بڑے اہتمام سے اسٹیج کیے گئے۔ ان کے وجہ سے آغا حشرؔ کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ عوام میں وہ دور دور تک انڈین شیکسپیئر کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آخر میں وہ کولکتہ سے لاہور چلے گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ آغا حشر نے انگریزی کے بعض ڈراموں کے تراجم بھی کیے تھے۔ یہ ترجمے اتنے آزاد تھے کہ ان میں اصل انگریزی ڈراموں کی تھیم ہی بدل گئی تھی۔

آغا حشرؔ کا دور اسٹیج کی ترقی اور شہرت و مقبولیت کے اعتبار سے اردو ڈراموں کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں ان کے علاوہ اور بھی کئی لوگ ڈرامے لکھ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ آغا حشرؔ سے پہلے ہی ڈراما نگاری کی دنیا میں اپنا سِکّہ جما چکے تھے۔ ان میں رونقؔ بنارسی، حسینی میاں ظریفؔ، ونایک پرشاد طالبؔ بنارسی، حافظ محمد عبداللہ،

مرزا نظیر بیگ اکبرآبادی، محمد عبدالوحید قیسؔ، نرائن پرشاد بیتابؔ بنارسی، سید عباس علی عباسؔ، منشی احسنؔ لکھنوی اور مرادؔ لکھنوی وغیرہ شامل ہیں۔ کچھ لوگوں نے آغا حشرؔ کے ساتھ یا ان کے بعد اس میدان میں قدم رکھا۔ ان میں محمد عبدالعزیز فائقؔ لکھنوی، اصغرؔ نظامی، میر غلام عباس، نورالدین مخلصؔ حیدرآبادی، غلام محی الدین نازاںؔ دہلوی، ماسٹر رحمت علی، آرزوؔ لکھنوی، آرزوؔ بدایونی، مائلؔ دہلوی، نیّرؔ دہلوی، آغا شاعر قزلباش، منشی دلؔ لکھنوی، رادھے شیام کتھا واچک وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

آغا حشرؔ کے عہد کی یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے کے ڈراموں نے تفریح مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کو بیدار کرنے میں بھی زبردست رول ادا کیا۔ سماج کے ہر طبقے کے لوگ اس میں دل چسپی لینے لگے۔ اب ڈراما نگاروں نے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں کو بھی اپنے ڈراموں میں ابھارنا شروع کر دیا۔ اس معاملے میں آغا حشرؔ سب سے آگے رہے۔ ان کا ڈراما 'یہودی کی لڑکی' حکومت کے جبر کے خلاف احتجاج کی ایک خوب صورت مثال ہے۔ دوسرے ڈراما نگاروں نے بھی اس طرف توجہ کی جس سے سماج کی اصلاح اور ملک کی آزادی کے لیے عوام کے جذبات و احساسات کو بیدار کرنے میں کافی مدد ملی۔

اردو اسٹیج، آغا حشرؔ کے بعد

آغا حشرؔ کے زمانے میں ہی ہندوستان میں خاموش فلمیں بننا شروع ہو گئی تھیں۔ فلموں کے چلن اور مقبولیت نے اردو اسٹیج کو نقصان پہنچایا۔ ڈرامے اور اسٹیج کے شائقین کو فلموں نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ بولتی ہوئی فلموں (Talkie) کی آمد سے اسٹیج کی مقبولیت اور کم ہو گئی۔ ایک ایک کر کے کئی ڈراما کمپنیاں بند ہو گئیں۔ کچھ کمپنیوں نے تھیئٹر کی جگہ سنیما ہال بنوا لیے۔ اردو میں یوں بھی اسٹیج سے دل چسپی رکھنے والے کم تھے۔ ڈراما لکھنے والے اسٹیج سے الگ ہٹ کر کتابی قسم کے ڈرامے لکھنے لگے۔ اب ڈرامے دیکھنے کے بجائے پڑھنے کی چیز بن گئے۔

اس قسم کی تبدیلی کے باوجود محمد ابراہیم محشرؔ انبالوی، کاظم حسین نشترؔ لکھنوی اور حکیم احمد شجاع وغیرہ نے آغا حشرؔ کی روایت قائم رکھی اور ان کے ڈرامے عوام کے لیے اسٹیج کیے جاتے رہے۔ خالص ادبی اور کتابی قسم کے ڈرامے لکھنے والوں میں محمد حسین آزادؔ، عبدالحلیم شررؔ اور مرزا رسواؔ کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ ادبی ڈرامے کی روایت کو آگے

بڑھانے والوں میں امتیاز علی تاج، مولانا عبدالماجد دریابادی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، برج نرائن چکبست اور پریم چند کے اہم نام ہیں۔ادبی اور کتابی مزاج رکھنے والے ڈرامے اسٹیج ڈرامے کی جگہ نہیں لے سکتے تھے۔اسی لیے اردو اسٹیج کی ساکھ گرنے لگی اور وہ سمٹنے لگا۔

امتیاز علی تاج (1970-1900) : ان کا نام سید امتیاز علی تھا۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے۔امتیاز علی تاج اپنے والد کے رسالے 'پھول' میں بچّوں کے لیے کہانیاں لکھا کرتے تھے۔انھوں نے کئی مزاحیہ فیچر اور چند مزاحیہ مضامین بھی لکھے اور 'چچا چھکن' جیسے کردار کو دوام بخشا۔لیکن ادبی دنیا میں انھیں اپنے ڈرامے 'انارکلی' کی وجہ سے بلند مقام حاصل ہوا۔

تاؔج نے 'انارکلی' میں مغلیہ عہد کے ایک مشہور روایتی قصّے کو ڈرامے کی شکل دی ہے۔ اس میں مغلوں کی درباری شان و شوکت اور جاہ و جلال کا نقشہ بڑی کامیابی سے کھینچا گیا ہے۔ زبان و بیان شاعرانہ ہے۔مکالمے جذبات انگیز ہیں۔ تاؔج نے اس ڈرامے میں کش مکش اور تصادم کو فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

محمد مجیب (1985-1902): وہ بہلول گڑھی، ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔محمد مجیب نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں اور ثانوی تعلیم دہرہ دون میں حاصل کی۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلے گئے۔ فارسی، لاطینی، روسی اور انگریزی زبانوں پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ جرمنی سے واپسی کے بعد جامعہ ملّیہ اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے۔

انھوں نے بچّوں کے لیے کئی کہانیاں اور ڈرامے لکھے اور بعض ڈراموں کی ہدایت کاری بھی کی۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی کتاب 'آؤ ڈراما کریں' فنِ ڈراما کو سمجھنے میں مفید اور کارآمد ہے۔تاریخِ ہند اور فلسفے سے انھیں بڑی دل چسپی تھی۔ ان کے ڈرامے 'خانہ جنگی' میں یہ دونوں عناصر ملتے ہیں۔ خانہ جنگی کے علاوہ 'حبّہ خاتون'، 'آزمائش' 'ہیروئن کی تلاش' اور 'کھیتی' ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔

حبیب تنویر (2009-1923) : حبیب تنویر کا نام حبیب احمد خاں اور تنویر تخلص تھا۔ وہ رائے پور (چھتیس گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ ادبی اور ثقافتی دنیا میں وہ حبیب تنویر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ناگ پور یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ابتدا میں انھوں نے فلمی گیت اور مکالمے لکھے پھر کچھ دنوں کے لیے قدسیہ زیدی کے ہندوستانی تھیٹر میں شامل ہو گئے۔لندن اور جرمنی میں ڈرامے کی تکنیک پر مہارت حاصل کی۔

'اپٹا' (IPTA) کی سرگرمیوں نے حبیب تنویر کو اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ اِپٹا سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے ڈرامے آگرہ بازار (1954) کی دہلی میں مقبولیت کے زیرِ اثر حبیب کولندن کی 'رائل اکاڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ' میں تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس سے ان کے فن کو جلا ملی اور انھیں دوسرے ممالک میں جا کر ڈرامے پیش کرنے کے مواقع حاصل ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے 1969 میں 'نیا تھیٹر' کی بنیاد ڈالی۔ اس تھیٹر کی وجہ سے حبیب تنویر 'لوک کلا وادی' اور 'لوک شیلی' میں ڈراما لکھنے والے کی حیثیت سے ابھرے۔ انھوں نے 'مٹی کی گاڑی'، 'گاؤں کا نام سسرال مور نام داماد' اور 'چرن داس چور' جیسے ڈرامے اسٹیج کیے۔ دہلی میں انھوں نے پریم چند کے مشہور افسانے 'شطرنج کی بازی' کو ڈرامے کی شکل میں ڈھالا۔ حبیب تنویر خود بھی بیشتر ڈراموں میں مختلف کردار ادا کرتے رہے۔ وہ راجیہ سبھا کے ممبر بھی بنائے گئے تھے۔

ابراہیم یوسف (1925-1999) : ان کا نام محمد ابراہیم خاں اور قلمی نام ابراہیم یوسف تھا۔ بھوپال کے ایک معزز پٹھان خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم بھوپال اور اعلیٰ تعلیم اندور میں حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی افسانہ نگار کے طور پر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ محکمۂ تعلیمات، حکومتِ مدھیہ پردیش سے وابستہ رہے اور پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ان کا اصل میدان ڈراما نگاری ہے۔ ان کے ڈراموں کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں 'سوکھے درخت'، 'دھوئیں کے آنچل'، 'پانچ چھے ڈرامے' اہم ہیں۔ ایک ناول 'آبلے اور منزلیں' شائع ہوا۔ ڈرامے کے فن اور تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس سے متعلق ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے ڈیڑھ سو سے زیادہ یک بابی ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ ان کے بعض ڈرامے بھوپال، اندور اور ممبئی میں اسٹیج کیے جا چکے ہیں۔

ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں مدھیہ پردیش حکومت کا 'اقبال سمّان'، 'میر تقی میرؔ ایوارڈ' اور غالب انسٹی ٹیوٹ کا 'غالب ایوارڈ' دیا گیا۔

محمد حسن (1925/26-2010) : محمد حسن اگرچہ ممتاز ناقد کے طور پر زیادہ مشہور ہیں لیکن عصرِ جدید کے ڈراما نگاروں میں بھی ان کا نام امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کا شمار اردو کے ان چند ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے جنھیں اسٹیج کا براہِ راست تجربہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اسٹیج کی تمام باریکیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ڈرامے لکھے ہیں، انھوں

نے ڈراما نگاری کا آغاز ریڈیائی ڈرامے سے کیا۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'پیسہ اور پرچھائیں' کافی مقبول ہوا۔ اس مجموعے میں شامل ڈرامے نہ صرف آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں بلکہ ان میں سے بیشتر اسٹیج بھی کیے جا چکے ہیں۔

محمد حسن ڈرامے کے فن پر جتنی گرفت رکھتے ہیں اتنا ہی بالیدہ ان کا تاریخی، تہذیبی اور سیاسی شعور بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ریڈیائی ڈرامے ہوں یا اسٹیج ڈرامے ان سب میں ان کا فنی و فکری شعور نمایاں ہے۔ 'پیسہ اور پرچھائیں' کے علاوہ 'میرے اسٹیج ڈرامے'، 'مور پنکھی'، 'کہرے کا چاند' ان کے ڈراموں کے مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ 'ضحاک' ان کا شاہکار ڈراما ہے جس میں شاہنامے کے ایک کردار کو آج کی صورت حال میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی اسٹیج کے تقاضوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ان کے ڈراموں کے پلاٹ میں کشمکش اور تصادم کا خاص درجہ ہوتا ہے۔ ان کے مکالمے چست، برجستہ اور رواں ہوتے ہیں۔ فکری لحاظ سے ان کے ڈراموں پر ترقی پسندی اور روشن خیالی کا گہرا رنگ ہے۔

ڈرامے کی صنف نے ہمارے زمانے میں ایک نئی معنویت حاصل کی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ آج کی زندگی کے مسائل اور زمینی سچّائیوں کی عکاسی کے لیے ڈراما زیادہ موزوں صنف ادب ہے۔ اسٹیج ڈرامے سے زیادہ عصر حاضر میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اعتبار حاصل کر لیا ہے۔ ہمارے بہت سے ممتاز لکھنے والوں نے ٹیلی ویژن اور ڈرامے کو ہی اپنی فنکاری کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن دونوں پر بہت دنوں تک ڈرامے لکھنے والوں میں اردو ادیبوں کی اکثریت تھی اور ان میں منٹو اور بیدی سے لے کر اپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس تک بہت سے معروف لکھنے والے شامل تھے۔ ان کے بعد لکھنے والوں میں رفعت سروش، عمیق حنفی، سلام مچھلی شہری، انور عظیم، شمیم حنفی، اظہر افسر وغیرہ کے نام خاص ہیں۔

باب 17

طنز و مزاح کی روایت

طنز و مزاح کو تخلیقی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ دونوں کی علاحدہ حیثیت ہے لیکن ان میں بعض باتیں مشترک ہیں اس لیے ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ ہوتا ہے۔

طنز ایک ایسا طرزِ اظہار ہے جس میں زندگی کے تضادات اور ناہمواریوں کو تیکھے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ طنز میں ایک طرح کی نشتریت ہوتی ہے۔ وہ برائیاں جو معاشرے میں پائی جاتی ہیں اور جنھیں لوگ روزمرّہ کا حصّہ تصور کر کے نظرانداز کر دیتے ہیں، طنز نگار اُن کو بڑے سلیقے سے بیان کر کے سماج کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح طنز نگار کا ایک مقصد معاشرہ کی اصلاح بھی ہوتا ہے۔

طنز ایک مشکل فن ہے۔ اس کا مقصد دل آزاری نہیں بلکہ اصلاح ہے۔ طنز کو خوشگوار بنانے کے لیے اکثر ادیبوں نے مزاح سے بھی کام لیا ہے۔ سماجی برائیوں اور انسانی کمزوریوں کو دلچسپ انداز میں پیش کرنے کا نام مزاح ہے۔ خالص مزاح میں برہمی یا تلخی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مزاح نگار کبھی حالات کو اور کبھی خود کو نشانہ بناتا ہے۔

شاعری:

اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت قدیم ہے۔ پہلا طنز و مزاح نگار شاعر جعفر زٹلّی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ سترھویں صدی کے اواخر اور اٹھارھویں صدی کے اوائل میں انھوں نے اردو شاعری میں طنز و مزاح کی بنیاد ڈالی۔ جعفر زٹلّی نے اپنے دور کی معاشی بدحالی اور حکمرانوں کی زیادتی پر مؤثر اور طنز آمیز اشعار لکھے۔

زٹلّی (1659-1713) : جعفر زٹلّی ذہین، تنک مزاج اور حاضر جواب انسان تھے۔ ان کی زبان میں بڑی کاٹ تھی۔ انھوں نے نہ صرف مزاحیہ اشعار کہے بلکہ اس میں طنز کو بھی شامل کیا۔

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی اتاری شرم کی لوئی، عجب یہ دور آیا ہے

جعفرؔ زٹلی کی مشہور نظموں میں 'بھوت نامہ' اور 'کھوا نامہ' شامل ہیں۔ یہ نظمیں نہایت دلچسپ اور یادگار تصور کی جاتی ہیں۔

سوداؔ (1706/07-1780/81) : اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں مرزا محمد رفیع سوداؔ کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سوداؔ نے ہجویات کے ذریعے اپنے دور کے معاشرے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ 'تضحیکِ روزگار' اس کی روشن مثال ہے۔ ان کی زیادہ ہجویں افراد سے تعلق رکھتی ہیں۔ کچھ ایسی بھی نظمیں ہیں جو انحطاطِ زمانہ اور سماجی ابتری سے متعلق ہیں۔ سودا کی طنزیہ و ہجویہ شاعری میں ان کے عہد کی تصویر نظر آتی ہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ مقامی بولیوں کے خوبصورت لفظوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ سودا نے 'گھوڑے' اور 'ہاتھی' کے پردے میں اپنے عہد کی معاشی زبوں حالی اور خزانوں کی تہی دستی کا بڑا عبرت ناک نقشہ کھینچا ہے۔ 'ہاتھی' جو اپنے قوی ہیکل کی وجہ سے 'طاقت' کا علامیہ ہے۔ محمد شاہی دور میں کس طرح ضعف و ناتوانی کی علامت بن جاتا ہے۔ اس کے ایک پہلو کی تصویر سودا کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:

ہوئی آقا پہ اس کے تنگ دستی — کیا کرتا ہے اب وہ فاقہ مستی
بدن پر اب نظر آتی ہے یوں کھال — طناب سُست سے خیمے کا جوں حال
نمودار اس طرح اب استخواں ہے — گویا ہر پسلی اُس کی نردبان ہے
نہ بیڑی ہے نہ کٹ بندھن نہ لنگڑا — رکھے ہے ناتوانی اس کو جکڑا
ضعیفی نے کی اُس کی فربہی گم — گیا ہاتھی نکل اور رہ گئی دُم

نظیرؔ اکبرآبادی (1735/40-1830) : نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں مزاح کے مقابلے میں طنز کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ عوامی زندگی سے بہت قریب رہے۔ لوگوں کے دکھ درد اور انسانی رشتوں کے تقاضوں کو انھوں نے بہت قریب سے محسوس کیا۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر کی شاعری میں انسانی رشتوں کی پامالی پر لطیف طنز ملتا ہے۔

مُفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر — دیتا ہے اپنی جان وہ اِک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر — جس طرح کتّے لڑتے ہیں ایک استخوان پر

ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

2019-20

اکبرالہ آبادی (1846-1921) : اکبرالہ آبادی اردو طنز ومزاح کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ان کے طنز ومزاح کا نشانہ اس عہد کا وہ تہذیبی بحران ہے جس نے مغربیت کے اثرات سے سماج میں ایک اتھل پتھل مچا رکھی تھی :

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں ۔۔۔ کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ہوئے اس قدر مہذّب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا ۔۔۔ کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

چلے ہیں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے ۔۔۔ وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

ظریف لکھنوی (1870-1937) : ان کا نام سیّد مقبول حسین تھا۔وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔اودھ پنچ کے شعرا میں ظریف لکھنوی کا اہم مقام ہے۔انھیں منظر نگاری میں مہارت حاصل تھی۔انھوں نے انسانوں کی نفسیاتی کیفیت اور معاشرتی عدم توازن کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔'الیکشن'، 'مشاعرہ' اور 'کربلا کا سفر نامہ' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

سید محمد جعفری (1907-1976) : سید محمد جعفری کی پیدائش پہرسر، بھرت پور میں ہوئی اور انتقال کراچی میں ہوا۔انھوں نے اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں سیاسی وسماجی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔جعفری کا سب سے بڑا کمال کلاسیکی زبان کو ظریفانہ اسلوب عطا کرنا ہے۔انھوں نے تضمین کے ذریعے مزاح پیدا کیا ہے۔اس کے علاوہ جعفری کو پیروڈی کے فن پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ابسٹریکٹ آرٹ کے عنوان سے ان کی نظم کا ایک شعر ہے :

نقشِ محبوب مصور نے سجا رکھا تھا ۔۔۔ میں نے دیکھا تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا

اقوام متّحدہ جیسی ذمّے دار تنظیم کی کارکردگی پر وہ اس طرح کی چوٹ کرتے ہیں:

یو این او کے پیٹ میں سارے جہاں کا درد ہے ۔۔۔ وعدۂ فردا پہ ٹرخانے کے فن میں فرد ہے

'الیکشن'، 'کلرک'، 'سفارش'، 'کھڑا ڈنر'، 'وزیروں کی نماز' اور 'موڈرن آدمی نامہ' سید محمد جعفری کی بہترین پیروڈیاں ہیں۔

فرقت کاکوروی (1910/14-1973) : فرقت کاکوروی کا نام غلام احمد تھا۔ان کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ان کے طنز ومزاح میں سنجیدگی کا عنصر کم ہے۔انھوں نے جدید شاعری، خاص طور پر آزاد نظم کا مذاق اڑایا ہے۔ان کا شعری مجموعہ 'ناروا' ہے، جو انھوں نے ن۔م۔راشد کے پہلے شعری مجموعے 'ماورا' کے جواب میں لکھا تھا۔انھوں نے چند موضوعاتی نظمیں بھی لکھی ہیں۔لیکن مجموعی طور پر وہ پیروڈی نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ان پیروڈیوں میں لفظ ومعنی کی بے ربطی اور فنی بے راہ روی کو نشانہ بنایا ہے۔شاعری پر طنز کی مثال ان کا شعری مجموعہ ''قدمچے'' ہے۔

سید ضمیر جعفری (1916-1999) : سید ضمیر جعفری نے طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ذریعے سماجی زندگی کے تضادات کو پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں طنز کے مقابلے میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔ انھوں نے بعض طنزیہ موضوعات کو بھی اس طرح بیان کیا ہے کہ مزاح کا لطف دیتے ہیں۔ ان کی مزاحیہ غزلوں میں شوخی اور شگفتگی کا رجحان زیادہ نظر آتا ہے۔ ان کی کتاب 'مافی الضمیر' اور 'ولایتی زعفران' شائع ہو چکی ہیں۔

دلاور فگار (1928-1991) : دلاور فگار بدایوں کے رہنے والے تھے۔ عمر کے آخری دور میں وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔ ان کے موضوعات میں رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر دلاور فگار نے طنز کیا ہے۔ انھوں نے اکثر اپنے قطعات اور منظومات میں اخبار کی خبروں کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تحریف وتضمین اور انگریزی الفاظ کی پیوند کاری سے بھی خوب فائدہ اٹھایا ہے۔

شاعروں نے رات بھر بستی میں واویلا کیا — داد کے ہنگامے سے سارا محلّہ ڈر گیا
اک ضعیفہ اپنے بیٹے سے یہ بولی اگلے روز — رات کیسا شور تھا کیا کوئی شاعر مر گیا

لوگ دل دیتے ہیں بیٹی اور بیٹا دیکھ کر — میں یہ شادی کر رہا ہوں ''بایوڈیٹا'' دیکھ کر

رضا نقوی واہی (1939-2002) : رضا نقوی واہی امروہہ کے رہنے والے تھے۔ لیکن ان کی عمر کا بڑا حصّہ پٹنہ میں گزارا، وہیں ان کا انتقال ہوا۔ آزادی کے بعد کے مزاح نگار شعرا میں ان کا نمایاں مقام ہے۔ انھوں نے طنز اور مزاح دونوں میں یکساں طور پر اپنی ظرافت اور تخلیقی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات میں سیاست، سماج، نظامِ تعلیم، شاعری، ادب، مذہب اور خانگی امور شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی پیروڈی میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔ وہ تضمین کے فن پر اچھی گرفت رکھتے ہیں۔ ان کی ایک مشہور نظم 'پی۔ ایچ۔ ڈی' کے عنوان سے ہے۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

واہی نے نظیر اکبرآبادی کی مشہور نظم 'آدمی نامہ' کی پیروڈی 'پروفیسر نامہ' کے عنوان سے پیش کی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے:

وہ بھی کہ جس کے علم کی پونجی قلیل ہے — وہ بھی جو راہِ علم میں اک سنگِ میل ہے
وہ بھی ہے لکچرر جو ادیبِ جمیل ہے — وہ بھی ہے لکچرر کہ جو خانِ خلیل ہے
جو اس کی فاختہ ہے سو ہے وہ بھی لکچرر

اس عہد کے شعرا میں احمق پھپھوندوی (مصطفیٰ خاں مدّاح)، شوقؔ بہرائچی، راجہ مہدی علی خان، رئیسؔ امروہوی، شوکت تھانوی، ہلالؔ رضوی، سگارؔ لکھنوی، ظریفؔ جبلپوری، گرگٹؔ حیدرآبادی، بوگسؔ حیدرآبادی، مسٹرؔ دہلوی، ناظمؔ انصاری، ساغرؔ خیامی وغیرہ شامل ہیں۔ ان شعرا نے سیاست کی منافقت، قوم کے رہنماؤں کے منفی کردار، بین الاقوامی سیاسی صورت حال، نظامِ تعلیم کی خرابیاں، معاشی بدحالی، بے روزگاری، روزمرہ کی ضروریات، سڑکوں کی حالتِ زار، شادی بیاہ کے مسائل، بکھرتے ہوئے خاندانی نظام، ادب کی بے مقصدیت، اساتذہ، طلباء اور علمی اداروں کی زبوں حالی، مذہبی و خانگی مسائل، غرض مختلف موضوعات پر عمدہ نظمیں کہی ہیں۔

نثر میں طنز و مزاح کی روایت:

اردو نثر میں طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش اردو داستانوں میں ملتے ہیں۔ اس کے بعد غالب کی تحریروں سے طنز و مزاح کی ایک نئی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اکثر خوش کرنے والی باتیں لکھتے ہیں اور سنجیدہ باتوں کو بھی اپنے اندازِ بیان سے پُرلطف بنا دیتے ہیں۔ ان کے فنِ مزاح کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اکثر خود کو تمسخر کا نشانہ بنایا ہے۔

اودھ پنچ کی خدمات:

غالب کے بعد نثر میں باقاعدہ مزاح نگاری کی مثال 'اودھ پنچ' میں ملتی ہے۔ منشی سجّاد حسین (1856-1915) کے اخبار 'اودھ پنچ' نے عوام میں طنز و مزاح کا ذوق عام کیا۔ اس اخبار نے متعدد اہم مزاح نگار پیدا کیے۔ ظرافت نگاروں میں رتن ناتھ سرشارؔ، مرزا مچھو بیگ ستم ظریفؔ، بابو جوالا پرشاد برقؔ، احمد علی شوقؔ، سجاد حسین، منشی احمد علی کسمنڈوی اور نواب سید محمد آزادؔ اہمیت کے حامل ہیں۔ اودھ پنچ میں شائع ہونے والی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں میں اس عہد کی مکمل صورتِ حال دکھائی دیتی ہے۔ اس عہد کی تہذیبی کشمکش کے بیان کی وجہ سے ان کی تحریریں اپنے عہد کا مرقّع معلوم ہوتی ہیں۔

'اودھ پنچ' کے لکھنے والوں میں سرشار کی خاص اہمیت ہے۔ انھوں نے صحافتی مضامین کے علاوہ 'فسانۂ آزاد' بھی لکھا۔ جس میں لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب پر چبھتی ہوئی پھبتیاں اور طنزیہ نشتر آزمائے گئے۔ اس میں مزاح اور طنز کی آویزش سے ظرافت کے کئی رنگ بکھیرے گئے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال فسانۂ آزاد کا لازوال کردار 'خوجی' ہے جو ایسے بے ساختہ جملے ادا کرتا ہے جن میں طنز کے ساتھ مزاح کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ خوجی کے بالمقابل آزاد بھی ان کا اہم کردار ہے۔ آزاد کے یہاں خوجی جیسا پھکڑ پن اور سوقیانہ لب و لہجہ نہیں بلکہ اس کے اندازِ گفتگو میں گہرا طنز ہوتا ہے۔ سرشار کے یہ دونوں کردار اس دور کے زوال آمادہ معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

بیسویں صدی میں طنز ومزاح:

بیسویں صدی میں طنز ومزاح کی روایت کو زیادہ فروغ ملا۔ اس دور میں طنز ومزاح لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں سید محفوظ علی بدایونی، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، قاضی عبدالغفار، امتیاز علی تاج، ملّا رموزی، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اس عہد میں طنز ومزاح کے کئی نئے اسالیب بھی وجود میں آئے۔ کئی نئے نئے پیرائے تخلیق ہوئے اور نئے نئے موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی۔ طنز ومزاح کا عنصر محض چند اصناف تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ مزاحیہ ناول، مزاحیہ افسانے اور مزاحیہ خاکے بھی لکھے گئے۔ کئی سنجیدہ ادیبوں نے بھی طنز ومزاح کی طرف توجہ کی۔ جس سے طنز ومزاح کے سرمائے میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور اس کا وقار بلند ہوا۔

فرحت اللہ بیگ (1883/84-1946/47): مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی طبیعت میں شوخی اور چلبلا پن تھا۔ ساتھ ہی قوم کا درد بھی تھا۔ ان ملی جلی کیفیتوں کی وجہ سے ان کے یہاں شوخی اور سنجیدگی دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ اپنی خوش مذاقی کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ 'پھول والوں کی سیر'، 'نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' اور 'نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکّر' ان کے مزاح پارے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ سیدھے سادے خیالات کو ہنسی مذاق کے ساتھ بیان کرنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی ظرافت نگاری اور بھی دلچسپ ہو گئی ہے۔

رشید احمد صدیقی (1892/96-1977): مزاح کو زیرِ لب تبسّم سے قہقہوں تک پہنچانے والے مزاح نگاروں میں ایک اہم نام رشید احمد صدیقی کا ہے۔ ان کے طنز میں کہیں کہیں شِدّت تو پائی جاتی ہے مگر دل آزاری نہیں ہوتی۔ زندگی کے ایسے معمولی معمولی واقعات جنھیں ہم غیر اہم سمجھ کر سرسری طور سے گزر جاتے ہیں، رشید احمد صدیقی انھیں میں مزاح کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ادبی ذوق کا ہونا ضروری ہے۔ تاریخ، تہذیب، سیاست، سائنس اور جدوجہدِ آزادی ان کے اہم موضوعات ہیں۔ مختلف پیشہ ور افراد کی کوتاہیوں اور ان کی سرگرمیوں کو بھی انھوں نے طنز ومزاح کا موضوع بنایا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے اپنی بعض تحریروں میں دیہاتی معاشرت، دیہاتی سادہ لوحی اور زبان سے مزاح کے پہلو کو بڑی خوبی سے ابھارا ہے۔ 'خنداں'، 'آشفتہ بیانی میری'، 'مضامینِ رشید' ان کی مزاحیہ تصانیف ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی (1941-1895) : عظیم بیگ چغتائی کی پیدائش آگرہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ان کے مزاح میں ان کا بچپن نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں شور شرابہ، اچھل کود اور شرارتوں کی معصومانہ تصویر کشی کی ہے۔ 'شریر بیوی'، 'کولتار' اور 'خانم' وغیرہ تخلیقات میں ان کی ظرافت کے کئی پہلو موجود ہیں۔

ملّا رموزی (1952-1896/99) : اردو میں گلابی اردو کے موجد مُلّا رموزی ہیں۔ ان کا نام صدیق ارشاد تھا۔ وہ بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ثانوی تعلیم انھوں نے کانپور کے مدرسۂ الٰہیات میں حاصل کی۔ انھوں نے آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لیا۔ وہ انگریزی حکومت کے خلاف مزاحیہ مضامین لکھتے تھے۔ انھوں نے 'گلابی اردو' کے عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی تھی۔ گلابی اردو کا طرز منفرد ہے۔ گلابی اردو میں جملے کی اردو ساخت فاعل+مفعول+فعل کے بجائے فعل+ فاعل+مفعول کی صورت میں لائی گئی ہے۔ یہ ترتیب عربی قاعدے کے مطابق ہے۔ اسے پڑھتے وقت انوکھا پن محسوس ہوتا ہے اور لبوں پر بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ ملّا رموزی نے اسی طرز میں کئی مضامین لکھے ہیں۔ ان کے مضامین میں ظرافت کے ساتھ طنز کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے گلابی اردو میں شاعری کی ہے جس کا مجموعہ 'گلابی شاعری' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

پطرس بخاری (1958-1898): ان کا نام سیّد احمد شاہ بخاری تھا۔ وہ پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پشاور ہی میں مکمل کرنے کے بعد انھوں نے لاہور سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر ہوگئے۔ بعد میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے اور کئی بڑے عہدوں پر مامور رہے۔ 1955 میں انھیں اقوام متحدہ (U.N.O.) کے شعبۂ اطلاعات کا جنرل سکریٹری بنا دیا گیا تھا۔ نیویارک میں ان کی وفات ہوئی۔

پطرس نے اپنی تحریروں میں انگریزی ادب سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے واقعہ، کردار اور لفظوں کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کیا۔ ان کے مزاح کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو مزاح کا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے مزاح میں طنز کا پہلو بھی چھپا ہوتا ہے لیکن اس میں تلخی نہیں ہوتی۔ پطرس نے بہت زیادہ نہیں لکھا لیکن انھوں نے جتنا بھی لکھا وہ اپنی جگہ مسلّم اور معیاری تحریریں ہیں۔ پطرس بخاری اردو مزاح نگاری میں ایک نئے اسلوب اور نئے طرز کے بانی بھی ہیں اور عہد ساز بھی۔ ان کے اسلوبِ مزاح نے کئی دوسرے مزاح نگاروں پر گہرے اثرات قائم کیے ہیں۔

واقعہ نگاری ہی پطرس کی بنیادی خصوصیت ہے۔ ان کے مضامین 'مرید پور کا پیر'، 'مرحوم کی یاد میں' اور 'سویرے جو کل آنکھ میری کھلی' واقعہ نگاری کی دل چسپ مثال ہیں۔ 'کتّے'، 'سنیما کا عشق'، 'لاہور کا جغرافیہ'، 'ہاسٹل میں پڑھنا' اور 'میں ایک میاں ہوں' وغیرہ ان کی مشہور تحریریں ہیں۔

شوکت تھانوی (1963-1904/05) : ان کا نام محمد عمر اور ان کا آبائی وطن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر تھا۔ اسی مناسبت سے وہ تھانوی لکھتے تھے۔

شوکت تھانوی کو نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کے یہاں موضوعات کی رنگا رنگی ملتی ہے۔ بنیادی طور پر وہ مزاح نگار تھے۔ طنز کے فن کو وہ کم ہی بروئے کار لاتے ہیں۔ ان کی مقبولیت میں ان کی صحافتی زبان کا خاصا حصّہ رہا ہے۔ ان تحریروں میں بے ساختگی اور بے تکلفی کا وہی انداز پایا جاتا ہے جس کا استعمال لوگ گفتگو کے دوران کرتے ہیں۔ شوکت تھانوی نے مزاحیہ خاکے، انشائیے اور ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''غم غلط'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا۔ اس میں معاشرے اور سیاست پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ انھوں نے اپنی تضمینوں اور پیروڈیوں میں انگریزی الفاظ کا نہایت برجستہ استعمال کیا ہے۔

'موجِ تبسم'، 'بحرِ تبسم'، 'سیلابِ تبسم'، 'طوفانِ تبسم'، 'کارٹون'، 'جوڑ توڑ'، 'سودیشی ریل' اور 'سسرال' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ شوکت تھانوی نے ریڈیو ڈرامے اور خاکے بھی لکھے ہیں۔ 'شیش محل' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔

کنھیّا لال کپور (1980-1910) : کنھیا لال کپور، ضلع لائل پور پنجاب میں پیدا ہوئے۔ لاہور سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ بعد میں مقامی کالج میں انگریزی کے استاد ہو گئے۔ تقسیمِ وطن کے بعد وہ ہندوستان چلے آئے اور یہاں بھی درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ سبک دوشی کے بعد اپنے بیٹے کے پاس پونا منتقل ہو گئے۔ وہیں سے برسوں روزنامہ 'ہندسماچار' کے لیے مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ 1980 میں پونا ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

کنھیا لال کپور انتہائی ذہین اور طبّاع انسان تھے۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ ان کی مزاح نگاری میں پطرس کی ذہانت کی جھلک ملتی ہے۔ انگریزی ادب سے دونوں متاثر تھے۔ کنھیا لال کپور کے یہاں طنز کا وار بھی کاری ہوتا ہے۔ بظاہر ان کی تحریر سیدھی سادی معلوم ہوتی ہے، لیکن لفظوں کے پیچھے طنز و مزاح کی لہریں رواں دواں رہتی ہیں۔ ان کے موضوعات میں حیرت انگیز تنوّع ہے۔ وہ اکثر سماجی خرابیوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ شاعر ہو یا لیڈر، عورت ہو یا ایکٹر، ہر ایک کی بے راہ روی پر کنھیا لال کپور کی نظر پڑتی ہے، اور وہ ان کی حماقتوں کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن ادبیت کی شان ہر جگہ موجود ہے۔ انھوں نے غالبؔ کے کئی اشعار کی پیروڈی بھی کی ہے۔ ان کے

مضامین 'چینی شاعری'، 'غالب جدید شعرا کی مجلس میں'، 'برج بانو'، 'اہل زبان' اور 'کامریڈ شیخ چلّی' قابل ذکر ہیں۔ ان کی تحریریں اپنے مخصوص لب و لہجے اور منفرد اسلوب کے لیے مشہور ہیں۔

'سنگ و خشت'، 'چنگ و رباب'، 'نوک نشتر'، 'بال و پر'، 'شیشہ و تیشہ' اور 'کامریڈ شیخ چلی' ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی (2018-1923/25) : مشتاق احمد یوسفی کی پیدائش ٹونک، راجستھان میں ہوئی۔ وہ الفاظ کے انوکھے اور دل چسپ استعمال سے مزاح پیدا کرنے کے فن میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنے کے علاوہ اشعار اور مصرعوں کے برمحل اور برجستہ استعمال سے ہنسنے ہنسانے کا سلیقہ بھی انھیں خوب آتا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر سنجیدہ اشعار اور مصرعوں، کہاوتوں اور محاوروں میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے یا اپنی اصلی صورت میں ایسے سیاق و سباق کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والا یک لخت ہنسی کا فوّارہ چھوڑ دیتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا یہی عمل ان کے انشائیوں میں شگفتگی اور دل آویزی پیدا کرتا ہے۔ ان کی تحریر میں ایسی اپنائیت ہوتی ہے کہ قاری بلا تکلّف اُن کے قہقہوں میں شریک ہو جاتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی الفاظ کے مزاج داں ہیں۔ لہجے کے اُتار چڑھاؤ اور نزاکتوں سے خوب کام لیتے ہیں۔ 'چراغ تلے'، 'خاکم بدہن'، 'زرگزشت'، 'آبِ گم' ان کی مشہور مزاحیہ کتابیں ہیں۔

ابن انشا (1978-1926) : ابنِ انشا کا نام شیر محمد خاں تھا۔ وہ ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ابنِ انشا اردو میں مزاحیہ سفرناموں کے بنیاد گزار ہیں۔ انھوں نے سفر کے تجربات اور غیر ملکوں میں مسافروں کے ساتھ ہونے والے واقعات کے بیان سے ہی مزاح پیدا کیا ہے۔ ان کے جملے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بے ساختگی ہوتی ہے۔ ان کے طنز میں بلا کی شدّت ہوتی ہے لیکن ظرافت کی آمیزش سے وہ اسے خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ 'اردو کی آخری کتاب'، 'خمارِ گندم'، 'ابن بطوطہ کے تعاقب میں' ان کی بعض مشہور کتابیں ہیں۔

مجتبیٰ حسین (پ- 1936) : مجتبیٰ حسین کی پیدائش گلبرگہ میں ہوئی۔ موجودہ دور کے مزاح نگاروں میں مجتبیٰ حسین قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز روزنامہ سیاست میں مزاحیہ کالم نگاری سے کیا۔ ان کے مزاحیہ خاکوں کے تین مجموعے، دو مزاحیہ سفرنامے اور مزاحیہ مضامین کی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے زندگی اور اس کے مظاہر کو ایک عام آدمی کی نظر سے دیکھا ہے۔ ان کے مضامین زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا مرقع ہیں۔

اسی طرح مشفق خواجہ، کرنل محمد خاں، کرنل شفیق الرحمٰن، احمد جمال پاشا، یوسف ناظم، انجم مان پوری، محمد خالد اختر اور شفیقہ فرحت نے بھی گلستانِ ادب میں طنز و مزاح کے پھول کھلائے ہیں۔

باب 18

تحقیق کی روایت

'تحقیق' سچائی کی دریافت کو کہتے ہیں۔ ادب میں تحقیق سے مراد یہ ہے کہ ادب سے متعلق نئی حقیقتوں کو دریافت کیا جائے یا معلوم حقیقتوں کی ازسرِ نو چھان بین کی جائے۔ ان معاملات سے سروکار رکھنے والوں کو 'مُحقِّق' کہتے ہیں۔

تحقیق کی کچھ بنیادی شرائط ہیں۔ ان میں پہلی شرط یہ ہے کہ کوئی بیان یا کوئی روایت حوالے کے بغیر قبول نہ کی جائے اور حوالہ سامنے آئے تو اس کی چھان بین کی جائے کہ یہ معتبر ہے یا غیر معتبر۔ اس تحقیق کے بعد معتبر بیانات و روایات کو قبول کر لیا جائے اور غیر معتبر کو رد کر دیا جائے۔ اسی سلسلے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ کسی مسئلے سے متعلق اگر کئی بیانات اور روایات جمع ہو جائیں اور ان میں آپس میں اختلاف ہو تو آنکھ بند کر کے کسی ایک روایت کو قبول نہ کیا جائے بلکہ غور و فکر کر کے شواہد و قرائن کی روشنی میں یہ طے کیا جائے کہ ان میں کون سا بیان صحیح ہے اور کس کو رد کر دینا مناسب ہے؟

تحقیق کی دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ نتیجے تک پہنچنے میں جلد بازی نہ کی جائے۔ جو مسئلہ بھی زیرِ بحث ہو، اس کے تمام پہلوؤں پر اطمینان کے ساتھ غور کیا جائے اور موافق و مخالف دونوں طرح کے دلائل سامنے رکھے جائیں۔ اس کے بعد ہی کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

تحقیق کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں کسی نقطۂ نظر یا کسی شخص یا کسی علاقے کی طرف داری سے مکمّل طور پر بچا جائے کیونکہ جانب داری تحقیق کو غیر معتبر بنا دیتی ہے۔ ادبی تحقیق کی تین اہم قسمیں ہیں:

(1) تاریخی تحقیق (2) سوانحی تحقیق (3) تدوینی تحقیق

تاریخی تحقیق میں ادب کے کسی خاص عہد، صنف یا واقعے سے سروکار رکھا جاتا ہے۔ سوانحی تحقیق میں کسی خاص شخص یا اشخاص کی سوانح معتبر اور مستند حوالوں کی مدد سے قلم بند کی جاتی ہے۔ تدوینی تحقیق میں کسی شاعر کے مجموعۂ کلام یا لسانی و ادبی اہمیت کی حامل کسی نثری کتاب کو تدوین کے اصولوں کے مطابق مرتّب کیا جاتا ہے۔ اس میں کوشش یہ کی جاتی ہے کہ متن یعنی دیوان یا کتاب کو شاعر یا مصنف کے منشا کے مطابق مرتّب کر دیا جائے۔ اس عمل کو تدوینِ متن بھی کہتے ہیں۔

اردو میں با قاعدہ ادبی تحقیق کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا۔ تاہم اس کے ابتدائی نقوش انیسویں صدی میں ابھرنے لگے تھے۔ اس سے قبل اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج عام تھا۔ ان تذکروں میں بھی تحقیقی عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ لیکن تذکروں میں تحقیق کا وہ معیار نہیں تھا جو بیسویں صدی میں نظر آتا ہے۔

محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' لکھ کر ادبی تاریخ نگاری کی ابتدا کی جس سے آئندہ محققین نے استفادہ کیا۔ 'آزاد کی 'سخن دانِ فارس' بھی اردو میں لسانی تحقیق کے تعلق سے ایک اہم کتاب ہے۔ بیسویں صدی میں شعرا کے کلام، ان کے دیوان اور کلّیات کی ترتیب وتلاش پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ اس عہد تک وؔلی دکنی کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر مانا جاتا تھا لیکن 'کلّیاتِ قلی قطب شاہ' کی بازیابی کے بعد ولی کی اوّلیت ختم ہوگئی۔

مسعود حسن رضوی ادیب نے 'دیوانِ فائز' مرتّب کیا اور فائز کو شمالی ہند کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا۔ تاہم کلیاتِ جعفر زٹلی اور دیوانِ حاتم کی اشاعت کے بعد مسعود حسن کا یہ دعویٰ قابلِ قبول نہیں رہا۔

اس عہد میں غالب سے متعلق تحقیقات پر خصوصی توجہ کی گئی۔ نسخۂ بھوپال کی بازیابی کے بعد دیوانِ غالب کی تاریخی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا۔ امتیاز علی خاں عرشی اور مالک رام نے دیوانِ غالؔب کی ترتیب کا اہم کام انجام دیا کیا۔ مولوی عبدالحق نے شعرائے اردو کے کئی تذکرے اور شاعروں کے دیوان مرتب کیے۔ پروفیسر شیرانی نے قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ 'مجموعۂ نغز' ترتیب دیا۔ انھوں نے 'پنجاب میں اردو' لکھ کر اردو میں لسانی تحقیق کی روایت کو استحکام عطا کیا۔ قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، گیان چند اور رشید حسن خاں نے بھی تحقیق کے سلسلے میں اہم کام انجام دیے۔

عبدالحق (1961-1870): مولوی عبدالحق کی پیدائش ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ مزید تعلیم کے حصول کے لیے وہ ایم۔ اے۔ او کالج، علی گڑھ گئے۔ یہاں انھیں سرسیّد، مولانا حالی اور محسن الملک جیسے بلند پایہ ادیبوں سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد وہ ملازمت کی تلاش میں حیدرآباد چلے گئے اور ایک اسکول میں مدّرس مقرر ہوئے۔ ترقی کرتے کرتے انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اسی زمانے میں انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری منتخب ہوئے۔ کچھ عرصے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ سے وابستہ رہے پھر اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوگئے۔ اس کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں صدر ہوگئے۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد وہ دہلی آگئے اور یہاں پوری طرح انجمن ترقی اردو کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ آزادی کے بعد وہ کراچی چلے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات کے اعتراف میں الہ آباد یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ انھوں نے تحقیقی و علمی کاموں اور اردو کی ترقی کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا اسی لیے انھیں 'بابائے اردو' کہا جاتا ہے۔

قدیم اردو ادب کا جو سرمایہ مخطوطات کی شکل میں یہاں وہاں بکھرا ہوا تھا، مولوی عبدالحق نے اسے جمع کیا اور ترتیب دے کر شائع کیا۔ انھوں نے اردو کی بہت سی قدیم کتابیں دریافت کیں جیسے 'سب رس' اور ان پر تفصیل سے مقدمے لکھے۔ ہر کتاب کے مقدمے میں انھوں نے اس کتاب کی اہمیت، مصنف کے حالاتِ زندگی، ادبی خدمات اور اس عہد کی ادبی خصوصیات واضح کیں۔ اس طرح اردو تحقیق کے لیے مضبوط بنیاد فراہم ہوئی۔ مولوی عبدالحق نے انگریزی اردو لغت مرتّب کی اور اردو قواعد کی ترتیب کا گراں قدر کام بھی انجام دیا۔ انھوں نے ایک رسالہ 'اردو' بھی نکالا جس میں تحقیقی و علمی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

'مقدماتِ عبدالحق'، 'خطباتِ عبدالحق' اور 'تنقیداتِ عبدالحق' میں ان کے تحقیقی مضامین اور مقدمے شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی اور اردو میں خاکوں کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ 'چند ہم عصر' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ مولوی عبدالحق کی زبان سادہ، رواں اور آسان ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں، روزمرّہ اور محاورات کے استعمال سے انھوں نے اپنی تحریروں میں لطف پیدا کیا ہے اسی لیے انھیں صاحبِ طرز ادیب بھی کہا جاتا ہے۔

محمود شیرانی (1946-1880): حافظ محمود شیرانی کا وطن ٹونک (راجستھان) تھا۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے جودھ پور میں حاصل کی اور ینٹل کالج لاہور سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور لندن سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں انھیں نوادرات جمع کرنے کا شوق ہوا۔ اس کام میں اس قدر مہارت بہم پہنچائی کہ نوادرات کا کاروبار کرنے والی لندن کی ایک کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ 1922 میں اسلامیہ کالج لاہور میں لکچرر مقرر ہوئے۔

محمود شیرانی نے اردو میں تحقیق اور تدوینِ متن کے نئے معیار قائم کیے۔ ان کی تحقیقات سے نئے نئے ادبی و تاریخی حقائق سامنے آئے۔ اردو زبان کے آغاز سے متعلق ان کی تحقیق 'پنجاب میں اردو' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے دلیلوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کا آغاز پنجاب سے ہوا۔ شیرانی کے اس نظریے سے محققین نے اکثر اختلاف کیا ہے تاہم اس نظریے کی اب بھی بڑی اہمیت ہے۔ انھوں نے 'خالق باری' کے متن کی تحقیق اور اس کے مصنف کے بارے میں نئے انکشاف کیے۔ قدرت اللہ قاسم کے تذکرے 'مجموعۂ نغز' اور 'پرتھوی راج راسو' کو مرتب کر کے شائع کیا۔ فارسی ادب کے تعلق سے 'فردوسی' اور اس کے 'شاہنامہ' پر تحقیقی مقالے لکھے۔ 'تنقیدِ شعرالعجم' لکھ کر محققین میں ذمّے داری کا احساس پیدا کیا۔ انھوں نے قدیم کتب کی تدوین کے ضمن میں پہلی مرتبہ داخلی شہادتوں کو اہمیت دی۔ ان کی زبان شگفتہ اور رواں ہے۔

نصیرالدین ہاشمی (1895-1964) : نصیرالدین ہاشمی حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا سب سے وقیع کارنامہ 'دکن میں اردو' ہے۔ نصیرالدین ہاشمی کی یہ کتاب ایک مستقل کتابِ حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نصیرالدین ہاشمی کا ایک اور اہم تحقیقی کارنامہ 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ' کی دریافت ہے۔ سیف الملوک و بدیع الجمال، نثری طوطی نامہ، قصۂ ابوشحمہ اور ظفر نامہ کو روشناس کرانے کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے۔

نصیرالدین ہاشمی کی دوسری اہم تصانیف میں 'دکنی کلچر'، 'المجوب'، 'دکنی ہندو اور اردو' اور 'یوروپ میں دکنی مخطوطات' بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی کی زندگی دکنی زبان و ادب کی تحقیق اور خدمات کے لیے وقف تھی۔ انھوں نے جو بنیادیں وضع کی تھیں، بعدازاں دکنی زبان و ادب کی تحقیق کی عظیم عمارت کا ایک بڑا حصّہ انھیں پر استوار ہے۔

قاضی عبدالودود (1896-1984): قاضی عبدالودود کی پیدائش کاکو، ضلع گیا، بہار میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پٹنہ سے میٹرک کا امتحان پرائیوٹ طور پر پاس کرنے کے بعد انھوں نے پٹنہ کالج سے بی۔ اے کیا۔ بعد میں وہ انگلستان گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے اقتصادیات میں ٹرائی پوس کیا۔ پھر یہیں سے قانون کی تعلیم مکمل کی اور وطن واپس آکر وکالت کرنے لگے۔ علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں سے بے حد لگاؤ تھا، اس لیے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ رجحان رہا۔

قاضی عبدالودود نے اردو میں تحقیق کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ ان کے اہم تحقیقی کارناموں میں 'غالب بحیثیت محقق'، 'جہانِ غالب'، 'آوارہ گرد اشعار'، 'عیارستان' اور 'تعینِ زمانہ' شامل ہیں۔ انھوں نے 'دیوانِ جوشش'، اور 'دایونِ رضا' مرتّب کر کے شائع کیے۔ انھوں نے پٹنہ سے ایک تحقیقی رسالہ 'معاصر' بھی نکالا۔ تحقیقی موضوعات کے تعلق سے ان کی زبان خالص علمی ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی (1904-1981): مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی پیدائش رامپور میں ہوئی۔ پہلے یہاں کی مشہور درس گاہ مطلع العلوم سے اور بعد میں مدرسۂ عالیہ سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور رامپور کی رضا لائبریری سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں موجود نادر و نایاب کتابوں سے خود فیض یاب ہوئے اور علمی دنیا کو بھی اس نایاب ذخیرے کی طرف متوجہ کیا۔

امتیاز علی خاں عرشی کا خاص میدان تدوینِ متن ہے۔ انھوں نے دیوانِ غالب کو زمانی اعتبار سے مرتب کیا جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا کون سا کلام کس زمانے کا ہے۔ اس سے غالب کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ عرشی کا مرتب کردہ یہ دیوان نسخۂ عرشی کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے احمد علی خاں یکتا کے تذکرے 'دستور الفصاحت' کو بھی مرتّب کیا۔ اس کے علاوہ تحقیقی موضوعات پر کئی مضامین تحریر کیے۔ 'نادراتِ شاہی' بھی ان کا ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے۔

مالک رام (1906-1993): مالک رام پھالیہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور چلے گئے۔ وہیں سے ایم۔اے اور وکالت کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بعد میں عربی زبان میں بھی اچھی دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ حکومت ہند کی وزارتِ تجارت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اس سلسلے میں مصر اور دوسرے ممالک میں بھی وہ مدتوں قیام پذیر رہے۔ دہلی میں وفات پائی۔

مالک رام کا شمار ممتاز محققین میں کیا جاتا ہے۔ اردو میں وہ ماہر غالبیات کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف 'غبارِ خاطر' اور 'تذکرہ' کو انھوں نے تدوین کے جدید اصولوں کے مطابق مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ 'تلامذۂ غالب'، 'ذکرِ غالب'، 'تذکرۂ معاصرین'، 'تحقیقی مضامین' اور 'تذکرۂ ماہ وسال' ان کی اہم کتابیں ہیں۔ مختارالدین احمد کے اشتراک سے کربل کتھا کی تدوین بھی ان کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔

مالک رام کو ادبی صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ ابتدا میں وہ آریہ گزٹ، نیرنگِ خیال اور بھارت ماتا کے شعبۂ ادارت سے وابستہ رہے۔ بعد میں مدتوں تحقیقی سہ ماہی رسالہ 'تحریر' نکالتے رہے۔ انھیں اسلامیات سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ 'عورت اور اسلام' ان کی مقبول کتاب ہے۔ 'اسلامیات' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

گیان چند جین (1923-2007): گیان چند جین سیوہارہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ گیان چند اردو کے استاد ہی نہیں ایک معروف محقق بھی تھے۔ ماہرِ لسانیات کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ 'اردو کی نثری داستانیں'، 'اردو مثنوی شمالی ہند میں'، 'تفسیرِ غالب'، 'رموزِ غالب'، 'لسانی مطالعے'، 'عام لسانیات' تجزیے اور ذکر وفکر ان کی اہم کتابیں ہیں۔

'تحقیق کے فن' میں انھوں نے تحقیق کے عمل، ادب میں تحقیق کی اہمیت اور ضرورت کے علاوہ تحقیق کی طریق کار کو بھی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ گیان چند کا ایک اور دستاویزی کام تاریخِ ادبِ اردو 1700 تک ہے جسے انھوں نے سیّدہ جعفر کے اشتراک سے انجام دیا تھا۔ اردو تحقیق کی تاریخ میں گیان چند ایک بلند مرتبے کے حامل ہیں۔

رشید حسن خاں (1925/30-2006): رشید حسن خاں کی پیدائش شاہجہاں پور، یو پی میں ہوئی۔ انھوں نے تحقیق کے مرّوجہ اصولوں کی توضیح کی اور اس میں قابلِ قدر اضافے کیے۔ علمی تحقیق کے ضمن میں حوالوں اور استناد کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے انھوں نے حوالوں سے متعلق اصول وضوابط پیش کیے اور ان کے معیاری ہونے کی شرائط بیان کیں۔ قدیم کتابوں کے متن میں غلطیوں کی نشاندہی کی اور تدوین کے آداب کی پابندی پر زور دیا۔

انھوں نے صحتِ متن پر خصوصی توجہ دی اور کئی قدیم کتابوں جیسے 'گلزارِ نسیم'، 'باغ وبہار'، 'فسانۂ عجائب' اور 'مثنویاتِ شوق' وغیرہ کو نئے اصولوں کے تحت ترتیب دے کر شائع کیا۔ رشید حسن خاں نے قواعد، تلفّظ، املا اور لغات

پر بھی خصوصی توجہ کی اور ان موضوعات پر تحقیقی کتابیں شائع کیں۔ ان کی زبان سادہ اور دلکش اور شگفتہ ہے۔ ’اردو املا‘ اور ’زبان وقواعد‘ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

عبدالقوی دسنوی (2011-1930) : عبدالقوی دسنوی کی پیدائش دسنہ، بہار میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم دسنہ، آرا اور اعلیٰ تعلیم ممبئی میں حاصل کی۔ شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال میں پروفیسر کے عہدہ سے 1990 میں سبکدوش ہوئے۔ وہ کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ بحیثیت محقق و نقاد انھوں نے مختلف موضوعات پر متعدد تحقیقی، تنقیدی مقالات تحریر کیے اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔

غالب، اقبال، ابوالکلام آزاد اور اشاریہ سازی ان کے خاص موضوعات ہیں۔ ابوالکلام آزاد پر انھیں اختصاص حاصل تھا۔ مولانا آزاد کی شخصیت اور ادبی خدمات سے متعلق کئی اہم کتابیں تصنیف کرنے کے سبب ان کا شمار ماہر آزاد کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

خلیق انجم (2016-1935) : ان کا نام خلیق احمد خاں ہے۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ کروڑی مل کالج میں اردو کے لیکچرر رہے۔ وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری تھے۔ انھوں نے متنی تنقید اور غالب کے خطوط پر وقیع تحقیقی کام انجام دیے ہیں۔ ’غالب اور کلکتہ‘ اور ’خطوط غالب‘ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

حنیف نقوی (2012-1936) : ان کا نام سید حنیف احمد نقوی ہے۔ وہ سہسوان (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے مراحل انھوں نے بھوپال میں طے کیے۔ بی۔اے، ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں وکرم یونیورسٹی، اجین سے حاصل کیں۔ ابتدا میں بھوپال اور بریلی میں تدریس کی خدمات انجام دیں۔ 1970 میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر مقرر ہوئے اور یہیں سے سبکدوش ہوئے۔

حنیف نقوی کا شمار موجودہ دور کے نامور محققین میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شعرائے اردو کے تذکرے، غالب اور عہدِ غالب ان کی تحقیق کے خاص موضوع ہیں۔ مخطوطہ شناسی، فن تاریخ گوئی اور علم عروض وقوافی میں بھی انھیں درک حاصل ہے۔

’شعرائے اردو کے تذکرے‘، ’تلاش و تعارف‘، ’غالب۔ احوال و آثار‘، ’رجب علی بیگ سرور۔ چند تحقیقی مباحث‘، ’رائے بینی نرائن‘، ’میر و مصحفی‘، ’غالب کی چند فارسی تصانیف‘ اور ’تحقیق و تدوین۔ مسائل اور مباحث‘ ان کی تصانیف ہیں۔ ’مآثر غالب‘ ان کی مرتبہ کتاب ہے۔

اردو میں تحقیق کی روایت خاصی مستحکم رہی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، نورالحسن ہاشمی، مسعود حسن رضوی ادیب، ابواللیث صدیقی، مسعود حسین خاں، ابومحمد سحر، نثار احمد فاروقی، مختار الدین احمد، نذیر احمد، مشفق خواجہ، محمود الٰہی اور تنویر احمد علوی نے تحقیق کے سلسلے میں کئی اہم کام کیے ہیں۔

باب 19

خاکہ، انشائیہ، مکتوب، سوانح اور سفرنامے کی روایت

خاکہ نگاری:

خاکے کو مرقع یا قلمی تصویر بھی کہتے ہیں۔ خاکے میں کسی شخصیت کے ظاہری اور باطنی اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔ اس میں شخصیت کی خوبیوں یا خامیوں کا بیان اس طرح کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس شخصیت کی ایک قلمی تصویر اُبھر آئے۔

اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش تذکروں میں ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' میں خاکہ نگاری کے بعض عمدہ نمونے موجود ہیں۔ اردو میں خاکہ نگاری کی روایت کو بیسویں صدی میں زیادہ فروغ ملا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی وغیرہ نے اس فن کی روایت کو پروان چڑھایا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ لکھا، جس کا عنوان ہے 'مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'۔ یہ اردو کا اوّلین خاکہ ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے یہ خاکہ اس انداز سے لکھا ہے کہ نذیر احمد کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہوگئی ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے دہلی کی ٹکسالی زبان کو بڑی مہارت سے استعمال کیا ہے۔ انھوں نے 'ایک وصیت کی تعمیل میں' کے عنوان سے وحیدالدین سلیم کا بھی عمدہ خاکہ کھینچا ہے۔

اسی عہد میں مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری کے فن کی طرف توجہ کی۔ خاکوں پر مشتمل ان کی تصنیف 'چند ہم عصر' میں چودہ خاکے ہیں، ان میں جن شخصیات کا خاکہ کھینچا گیا ہے ان میں نامور شخصیات شامل ہیں اور عام آدمی بھی۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں میں شخصیت کی ظاہری تصویر تو ابھرتی ہی ہے، ساتھ ہی اس کے جذبات واحساسات اور عادات واطوار بھی نمایاں ہوجاتے ہیں۔ 'نام دیو مالی' اور 'گدڑی کا لال' ان کے عمدہ خاکے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے 'غالب کا حلیہ' کے عنوان سے غالب کا خاکہ لکھا ہے۔ اس خاکے میں حسن نظامی نے غالب کے خطوط کی نثر کو اس طور پر استعمال کیا ہے کہ یہ ان کے اپنے جملوں کا حصہ بن گئی ہے۔ اس طرح اس خاکے میں مزاح کا لطیف عنصر پیدا ہوگیا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے خاکہ نگاری کے فن کی طرف خصوصی توجہ کی۔ 'ہم نفسانِ رفتہ' اور 'گنج ہائے گرانمایہ' ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے خاکوں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ان میں قلمی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ وہ مزاح کے پیرایے میں کردار کے اوصاف کے ایسے نقوش ابھارتے ہیں کہ شخصیت کے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنا انھیں خوب آتا ہے۔ انھوں نے مولوی، لیڈر، وکیل اور دیگر پیشوں سے وابستہ شخصیات کو موضوع بنا کر ان کے خاکے لکھے ہیں۔ اپنے عہد کی نامور شخصیات مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد، پطرس بخاری، جگر مرادآبادی، مولانا محمد علی جوہر، علاّمہ اقبال اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ کے عمدہ خاکے کھینچے ہیں۔

بیگم انیس قدوائی اردو کی پہلی خاتون خاکہ نگار ہیں۔ انھوں نے عقیدت مندی کے ساتھ بزرگوں اور سلف صالحین کی سیرت کو اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے۔ 'اب جن کے دیکھنے کو......' اور 'نظرے خوش گزرے' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔

اشرف صبوحی نے دلّی کی ان گمنام شخصیتوں کے خاکے لکھے جو یادگارِ زمانہ ہیں۔ 'دہلی کی چند عجیب ہستیاں' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ دلّی کی مخصوص چٹخارے دار زبان اور اشرف صبوحی کے مخصوص اندازِ بیان کی وجہ سے یہ خاکے جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور ساتھیوں کے خاکے لکھے۔ 'گنجینۂ گوہر'، 'بزمِ خوش نفساں' اور 'طاقِ نسیاں' ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ دہلی کی ٹکسالی زبان پر انھیں مہارت حاصل تھی۔ ان کی تحریروں میں دلّی کے روزمرّہ اور چٹخارے دار زبان کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ان کے تحریر کردہ خاکوں میں خواجہ حسن نظامی، میر ناصر علی اور بیخود دہلوی کے خاکے اہم ہیں۔

سعادت حسن منٹو کے خاکوں کے مجموعے 'گنجے فرشتے' اور 'لاؤڈ اسپیکر' شائع ہوئے۔ عصمت چغتائی نے 'دوزخی' کے عنوان سے اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ لکھا۔ 'یادِ رفتگاں' صباح الدین عبدالرحمٰن کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ 'سایے اور ہمسایے' اور 'ذکرِ خیر' یوسف ناظم کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے خاکوں میں مزاح کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اکابرین اور بزرگانِ دین کی سیرت نگاری میں بھی ان کے یہاں مزاح کا عنصر غالب رہتا ہے۔ یوسف ناظم نے پھلوں اور ترکاریوں کے بھی خاکے کھینچے ہیں۔ 'آدمی نامہ'، 'آپ کی تعریف'،

'چہرہ در چہرہ' مجتبیٰ حسین کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ 'چہرے' ندا فاضلی کے، 'تصویریں اجالوں کی' نورالحسن نقوی کے اور 'اکثر یاد آتے ہیں' مظہر امام کے تحریر کردہ خاکوں کے مجموعے ہیں۔

انشائیہ نگاری :

انشائیہ کو انگریزی میں LIGHT ESSAY کہا جاتا ہے۔ اس میں مصنف اپنے مشاہدات و تجربات کو بے تکلفی سے بیان کرتا ہے اور ایسا انداز اختیار کرتا ہے کہ بات سے بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ انشائیے میں انشائیہ نگار کہیں کہیں لطیف مزاح کا عنصر بھی شامل کرتا ہے لیکن اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ مزاح کا انداز حد سے بڑھنے نہ پائے۔

اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز سرسیّد سے ہوتا ہے۔ انھوں نے علمی و اصلاحی مقاصد کے تحت جو مضامین لکھے، ان میں سے کچھ مضامین انشائیے کی تعریف پر پورے اترتے ہیں اسی لیے سرسیّد کے مضامین 'امید کی خوشی' اور 'بحث و تکرار' وغیرہ کو انشائیہ کی ابتدائی مثال مانا جاتا ہے اسی زمانے میں محمد حسین آزاد نے انشائیے لکھ کر (جن میں بیش تر ترجمہ تھے) اردو میں انشائیہ نگاری کے فن کو تقویت عطا کی۔ 'گلشنِ امید کی بہار'، 'سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ' اور 'انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا' ان کے نمائندہ انشائیے ہیں۔ 'نیرنگِ خیال' ان کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔

عبدالحلیم شرر، سجّاد انصاری، مہدی افادی اور میر ناصر علی دہلوی نے اردو میں انشائیہ نگاری کی روایت کو مزید مستحکم کیا۔ 'پھول برسات'، 'کھلتا ہوا پتّا'، 'بزمِ قدرت' عبدالحلیم شرر کے، محاسن و معاصی' سجاد انصاری کا، 'خوابِ طفلی' اور 'آرزوئے شباب'، مہدی افادی کے 'مسکرانا'، 'ہم اور ہماری ہستی' اور 'زندگی کی شام' میر ناصر علی دہلوی کے معروف انشائیے ہیں۔

بیسویں صدی میں عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری اور کنھیا لال کپور کے انشائیوں سے اس فن کو بڑا فروغ ملا۔ عبدالماجد دریابادی کے انشائیے 'جھوٹ میں سچ' اور 'الفاظ کا جادو'، خواجہ حسن نظامی کے 'دیا سلائی'، 'مٹی کا تیل'، 'جھینگر کا جنازہ'، 'الّو اور مرغ کی اذان'، مرزا فرحت اللہ بیگ کے 'ایک اور ایک چار'، 'بیوی کی انا'، 'خفسانہ' اور 'اونھ'، رشید احمد صدیقی کے 'چارپائی'، 'ارہر کا کھیت'، 'دعوت' اور 'پاسبان'، پطرس بخاری کے 'کتے' اور 'سویرے جو کل میری آنکھ کھلی'، عبدالعزیز فلک پیما کے 'گنوار کی دعا'، 'کچھ

جھوٹ کچھ سچ' اور 'نئی دکان' اور کنھیا لال کپور کے 'اخبار بینی'، 'اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے' اور 'برج بانو' وغیرہ مقبول و معروف انشائیے ہیں۔

عصر حاضر کے اہم انشائیہ نگاروں میں یوسف ناظم، شفیق الرحمٰن، وزیر آغا، مشتاق احمد یوسفی، نظیر صدیقی، مجتبیٰ حسین، احمد جمال پاشا اور نریندر لوتھر کے نام شامل ہیں۔

مکتوب نگاری:

خط دو افراد کے درمیان رابطے کا تحریری وسیلہ ہے۔ خط میں انسان اپنے حالات اور خیالات نہایت سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو اپنا راز دار سمجھتا ہے اس لیے ان کے سامنے اپنے حالات بیان کرنے میں اسے کوئی تکلف نہیں ہوتا اسی لیے خطوط میں خط لکھنے والے کی سچی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ اردو میں خطوط نگاری کی ادبی حیثیت مسلّم ہے۔ اسے مرزا غالبؔ نے ادبی مقام عطا کیا۔ غالبؔ سے پہلے بھی اردو میں خطوط لکھنے کا رواج تھا مگر ان خطوط کی کوئی ادبی حیثیت نہیں تھی۔

غالب کے اردو خطوط کے دو مجموعے 'عودِ ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' ہیں۔ غالبؔ نے شروع میں فارسی میں خط لکھے تھے پھر اسے ترک کر کے اردو میں خط لکھنے لگے۔ خطوط لکھتے وقت وہ روایتی تکلف اور القاب و آداب کے قائل نہیں تھے۔ بس قلم اٹھایا اور مکتوب الیہ کے مرتبے کے مطابق مخاطب کیا۔ ان کے خطوط میں شستہ اور دل کش عبارت آرائی کے بجائے مکالمے کا انداز پایا جاتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں جہاں ذاتی کوائف، دلی کے حالات، دوستوں کے احوال بیان کیے ہیں وہیں بعض خطوط میں ادبی مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق، سنجیدہ مسائل پر گفتگو، مخالفین کو ترکی بہ ترکی جواب، شادی بیاہ کی باتیں، بیماری و صحت کی اطلاع اور اپنے گرد و پیش کے حالات، ان تمام چیزوں کا بیان وہ اپنے خطوط میں شگفتہ انداز میں کرتے ہیں۔ واقعہ نگاری کا وصف ان کے خطوط کی خاص پہچان ہے۔ واقعے کی تصویر کشی وہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ سارا منظر نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے اپنے بعض اشعار کی تشریح بھی ان خطوط میں کی ہے اور علمی نکات بھی بیان کیے ہیں۔ غالب نے خطوط نگاری میں ایسا رنگ اختیار کیا جو سب سے نرالا تھا۔ ان کے خطوط کا کلیات ڈاکٹر خلیق انجم نے مرتب کر کے 'غالب کے خطوط' کے نام سے پانچ جلدوں میں شائع کیا ہے۔

غالبؔ کے علاوہ سرسید نے بھی اپنے مکاتیب میں اپنے زمانے کی مسجّع اور مقفّٰی نثر کی بجاے عام بول چال کی رواں اور آسان زبان کا استعمال کیا۔

محمد حسین آزاد کے خطوط بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ 'مکتوباتِ آزاد' ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جو 1907 میں شائع ہوا۔ ان خطوط کے القاب و آداب میں سادگی پائی جاتی ہے۔ پنجاب سے اپنی محبت کا ذکر وہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے خطوط کا مجموعہ 'موعظۂ حسنہ' کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے یہ خطوط اپنے فرزند مولوی بشیر الدین کو ان کی تعلیم کے زمانے میں لکھے تھے۔ ان خطوط میں انھوں نے عربی قواعد کے ادق مسائل بھی سمجھائے ہیں اور تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے کی طرف مائل کیا ہے۔ عربی اردو کے ساتھ انگریزی سیکھنے کی ترغیب بھی ان خطوط میں دی گئی ہے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ کے خطوط بھی ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مکاتیب میں عالمانہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔ عبارت کی آرائش کے وہ قائل نہیں مگر زورِ بیان اور فصاحت کا لحاظ رکھتے تھے۔ 1925 میں ان کے خطوط دو جلدوں میں 'مکتوباتِ حالیؔ' کے عنوان سے شائع ہوئے۔

شبلی نعمانی کی ادبی خدمات کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ اس میں ان کی مستقل نثری تصانیف کے علاوہ خطوط کی بھی خاص اہمیت ہے۔ شبلی کے خطوط کے مجموعے 'مکاتیبِ شبلی' اور 'خطوطِ شبلی' کے نام سے شائع ہوئے۔ آخر الذکر مجموعہ عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کے نام خطوط پر مشتمل ہے۔ ان میں شعریت اور ادبیت کا عنصر غالب ہے۔ شبلی کے خطوط میں منظر کشی کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ان میں علمی اور لسانی مسائل، الفاظ کے املا اور تلفظ کی بحثیں ہیں۔ عام طور پر ان کی زبان سادہ اور رواں ہے۔

علامہ اقبال نے بھی اپنے معاصرین کو سیکڑوں خطوط لکھے ہیں۔ اقبالؔ کی مراسلت ملک و بیرون ملک کے نامور اساتذہ، فلاسفہ، سیاست داں، ادبا و شعرا، مصلحین اور نوابوں، جاگیرداروں سے تھی اور وہ ہر ایک کو اس کے مرتبے کا لحاظ رکھ کر خط لکھتے تھے۔

اقبال کا انداز تحریر شگفتہ اور رواں ہے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں انگریزی الفاظ کا بے تکلف استعمال کیا ہے۔ ان خطوط میں انھوں نے اپنی شاعری کے متعلق بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور بعض فارسی اشعار کی وضاحت بھی کی ہے۔ سید مظفر حسین برنی نے ان خطوط کو چار ضخیم جلدوں میں 'کلیاتِ مکاتیبِ اقبال' کے نام سے شائع کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اردو خطوط نگاری کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے احمد نگر کی جیل میں قید کے دوران اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو خطوط لکھے تھے جو 'غبارِ خاطر' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ان خطوط میں ماضی کی داستانوں اور حالیہ واقعات کے ساتھ ساتھ علمی مباحث اور ادبی تذکرے بھی ہیں۔ ان خطوط کا ایک خاص وصف آزاد کا وہ اسلوب ہے جس کی بنا پر یہ خطوط دلکش عبارت آرائی کی عمدہ مثال بن گئے ہیں۔ 'کاروانِ خیال' اور 'مکاتیبِ آزاد' ان کے خطوط کے دیگر مجموعے ہیں۔

ان خطوط نگاروں کے علاوہ امیر مینائی، اکبرالٰہ آبادی، مہدی افادی، عبدالماجد دریابادی، سید حسین بلگرامی، محمد علی ردولوی، حبیب الرحمٰن خاں شروانی، صفیہ اختر اور عصرِ حاضر کے کئی ادیبوں کے مکاتیب کے مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

سوانح نگاری:

سوانح عمری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی فرد کی زندگی کے حالات و واقعات یعنی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام احوال و کوائف کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس کی زندگی کے تمام گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ غرض کہ سوانح عمری میں کسی انسان کی پیدائش، اس کا خاندانی پس منظر، عادات و اطوار اور ذہنی تاثرات و تجربات کی مکمل تصویر پیش کی جاتی ہے۔ اس کا موضوع کوئی دوسرا فرد بھی ہو سکتا ہے یا پھر خود مصنف۔ جب ایک مصنف کسی دوسرے شخص کی زندگی کے حالات و واقعات کو بیان کرتا ہے تو اسے سوانح عمری کہا جاتا ہے۔ جب مصنف خود اپنی زندگی کے حالات و واقعات اور تجربات و مشاہدات کو موضوع بناتا ہے تو اُسے خودنوشت سوانح سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اردو میں سوانح نگاری کا آغاز مولانا الطاف حسین حاؔلی کی لکھی ہوئی سوانحی کتب سے ہوا۔ انھوں نے فارسی کے مشہور ادیب سعدی شیرازی کی سوانح 'حیاتِ سعدی'، مرزا اسداللہ غالب کی سوانح 'یادگارِ غالب' اور سرسید احمد خاں کی سوانح 'حیاتِ جاوید' لکھیں۔

شبلی نعمانی نے قدیم مشاہیر کی سوانح عمری پر زیادہ توجہ کی۔ انھوں نے اردو میں سوانح نگاری کی روایت کو استحکام اور ایک خاص معیار عطا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ 'المامون'، 'سیرۃ النعمان'، 'الفاروق'، 'الغزالی' اور 'سوانحِ مولانا روم' ان کی لکھی ہوئی اہم سوانح عمریاں ہیں۔ شبلی نے 'سیرت النبیؐ' کی تصنیف کا کام شروع کیا تھا۔ جسے ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے ان کی وفات کے بعد مکمل کیا۔

بیسویں صدی میں سوانح نگاری کے فن کو کافی فروغ حاصل ہوا اور کئی سوانح عمریاں اور خود نوشتیں لکھی گئیں جن میں عبدالسلام ندوی کی 'اقبال کامل' سید سلیمان ندوی کی 'سیرۃ عائشہ'، 'حیات شبلی'، غلام رسول مہر کی 'غالب'، قاضی عبدالغفار کی 'آثار جمال الدین افغانی' اور 'آثار ابوالکلام آزاد' مولانا عبدالماجد دریابادی کی 'حکیم الامت'، 'نقوش وتاثرات'، صالحہ عابد حسین کی 'یادگارِ حالی' وغیرہ مشاہیر پر لکھی گئی اہم سوانح عمریاں ہیں۔ ان سوانح عمریوں کی خاص صفت یہ ہے کہ ان میں عقیدت کے رنگ کے باوجود تحقیق اور دیانتداری سے کام لیا گیا ہے۔ ان سوانح نگاروں نے اپنے لطیف پیرایۂ اظہار کے ذریعہ سوانح نگاری کے فن کو جلا بخشنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان سوانح عمریوں کو پڑھتے وقت قاری کو نہ صرف ان مشاہیر کی ذاتی زندگی کے حالات وکوائف سے آگہی حاصل ہوتی ہے بلکہ ان کے عہد کی تہذیبی وثقافتی فضا اور سیاسی وسماجی صورتِ حال سے متعلق بھرپور معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔

اردو میں سوانح نگاری کی ابتدا مشاہیر کی سوانح عمریوں سے ہوئی لیکن جلد ہی خودنوشت سوانح عمریوں کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ اردو میں پہلی خودنوشت سوانح مولانا جعفر تھانیسری نے 'تواریخِ عجیب' کے نام سے لکھی۔ یہ خودنوشت ہے۔ اس میں مولانا جعفر تھانیسری نے کالے پانی کی سزا کے طور پر انڈمان میں گزارے ہوئے اپنے اوقات وحالات کو بہت پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد لکھی جانے والی اہم خودنوشت سوانح عمریوں میں خواجہ حسن نظامی کی 'آپ بیتی'، ابوالکلام آزاد کی 'تذکرہ'، سر رضا علی کی 'اعمال نامہ'، ظفر حسن ایبک کی 'آپ بیتی'، مولانا حسین احمد مدنی کی 'نقشِ حیات'، شاد عظیم آبادی کی 'شاد کی کہانی شاد کی زبانی'، اعجاز حسین کی 'میری دنیا'، یوسف حسین خاں کی 'یادوں کی دنیا'، جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی برات'، کلیم الدین احمد کی 'اپنی تلاش میں' آلِ احمد سرور کی 'خواب باقی ہیں'، قدرت اللہ شہاب کی 'شہاب نامہ'، مشتاق احمد یوسفی کی 'زرگزشت'، خواجہ غلام السیّدین کی 'مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'، عبدالماجد دریابادی کی 'آپ بیتی'، اختر الایمان کی 'اس آباد خرابے میں'، مسعود حسین خاں کی 'ورودِ مسعود' اور سیّد محمد عقیل رضوی کی 'گئو دھول' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ خودنوشت سوانح عمریاں اردو کے ادبی سرمایے میں اہم اضافہ ہیں۔

سفرنامہ نگاری:

سفرنامہ ایک ایسی نثری صنف ہے جس میں ملک و بیرونِ ملک کے سفر کے مشاہدات، مناظر اور اہم معلومات کو ادبی پیرایے میں بیان کیا جاتا ہے۔ اردو میں سفرنامے کی روایت انیسویں صدی کے وسط سے ملتی ہے۔ سفرناموں کی تاریخ میں یوسف خاں کمبل پوش (حیدرآبادی) کے سفرنامے 'عجائباتِ فرنگ' کو اردو کا پہلا نثری سفرنامہ قرار دیا گیا ہے۔

یہ 1847 میں 'تاریخِ یوسفی' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں کولکتہ سے انگلستان تک کے بحری سفر کی روداد بیان ہوئی ہے۔ اس سفرنامے کے اندازِ تحریر سے اس وقت کی اردو نثر کا اندازہ ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد کی 'سیاحتِ ایران' اور شبلی کے 'سفرنامۂ روم ومصروشام' کو اس صنف کی ابتدائی شکل کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے سفرنامہ لکھنے والوں میں محمد ہدایت اللہ مولوی مسیح الدین اور محمد عمر علی خاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی سفرناموں میں ایک اہم سفرنامہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا 'سفرِحجاز' ہے۔ مذہبی اور علمی لحاظ سے اس سفرنامے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس نوع کے دوسرے سفرناموں میں ممتاز مفتی کا 'لبیّک'، صالحہ عابد حسین کا 'دیارِ حبیبؐ'، احمد سعید ملیح آبادی کا 'بغداد سے مدینہ منوّرہ تک' ادبی لحاظ سے اہم ہیں۔

قاضی عبدالغفار کا 'نقشِ فرنگ'، بیگم حسرت موہانی کا 'سفرنامۂ عراق'، سید سلیمان ندوی کا 'سفرِ افغانستان'، خواجہ احمد عباس کا 'مسافر کی ڈائری'، آغا اشرف کے 'لندن سے آداب عرض' اور 'دیس سے باہر'، بیگم اختر ریاض الدین کے 'سات سمندر پار' اور 'دھنک پر قدم'، جمیل الدین عالی کے 'تماشا مرے آگے' اور 'دنیا مرے آگے'، ابنِ انشا 'دنیا گول ہے'، 'چلتے ہو تو چین کو چلیے' اور 'ابن بطوطہ کے تعاقب میں'، قرۃ العین حیدر کا 'جہانِ دیگر'، شفیق الرحمٰن کے 'دجلہ'، 'برساتی' اور 'ڈینیوب'، اشفاق احمد کے 'چنگو پاچستاں'، 'عرشِ منوّر' اور 'سفر درسفر'، احتشام حسین کا 'ساحل اور سمندر'، وزیر آغا کا 'ایک طویل ملاقات'، رام لعل کے 'زرد پتوں کی بہار' اور 'خواب خواب سفر'، انتظار حسین کے 'زمیں دیکھ فلک دیکھ'، ممتاز مفتی کا 'ہند یاترا'، جوگندر پال کا 'پاکستان یاترا'، مستنصر حسین تارڑ کے 'اندلس میں اجنبی'، 'نکلے تیری تلاش میں' اور 'خانہ بدوش' وغیرہ بیسویں صدی کے دیگر اہم سفرنامے ہیں۔

باب 20

بچّوں کا ادب

بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے ان کی عمر، نفسیات اور ذہانت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو ادب تخلیق کیا جاتا ہے اسے ادب اطفال یا بچوں کا ادب کہا جاتا ہے۔ یہ ادب ان کی ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کے ذوق کی تربیت بھی کرتا ہے۔ قصے کہانیاں، ڈرامے، مضامین اور نظمیں نہ صرف ان کو تفریح کا سامان فراہم کرتی ہیں بلکہ انھیں اچھا انسان اور ذمہ دار شہری بننے میں بھی مدد کرتی ہیں۔ ان میں اچھے برے کی تمیز پیدا ہوتی ہے اور انھیں زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ ان کے ذریعے بچوں میں ادبی ذوق بھی پروان چڑھتا ہے۔ بچوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ابتدا سے ہی ان کی نفسیات، ضروریات اور ذہنی میلان کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں ایسی کتابیں فراہم کی جائیں جو تفریح کے علاوہ ان کی معلومات میں بھی اضافہ کریں۔

اردو میں بچوں کے ادب کے ابتدائی نقوش امیر خسرو سے منسوب منظوم لغت ’خالق باری‘، پہیلیوں، کہہ مکرنیوں اور دوسخنوں میں ملتے ہیں۔ ہر چند کہ ادب کے علما اور محققوں نے ان سب کو الحاقی اور فرضی قرار دیا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی بعض نظمیں مثلاً ’ایّامِ طفلی‘، ’معصوم بھولے بھالے‘، ’گلہری کا بچہ‘، ’ریچھ کا بچہ‘، ’ہرن کا بچہ‘ وغیرہ بچوں کے ادب میں شمار ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں بچوں کے ادب کی طرف توجہ دی۔ مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے باضابطہ طور پر بچوں کے ادب کو موضوع بنایا۔ محمد حسین آزاد نے بچوں کے لیے نظمیں اور مضامین لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے درسی کتابیں بھی تیار کیں۔ درسی کتابیں تیار کرنے کے ضمن میں انھوں نے زبان سکھانے کے علاوہ اخلاقی تربیت پر بھی توجہ دی۔ بچوں کی دلچسپی کے لیے انھوں نے کتابوں میں خاکوں اور تصاویر سے بھی کام لیا۔ یہ تصاویر اُن کے لیے مشہور انگریزی ادیب روڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) کے والد جان کپلنگ نے تیار کیں۔ ان کی مرتب کردہ کتابیں بچوں میں خوب مقبول ہوئیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کی نظموں میں ’ہے امتحان سر پر کھڑا‘، ’شبِ سرما‘، ’شبِ ابر‘، ’سلام علیک‘، ’جیسا چاہو سمجھ لو‘ وغیرہ اور نثری مضامین میں ’نصیحت کا کرن پھول‘، ’آئینۂ صحت‘،

'دھوبی کپڑے دھو رہا ہے'، 'لڑکا مدرسے جاتا ہے'، 'صبح کی ہوا خوری'، 'مرغ'، 'گلہری' وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ اسکول کے طلبا کے لیے انھوں نے تاریخ کی ایک کتاب 'قصص ہند' بھی مرتب کی۔ اس زمانے میں منشی پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے بھی بچوں کے لیے ادب تخلیق کیا۔ منشی پیارے لال آشوب نے 'اردو کی تیسری کتاب' اور 'اردو کی چوتھی کتاب' مرتب کی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے 'منتخب الحکایات' اور 'چند پند' مرتّب کیں۔ پہلی کتاب میں اصلاحی قصے ہیں جب کہ دوسری کتاب میں روزمرہ زندگی سے تعلق رکھنے والی باتوں مثلاً صفائی، لالچ، تکبّر وغیرہ موضوعات پر آسان زبان میں مضامین پیش کیے گئے ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالؔی (1837-1914/15): انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے بچوں کو اچھے اخلاق، سچائی، ایمانداری، حبّ الوطنی، قوم پرستی اور اتحاد و اتفاق کا درس دیا ہے۔ 'خدا کی شان'، 'کہنا بڑوں کا مانو'، 'جواں مردی کا کام'، 'میں کیا بنوں گا'، 'سپاہی'، 'چٹھی رساں'، 'دھان بونا'، 'مرغی اور اس کے بچے'، 'راست گوئی'، 'امید' وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ انھوں نے لڑکیوں کی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر ایک درسی کتاب ''مجالس النسا'' بھی مرتب کی۔ ان کی نظموں کی زبان سادہ، عام فہم اور رواں ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی (1843/44-1917): اسمٰعیل میرٹھی کی پیدائش میرٹھ میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد میرٹھ کے نارمل اسکول میں داخلہ لیا۔ پھر رڑکی کالج میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ 1860 سے 1867 کے درمیان انھوں نے میرٹھ میں انسپکٹر آف اسکول کی خدمات انجام دیں۔ ان کو ادبِ اطفال میں سب سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ مولوی اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے ادب پر خصوصی توجہ دی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے درسی کتب مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ نظمیں، حکایتیں اور کہانیاں بھی لکھیں۔ انھوں نے 'اردو زبان کا قاعدہ' اور 'اردو کی پہلی کتاب' تیار کی۔ اس کے بعد اسی سلسلے کی چار اور کتابیں مرتّب کیں۔ یہ کتابیں بے حد مقبول ہوئیں اور ان کے سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آج بھی ان کی افادیت و مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان نہایت آسان اور سادہ ہے۔ اس میں مختلف عمر کے بچوں کی دل چسپی کا سامان موجود ہے۔ ان نظموں کے ذریعے اخلاقی اقدار کے فروغ، بچوں میں برے بھلے کی تمیز، سچائی، ایمانداری اور خلوص پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عام زندگی سے تعلق رکھنے والی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو موضوع بنا کر انھوں نے اعلیٰ قدروں کا درس دیا ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں میں 'جگنو اور بچہ'، 'بارش کا پہلا قطرہ'،

'گائے'، 'ایک گدھا شیر بنا'، 'ایک پودا اور گھاس'، 'پن چکّی'، 'ایک وقت میں ایک کام'، 'اسلم کی بلّی'، 'ہمارا کتّا' وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ان کی نظموں کے بہت سے اشعار آج بھی لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔

علّامہ محمد اقبال (1873/77-1938) : بچّوں کے ادب کے ضمن میں اقبال کا نام بھی بہت اہم ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے اصلاحی، اخلاقی اور وطنی نظمیں لکھیں۔ وہ بچوں کی تربیت اس نہج پر کرنا چاہتے تھے کہ ان میں سچائی، ایمانداری، ہمدردی، خلوص اور عاجزی وانکساری کی خوبیاں پیدا ہوں۔ ان میں وطن دوستی اور انسان دوستی کا جذبہ فروغ پاسکے۔ وہ برائی سے بچیں اور اچھائی کی طرف راغب ہوں۔ ان نظموں کی زبان سادہ، رواں اور بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق ہے۔ اقبال کی نظموں میں مقصدیت نمایاں ہے۔ لیکن یہ مقصدیت ان کی نظموں کے لطف و اثر میں کمی نہیں آنے دیتی۔ 'ایک پہاڑ اور گلہری'، 'ایک گائے اور بکری'، 'ایک مکڑا اور مکّھی'، 'ہمدردی'، 'پرندے کی فریاد'، 'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'، 'نیا شوالہ'، 'ایک پرندہ اور جگنو'، 'بچے کی دعا'، 'ترانۂ ہندی' اور 'ماں کا خواب' وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

چکبست لکھنوی (1882-1926) : ان کا بچوں کے ادب میں بھی اہم مقام ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ہندوستان کی قدیم تاریخ، یہاں کے قدرتی مناظر اور تاریخی و مذہبی شخصیات کو موضوع بنایا ہے۔ سادگی اور سلاست سے بھرپور ان کی نظمیں وطن سے محبت کا درس دیتی ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام 'صبحِ وطن' میں بچوں کے لیے بہت سی نظمیں ملتی ہیں جن میں 'ہمارا وطن'، 'خاکِ ہند'، 'وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک'، 'گائے' اور 'پھول مالا' خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

تلوک چند محروم (1887-1966) : بچّوں کے ادب میں ان کا نام بھی اہم ہے۔ وہ درس و تدریس سے وابستہ تھے اور بچوں کے ذہن ونفسیات کا انھوں نے قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی ذہنی نشو ونما پر بھی توجہ دی۔ محروم نے اعلیٰ اخلاقی قدروں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وطن پرستی، قومی یکجہتی، مذہبی رواداری، مساوات اور بھائی چارے کا درس دیا۔ محروم کی زبان سادہ اور آسان ہے۔ ان کے شعری مجموعوں 'بہارِ طفلی' اور 'بچوں کی دنیا' میں رنگارنگ موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔ 'خدا کا شکر'، 'سویرے اٹھنا'، 'محنت'، 'صفائی'، 'ہم ہرگز جھوٹ نہ بولیں گے'، 'اچھا بچہ'، 'پہلے کام پیچھے آرام'، 'استاد کی چھڑی'، 'وقت کی پابندی'، 'بہار' اور 'نرم گفتاری' وغیرہ ان کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

افسر میرٹھی (1895-1974): حامد اللہ افسر میرٹھی کی پیدائش میرٹھ میں ہوئی۔ انھوں نے مدرسۂ عالیہ عربیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈپٹی نذیر احمد سے تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد میرٹھ کالج سے بی اے کیا۔ علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی میں ایم۔اے میں داخلہ لیا لیکن خرابی صحت کے باعث کورس کی تکمیل نہ کر سکے۔ 1927 میں جوبلی کالج لکھنؤ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1950 میں ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد لکھنؤ ہی میں مستقل قیام رہا۔ وہ چونکہ پیشے سے معلم تھے اس لیے بچوں کی نفسیات، عادات واطوار، ان کی دلچسپیوں، ضرورتوں اور مسائل سے بخوبی واقف تھے۔

افسر میرٹھی کا شمار بچوں کے ادب کے صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اصلاحی اور اخلاقی کہانیاں، حبّ الوطنی اور قومی یکجہتی کے جذبات کو فروغ دینے والی نظمیں لکھیں۔ ان کی زبان اس قدر آسان اور عام فہم ہے کہ انھیں سمجھنے میں بچوں کو کسی قسم کی دشواری نہیں ہوتی۔ 'اسکول کی گھڑی'، 'صبح کی دعا'، 'چاند کا بچہ'، 'ہمارا چمن'، 'ماں کا پیار'، 'میاؤں میاؤں'، اور 'خضر کا کام کروں راہنما بن جاؤں' ان کی اہم نظمیں ہیں۔

افسر میرٹھی نے بہت سی دلچسپ کہانیاں اور معلوماتی مضامین بھی لکھے ہیں۔ 'چار چاند' اور 'جانوروں کی عقل مندی' ان کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔

ذاکر حسین (1969-1897): ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا آبائی وطن قائم گنج، فرخ آباد ہے۔ وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی اسکولِ اٹاوہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہیں لیکچرر مقرر ہوگئے۔ 1920 میں جب علی گڑھ میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ قائم ہوا تو وہ اس سے وابستہ ہوگئے۔ 1926 میں جرمنی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ پہلے جامیہ ملیہ اسلامیہ، دہلی اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ 1957 میں بہار کے گورنر بنائے گئے۔ پھر 1962 میں نائب صدرِ جمہوریہ اور 1967 میں صدرِ جمہوریہ کے منصب پر فائز ہوئے۔ انھیں ہندوستان کا سب سے بڑا قومی اعزاز 'بھارت رتن' بھی پیش کیا گیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا بچوں کے ادب سے گہرا تعلق رہا ہے۔ وہ بچوں کو قوم اور ملک کا سب سے اہم اور قابلِ قدر اثاثہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس اثاثے کی حفاظت، بہتر نگہداشت اور تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ ان کے ایما پر مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہونے والے رسالے ''پیامِ تعلیم'' کو بچوں کا رسالہ بنایا گیا۔ اس میں ان کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں اور وہ دوسروں کو بھی اس کے لیے لکھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ ذاکر صاحب نے ابتدا میں اپنی بیٹی رقیّہ ریحانہ کے نام سے کہانیاں لکھیں جو پیامِ تعلیم میں شائع ہوئیں۔ ان کی تحریروں میں دلچسپی اور اخلاقی درس دونوں عناصر موجود

ہیں۔زبان اور اسلوب کے اعتبار سے بھی ان کی کہانیاں قابلِ قدر ہیں۔ان کی مشہور کہانیوں میں 'ابّو خاں کی بکری'، 'مرغی اجمیر چلی'، 'کچھوا اور خرگوش' اور 'پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی' شامل ہیں۔ذاکر حسین نے ڈرامے بھی لکھے۔'امانت' اور 'کھوٹا سکہ' ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔'امانت' کو بچّوں کا پہلا ڈراما قرار دیا جاتا ہے۔

شفیع الدین نیّر (1903-1978) : محمد شفیع الدین نیّر کی پیدائش اترولی، ضلع علی گڑھ میں ہوئی۔ان کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی پوری زندگی بچوں کے ادب کے لیے وقف کر دی۔انھوں نے بچوں کے ادب کو ایک مقدس قومی اور انسانی فریضہ سمجھا اور اسمٰعیل میرٹھی کے عظیم مشن کو آگے بڑھایا۔وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں سیکنڈری اسکول کے معلم تھے۔وہ بچوں کی نفسیات، رجحانات، پسند و ناپسند اور جذبات سے بخوبی واقف تھے۔انھوں نے بچوں کی تفریح اور ان کی اخلاقی تعلیم اور ذہنی نشو ونما کے لیے کثیر تعداد میں نظمیں، کہانیاں، ڈرامے اور معلوماتی مضامین لکھے۔ان کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں ہر عمر کے بچوں کی پسند کی تخلیقات مل جاتی ہیں۔ان کی نظموں میں آسانی سے یاد ہو جانے کی خصوصیت بھی موجود ہے۔ان کی تحریروں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی اخلاقی پیام ہوتا ہے جسے وہ بچوں کی ہی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ان کی نظموں میں نغمگی اور روانی ہے۔'بچوں کا تحفہ'، 'وطنی نظمیں'، 'اسلامی نظمیں'، 'اخلاقی نظمیں'، 'منّی کا گیت' اور 'بچوں کا کھلونا' ان کی نظموں کے اہم مجموعے ہیں۔

نیّر نے مختلف عمر کے بچوں کے لیے خاصی تعداد میں دلچسپ کہانیاں بھی لکھی ہیں۔اس ضمن میں ان کی کوشش رہی ہے کہ بچوں میں کہانی کے وسیلے سے مطالعے کی عادت پڑے اور عمر کے ساتھ ساتھ ان کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی اضافہ ہو۔'تارہ کا ڈنڈا'، 'پرستان کی سیر'، 'ریڈیو کا بھوت'، 'بونے کا انصاف'، 'مکھن کا ڈبہ'، 'ڈھول کا پول' اور 'بدّھو کی بیوی' ان کی کہانیوں کے مشہور مجموعے ہیں۔

کرشن چندر (1914-1977) : انھوں نے خاصی تعداد میں بچّوں کے لیے کہانیاں، ناول اور ڈرامے لکھے ہیں۔ان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے سائنس فکشن اور فنتاشیے سے اردو ادبِ اطفال کو متعارف کرایا اور جدید سائنسی اور تکنیکی دنیا سے بچوں کو واقف کرانے کی کوشش کی۔ان کی زیادہ تر کہانیاں اور ناول تمثیلی اور طنزیہ پیرایے میں ہیں جن میں مزاح کا پہلو بھی شامل ہے۔ان کی تخلیقات کی زبان اور اسلوب بچوں کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔'سونے کی بکری'، 'سونے کا سیب'، 'شیطان کا تحفہ'، 'بیوقوف امیر'، 'بیوقوف بڑھیا' وغیرہ ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔'گیند' ان کا اہم ڈراما ہے۔'ستاروں کی سیر'، 'چڑیوں کی الف لیلہ' اور 'الٹا درخت' ان کے دلچسپ ناول ہیں۔

قرۃالعین حیدر (1926/27-2007): اردو میں بچّوں کے ادب کو ہمیشہ اچھے لکھنے والوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ جدید دور میں قرۃالعین حیدر اردو فکشن کا ایک بڑا نام ہے۔انھوں نے بھی اس سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔'بھیڑیے کے بچے'، 'شیر خاں'، 'میاں ڈھینچو کے بچے'، 'بہادر'، 'ایک پرانی کہانی' وغیرہ ان کی معروف کہانیاں ہیں۔انھوں نے ایل لاگن کے انگریزی ناول کا ترجمہ 'جن حسن عبدالرحمٰن' کے عنوان سے کیا جو سائنس فکشن کی بہترین مثال ہے۔ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بڑوں کے لیے جو کتابیں لکھیں ان میں عالمانہ اور فلسفیانہ اسلوب اپنایا لیکن بچوں کی کتابوں میں ان کی ذہنی صلاحیت، عمر، نفسیات اور دلچسپی کا پورا خیال رکھا اور آسان زبان استعمال کی۔

بچوں کے ادب میں پریم چند، سدرشن، امتیاز علی تاج، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، حفیظ جالندھری، عبدالغفار مدھولی، میرزا ادیب، سراج انور، اطہر پرویز، وغیرہ ادیبوں اور شاعروں کی خدمات بھی نا قابلِ فراموش ہیں۔

'پیامِ تعلیم، کھلونا'، 'پھلواری'، 'پھول'، 'نور'، 'نونہال'، 'بچوں کی دنیا'، 'غنچہ'، 'ٹافی'، 'چاند' اور 'امنگ' جیسے رسائل نے بھی بچّوں کے ادب کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ صحیح معنوں میں ادب کو بچوں سے جوڑنے کا کام انھی رسائل نے انجام دیا ہے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

باب 21

اُردو میں عوامی ذرائع ابلاغ

معاشرے میں افراد سے رابطہ کرنے اور اپنے تجربات واحساسات کا اظہار کرنے کے لیے انسان ہر عہد میں نئے نئے وسائل کا استعمال کرتا رہا ہے۔ کبھی تقریر سے، کبھی تحریر سے، کبھی بصری مناظر سے، کبھی سنگ تراشی سے، کبھی مصوّری سے، کبھی فنِ تعمیر وغیرہ سے۔ یہ وسائل ہزاروں سال سے استعمال ہوتے آرہے ہیں۔ دورِ جدید میں سائنس کی ترقی کے زیرِ اثر کئی نئے وسائل سامنے آئے جن کے ذریعے خیالات کا ایک وسیع حلقے تک پہنچنا آسان ہو گیا مثال کے طور پر اخبار، رسائل، ریڈیو، ٹیلی وِژن، فلم، تھیئٹر، انٹرنیٹ وغیرہ۔ ہماری زبان نے بھی اِن ذرائع ابلاغ کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ ذیل میں اردو عوامی ذرائع ابلاغ کی روایات اور ان کے ارتقا کا مختصر جائزہ پیش ہے۔

صحافت :

صحافت یعنی اخبارات ورسائل عوامی ابلاغ کا سب سے قدیم ذریعہ ہیں اور آج بھی ان کی مقبولیت برقرار ہے۔ اردو میں صحافت کی روایت دیگر ہندوستانی زبانوں کے مقابلے زیادہ قدیم اور مستحکم رہی ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلا اخبار 1780 میں انگریزی میں نکالا گیا جس کا نام ہِکیز گزٹ (Hickey's Gazette) تھا۔ اردو میں پہلا اخبار 'جامِ جہاں نما' 1822 میں کولکتہ سے جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر سداسکھ اور مالک ہری ہردت تھے۔ اردو کا دوسرا اخبار 'دہلی اردو اخبار' تھا۔ اس کے مدیر مولوی محمد باقر محمد حسین آزاد کے والد تھے۔ یہ اخبار 1837 میں 'اخبارِ دہلی' کے نام سے شروع ہوا تھا۔ 1840 میں اس کا نام 'دہلی اردو اخبار' ہو گیا۔ یہ اخبار دہلی کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کا آئینہ بن کر ابھرا۔ 1857 کی پہلی جنگِ آزادی میں ہندوستانیوں کو جب ابتدائی فتح حاصل ہوئی اور آزادی کے مجاہدوں نے بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے کا اعلان کیا تو مولوی محمد باقر نے 12 جولائی سے اپنے اخبار کا نام 'اخبار الظفر' کر دیا۔ تقریباً دو ماہ بعد جب دہلی پر انگریزوں کا تسلّط قائم ہوا تو یہ اخبار بند ہو گیا اور مولوی محمد باقر کو انگریزوں نے سزائے موت دے دی۔

دہلی ہی سے 1841 میں 'سید الاخبار' شائع ہونا شروع ہوا۔ اِسے سید محمد خاں نے جاری کیا جو سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی تھے۔ اس اخبار کے مدیر عبدالغفور تھے۔ سرسید احمد خاں بھی اس اخبار سے وابستہ تھے۔ اس کے علاوہ اسی عہد میں 'صادق الاخبار' اور 'آئینۂ گیتی نما' اخبار دہلی سے شائع ہوئے۔ قدیم دہلی کالج سے بھی کئی اخبار و جریدے شائع کیے گئے۔ مثلاً 'قران السعدین'، جس کے مدیر اسپرنگر تھے اور 'فوائد الناظرین' 'محبِّ ہند' کے مدیر ماسٹر رام چندر تھے۔ اس دوران 1837 سے 1857 تک ہندوستان کے مختلف شہروں سے کئی اور اخبار و جرائد شائع ہوئے جن میں سے چند یہ ہیں۔ 'آئینۂ سکندری (ممبئی)'، 'کوہِ نور (لاہور)'، 'خیر خواہِ ہند (مرزا پور)'، 'جامع الاخبار (مدراس)'، 'لکھنؤ اخبار (لکھنؤ)' وغیرہ۔

اب تک جو اخبار نکل رہے تھے وہ زیادہ تر ہفت روزہ، کچھ پندرہ روزہ اور کچھ ہفتے میں دو یا تین بار نکلنے والے اخبار تھے۔ 1858 میں کولکاتا سے اردو کا پہلا روز نامہ 'اردو گائڈ' جاری ہوا۔ اس کے مدیر مولوی کبیر الدین تھے۔ پہلی جنگ آزادی کے فوراً بعد کا سب سے اہم اخبار 'اودھ اخبار' تھا جسے منشی نول کشور نے 1858 میں جاری کیا تھا۔ 1877 میں یہ اخبار روز نامہ ہو گیا۔ اسی سال 'اودھ پنچ' جاری ہوا۔ 'اودھ اخبار' اور 'اودھ پنچ' میں بہت سی شاہ کار ادبی تحریریں شائع ہوئیں۔ یہ دونوں اخبار لکھنوی تہذیب کو فروغ دینے کے لیے بھی مشہور ہیں۔

سرسید احمد خاں نے 1866 میں سائنٹفک سوسائٹی کا ایک اخبار نکالا جس کا نام 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' تھا۔ اس اخبار نے اردو میں سائنسی طرزِ فکر کو فروغ دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے 1879 میں ایک رسالہ 'تہذیب الاخلاق' بھی نکالا جو اپنی علمی و ادبی خدمات کے لیے کافی مقبول ہوا۔ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں ہی محبوب عالم نے گوجرانوالہ سے ایک ماہ نامہ 'زمیندار' اور ہفت روزہ 'ہمت' جاری کیا جس کا نام بعد میں بدل کر 'پیسہ اخبار' کر دیا گیا اور یہ اخبار لاہور سے نکلنے لگا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہندوستان کی آزادی (1947) تک اردو میں بے شمار اخبار و رسائل جاری ہوئے۔ ان میں حسرت موہانی کا 'اردوے معلیٰ'، مولانا محمد علی جوہر کا 'ہمدرد'، ظفر علی خاں کا 'زمیندار'، ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' اور 'البلاغ' خاص طور سے اہم ہیں۔ یہ تمام ادیب صحافی بھی تھے اور مجاہدین آزادی بھی۔

شیخ عبدالقادر نے 1901 میں لاہور سے رسالہ 'مخزن' جاری کیا۔ 1904 میں بابو دینا ناتھ نے لاہور سے اردو اخبار 'ہندوستان' نکالا۔ یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا اور انگریزوں کی مخالفت کے لیے مشہور رہا۔ 1907 میں الہ آباد سے شانتی نرائن بھٹناگر نے ایک ہفتہ وار اخبار 'سوراجیہ' نکالا۔ 1908 میں دہلی سے خواتین کا ایک رسالہ 'عصمت'

جاری ہوا جس کے پہلے مدیر شیخ محمد اکرام اور بعد میں علامہ راشد الخیری رہے۔ 1912 میں حامد اللہ انصاری نے بجنور سے ایک اہم اخبار 'مدینہ' جاری کیا۔ 1919 میں مہاشے کرشن نے لاہور سے 'پرتاپ'، 1921 میں حیدر آباد سے 'رہنمائے دکن'، 1923 میں مہاشے خوش حال چند نے 'ملاپ'، اسی سال سوامی شردھانند نے دلی سے 'تیج'، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے 1931 میں 'پیغام' شروع کیا بعد میں اس کا نام 'آزاد ہند' رکھ دیا گیا۔ ان اخباروں میں سے کئی اب بھی نکل رہے ہیں۔ 1920 میں لالہ لاجپت رائے نے اردو میں ایک بڑا اخبار 'بندے ماترم' شروع کیا۔ اخباروں اور رسائل کے یہ نام محض نمائندگی کے طور پر دیے گئے ہیں ورنہ اس دور میں بے شمار اخبار جاری ہوئے۔ آزادی سے قبل ایک بہت اہم اخبار 'قومی آواز' 1945 میں شروع ہوا۔ اس کے مدیر حیات اللہ انصاری اور سر پرست پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ یہ اخبار بعد میں اردو میں جدید صحافت کا نمائندہ اخبار سمجھا جانے لگا اور آزادی کے بعد اردو صحافت کو اس نے معیار اور اعتبار بخشا۔ آج ہندوستان کے بہت سے شہروں سے اردو کے کئی اہم اخبار شائع ہو رہے ہیں جن میں کچھ خاص نام حسبِ ذیل ہیں:

راشٹریہ سہارا، عوام، نئی دنیا، ملاپ، پرتاپ، ہندوستان ایکسپریس، صحافت، ہمارا سماج، چوتھی دنیا، انقلاب (دہلی) منصف، سیاست، رہنمائے دکن (حیدر آباد)، آگ (لکھنؤ)، انقلاب اور اردو ٹائمز (ممبئی)، اخبارِ مشرق، آزاد ہند (کولکاتا)، سنگم، قومی تنظیم، پندار (پٹنہ) اور اورنگ آباد ٹائمز (اورنگ آباد، مہاراشٹر)۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے تقریباً ہر شہر سے کوئی نہ کوئی اردو اخبار نکل رہا ہے۔ کئی اخباروں کے انٹرنیٹ ایڈیشن بھی شائع ہو رہے ہیں۔

فلم :

فلم عوامی ذرائع ابلاغ کا اہم وسیلہ ہے اور اس کی روایت ہندوستان میں انیسویں صدی کے آخری دور سے ملتی ہے۔ ہندوستان میں پہلی دفعہ 1896 میں فلم "Life Sized Reproduction" کی ممبئی میں نمائش کی گئی۔ اس کے بعد کئی فلمیں وقفے وقفے سے دکھائی جاتی رہیں۔ پہلی ہندوستانی فلم راجہ ہریش چندر 1913 میں دکھائی گئی۔ اس کے فلم ساز دادا صاحب پھالکے تھے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ 1931 تک جاری رہا۔ یہ خاموش فلمیں تھیں جن میں مکالمے اور آوازیں نہیں ہوتی تھیں صرف حرکات وسکنات کے ذریعے اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے ان فلموں میں اردو یا کسی دوسری زبان کا کوئی عمل دخل ممکن نہیں تھا۔ لیکن ہر زبان کی ایک تہذیب ہوتی ہے، جو ان خاموش فلموں میں بھی کسی نہ کسی طور پر نظر آتی تھی۔ اردو کی کئی مقبول داستانوں مثلاً لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد وغیرہ پر خاموش فلمیں بنائی گئیں۔

1931 میں پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' بنی۔ یہ بولتی (Talky) فلم جوزف ڈیوڈ کے اردو ڈرامے 'عالم آرا' پر مبنی تھی۔ ان کا تعلق پارسی تھیٹر سے تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار اردشیر ایرانی کا بھی پارسی اردو تھیٹر سے تعلق تھا۔ یہ فلم بہت کامیاب رہی۔ لوگ حیران تھے کہ تصویریں کیسے بولنے لگیں اور وہ بھی اتنی نفیس اردو میں۔

'عالم آرا' کے ریلیز ہونے کے محض پانچ ہفتے بعد مدن تھیٹرز کی فلم 'شیریں فرہاد' ریلیز ہوئی۔ اس کی اسکرپٹ آغا حشر کاشمیری نے لکھی تھی۔ شیریں فرہاد اردو کی مقبولِ عام داستان ہے۔ آغا حشر نے اسی کو بنیاد بنا کر فلم کی کہانی لکھی۔ یہ فلم عالم آرا سے بھی زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کے بعد مدن تھیٹرز نے دو فلمیں اور بنائیں۔ پہلی 'لیلیٰ مجنوں' جس میں 22 اور دوسری 'شکنتلا' جس میں 41 گیت تھے۔ ان فلموں کی کامیابی نے ہماری فلموں کا رخ طے کر دیا اور نغمے ہماری فلموں کا لازمی حصہ بن گئے۔

اس کامیابی سے متاثر ہو کر اردو کے بہت سے ادیب اور شاعر فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے۔ ان میں آغا حشر کاشمیری کا نام سرِفہرست ہے۔ انھوں نے کئی فلموں کی اسکرپٹ لکھے۔ اس کے بعد پریم چند نے 'غریب مزدور' اور 'نوجیون' کی اسکرپٹ تیار کیے۔ پریم چند کے ناول 'بازارِ حسن' پر ان کی زندگی ہی میں فلم بن گئی تھی۔ اس کے بعد ان کے بہت سے افسانوں اور ناولوں پر فلمیں بنیں۔

پارسی تھیٹر اور پریم چند کے بعد اردو فکشن اور سنیما کا رشتہ اور مستحکم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اردو کے بہترین تخلیقی فنکار فلموں سے وابستہ ہو گئے۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس جیسے اہم تخلیق کار فلموں کے لیے اسکرپٹ لکھنے لگے۔ آغا جانی، صفدر آہ، تابش لکھنوی، شمس لکھنوی، اختر انصاری اسی زمانے میں فلموں سے وابستہ ہوئے۔ ان کے علاوہ ساغر نظامی، کمال امروہوی، اختر مرزا، وجاہت مرزا، ضیا سرحدی، شاہد لطیف، اختر الایمان، ایس علی رضا، عزم بازید پوری، امان، احسان رضوی، ابرار علوی، سی ایل کاوش اور رامانند ساگر نے فلموں میں اسکرپٹ رائٹر کے طور پر اپنے جوہر دکھائے۔

فلموں میں ایک طرف جہاں اردو اسکرپٹ رائٹرز اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے تھے وہیں بہت سے شاعروں نے نغمہ نگار کے طور پر ان فلموں کی مقبولیت میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ ان شعرا میں جوش ملیح آبادی، آرزو لکھنوی، علی سردار جعفری، شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، نخشب جارچوی، راجندر کرشن، حسرت جے پوری، قمر جلال آبادی، اسد بھوپالی، کیف بھوپالی، راجہ مہدی علی خاں، مرزا ادیب، شہریار، ندا فاضلی، گلزار اور جاوید اختر وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا نے ہندوستانی فلموں کو ایک وقار اور معیار دیا۔

اس طرح فلمی دنیا میں اردو کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا اور فلموں سے وابستہ فنکاروں کے لیے لازمی ہو گیا کہ وہ باقاعدہ طور پر استاد سے اردو زبان اور تلفّظ سیکھیں۔

اگرچہ موجودہ عہد میں زبان میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ فلموں میں انگریزی کا چلن بہت بڑھ گیا ہے لیکن اب بھی ہندوستانی زبان میں بننے والی فلموں پر اردو زبان کا اثر غالب ہے۔

ریڈیو :

برقی ذرائع ابلاغ میں ریڈیو کی اہمیت مسلّم ہے۔ ہندوستان میں ریڈیو کی ابتدا بیسویں صدی کے اوائل میں ہی ہوگئی تھی۔ سب سے پہلے 1921 میں ممبئی سے تجرباتی طور پر موسیقی کا پروگرام کامیابی کے ساتھ نشر کیا گیا۔ اس کے بعد 1923 میں کولکاتا اور 1924 میں ممبئی میں مارکونی کی مدد سے ریڈیو کلب قائم کیے گئے اور پروگرام نشر ہونے شروع ہو گئے۔ 1926 میں انڈین براڈ کاسٹنگ سروس کا قیام عمل میں آیا۔ 1927 میں ممبئی اور کولکاتا میں باقاعدہ ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا۔ دہلی میں 1936 میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا، اسی سال انڈین براڈ کاسٹنگ سروس کا نام بدل کر آل انڈیا ریڈیو رکھا گیا۔

1947 میں جب ملک آزاد ہوا، اس وقت 9 ریڈیو اسٹیشن تھے جن میں سے ممبئی، کولکاتا، چنّئی، دہلی، لکھنؤ اور تروچناپلی ہندوستان کے حصے میں آئے اور لاہور، پشاور اور ڈھاکہ پاکستان کے حصے میں گئے۔ ملک کی آزادی کے موقعے پر 14-15 اگست کی رات پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستانی عوام سے براہِ راست خطاب کیا۔ یہ ہندوستان کا پہلا براہ راست نشریہ تھا۔ آزادی کے بعد ملک میں ریڈیو نشریے کے نظام میں زبردست ترقی ہوئی اور یہ عوامی ذرائع ابلاغ کا ایک اہم وسیلہ قرار پایا۔

فلم کی طرح ریڈیو کی ترقی میں بھی اردو ادیبوں کا بہت اہم رول رہا ہے۔ آزادی سے قبل جو اردو ادیب اور شاعر ریڈیو سے وابستہ رہے ان میں احمد شاہ پطرس بخاری کا نام بہت اہم ہے۔ وہ ریڈیو کے پہلے ہندوستانی ڈائریکٹر جنرل تھے۔ اس کے علاوہ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، مجاز، راجندر سنگھ بیدی، حبیب تنویر، عمیق حنفی، روش صدیقی، ساغر نظامی، سہیل عظیم آبادی، رفعت سروش، سلام مچھلی شہری، قیصر قلندر اور ایاز انصاری نے آزادی کے بعد ریڈیو سے منسلک رہ کر اس کے معیار کو بلندی عطا کی۔ عصرِ حاضر میں ریڈیو سے وابستہ اردو کی اہم شخصیات میں کمال احمد صدیقی، اقبال مجید، منظور الامین، مظہر امام، محمود ہاشمی، زبیر رضوی، رتن سنگھ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

ٹیلی ویژن :

عہدِ حاضر میں ٹیلی ویژن ہماری زندگی کا ایک ناگزیر حصّہ بن چکا ہے۔ اس کی ایجاد کافی بعد میں ہوئی لیکن اس کا فروغ بہت ہی تیز رفتاری سے ہوا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ آج ٹیلی ویژن سب سے مؤثر اور طاقت ور ذریعۂ اِبلاغ ہے۔

ٹیلی ویژن کی نشریات کا آغاز سب سے پہلے 1920 میں امریکہ میں ہوا تھا۔ ہندستان میں 15 ستمبر 1959 میں پہلی بار تجرباتی طور پر ٹیلی ویژن نشریات عمل میں آئیں۔ 1961 سے اسکول ٹی.وی. (S.T.V) کا آغاز ہوا اور مستقل طور پر پروگرام نشر کیے جانے لگے۔ یہ پروگرام تعلیمی ہوتے تھے اور خاص طور سے سائنس کے اساتذہ اور طالبِ علموں کو نظر میں رکھ کر تیار کیے جاتے تھے۔ 1959 سے 1965 تک ہفتے میں صرف ایک دن ایک گھنٹے تک پروگرام دکھائے جاتے تھے۔ 1965 سے روز ایک گھنٹے کا پروگرام دکھایا جانے لگا۔ 1965 میں پہلی بار کچھ تفریحی پروگراموں کا بھی آغاز ہوا۔ لیکن تعلیم، صحت، دیہی مسائل اور مختلف ترقیاتی پروگرام کو اب بھی ترجیح حاصل تھی۔ یہ سلسلہ 1976 تک چلتا رہا۔ اسی برس ٹیلی ویژن سے کاروباری نشریات کا آغاز ہوا۔ اب تک ٹیلی ویژن اور ریڈیو ایک ہی شعبے کی دو شاخیں تھیں اور ایک ہی ڈائریکٹریٹ کے تحت تھے۔ اسی برس ٹیلی ویژن کو الگ مستقل ادارہ بنایا گیا جسے 'دوردرشن' نام دیا گیا۔

1982 میں ٹیلی ویژن میں انقلابی تبدیلیاں اس وقت آئیں جب سیٹلائٹ کے ذریعے قومی نیٹ ورک (National Network) قائم کیا گیا اور قومی نشریات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسے بیک وقت پورے ہندستان میں دیکھا جانے لگا اور ہندستان میں پہلی بار رنگین نشریات عمل میں آئیں۔ اسی سال ٹیلی ویژن پر پہلی بار راست نشریات (Live Telecast) کا آغاز ہوا۔ ایشیائی کھیلوں اور ناوابستہ ممالک کی کانفرنس کو دوردرشن پر سیدھا دکھایا گیا۔ 1984 میں ہندستان کا پہلا ٹی.وی. سیریل ''ہم لوگ'' شروع ہوا۔

1992 سے کیبل ٹی۔وی۔ کا آغاز ہوا اور دوردرشن کے علاوہ پرائیویٹ چینلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ بے شمار پرائیویٹ چینلوں کی آمد نے ٹیلی ویژن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ آج ٹیلی ویژن پروگرام کی نوعیت میں بہت تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ خبروں کے علاوہ تفریحی، معلوماتی، تاریخی، تہذیبی اور تعلیمی نوع کے پروگراموں کے ساتھ ساتھ سیاست، کھیل کود، صحت اور ادب گویا زندگی کے ہر شعبے سے متعلق مسائل و موضوعات پر پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ ان سارے پروگراموں میں اردو زبان اور اردو الفاظ کا استعمال ناگزیر سا ہو گیا ہے۔ خبروں کی زبان سے لے کر ٹی۔وی۔ سیریلز، ٹیلی فلم، بحث و مباحثے اور دیگر تفریحی و معلوماتی پروگراموں اور اشتہارات میں اردو زبان اور اردو الفاظ کا استعمال کثرت سے ہو رہا ہے۔ اس سے عوامی ذرائع ابلاغ میں اردو کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

موجودہ عہد میں کئی ٹی۔وی چینل اردو کے پروگرام نشر کررہے ہیں۔تعلیمی پروگراموں کے فن میں این سی ای آر ٹی، اگنو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، جامعہ ملّیہ اسلامیہ اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ کے اردو درس وتعلیم پر مبنی پروگرام، دوردرشن کے چینل گیان درشن اور دیگر چینلوں پر نشر کیے جا رہے ہیں۔ دوردرشن کا چینل 'ڈی۔ڈی اردو'، 'ای ٹی وی اردو'، 'عالمی سہارا'، 'منصف' اور 'زی سلام' ایسے چینل ہیں جو اردو کے لیے مخصوص ہیں۔

برقیاتی ذرائع :

موجودہ عہد کو ہم ٹکنالوجی کا عہد کہتے ہیں ۔ اس دور میں زندگی کے تمام شعبے ٹکنالوجی کے مرہون ہیں۔ تعلیم وتدریس کے میدان میں بھی ٹکنالوجی کا استعمال ناگزیر ہوتا جارہا ہے۔ بالخصوص کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور استعمال نے دنیا بھر کی زبانوں کو اس جانب متوجہ کیا ہے جس کے نتیجے میں دنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں میں ان کا استعمال ہو رہا ہے۔سیٹلائٹ کے نظام پر مبنی ابلاغ وترسیل کے اس وسیلے کو سائبر اسپیس بھی کہا جاتا ہے۔سائبر اسپیس کی اصطلاح کافی وسیع معنی رکھتی ہے۔سائبر اسپیس سے مراد یہ ہے کہ ہر طرح کے موضوعات سے متعلق معلومات اور اعداد وشمار (Data) جمع کیے جاسکیں تاکہ اس کی ترسیل دوسروں تک ممکن ہو سکے۔اس طرح کمپیوٹر کے نظام ترسیل کے ایک حصے کو سائبر اسپیس کہہ سکتے ہیں۔

سائبر اسپیس کے حوالے سے بھی اردو زبان نے کافی پیش رفت کی ہے۔اردو، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے نظام سے بہ حسن وخوبی ہم آہنگ ہے۔اردو کا بیش قیمت سرمایہ سائبر اسپیس میں موجود ہے۔انٹرنیٹ پر اردو میں ڈیجیٹل لائبریری اور کئی اہم ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی سائٹس موجود ہیں۔اس کے علاوہ آج کی اردو صحافت کو انٹرنیٹ کے استعمال نے کافی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔اردو کے متعدد اخبارات انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔کئی اخبارات تو اب بھی امیج فائل کی شکل میں انٹرنیٹ پر پیش کیے جا رہے ہیں مگر زیادہ تر اخبارات یونی کوڈ میں شائع ہو رہے ہیں۔ان کے مواد بھی طبع شدہ (کاغذی اخبار) سے الگ ہوتے ہیں۔ایسے اخبارات تازہ ترین خبروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔اسی لیے انٹرنیٹ پر موجود اخبارات میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے۔کمپیوٹر اور انٹرنیٹ فاصلاتی تعلیم وتدریس کے سلسلے میں بھی کافی معاون ثابت ہو رہے ہیں۔اسباق کی تیاری، طلبا تک ان کی رسائی اور طلبا کے ردّعمل کو جاننے سے کافی مدد لی جاسکتی ہے۔

جدید ٹکنالوجی نے جہاں زندگی کے تمام شعبوں میں آسانیاں پیدا کی ہیں وہیں، اس نے زبان وثقافت کے حوالے سے بھی نئے امکانات کو روشن کیا ہے اور اردو بھی جدید ٹکنالوجی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

باب 22

اُردو کے ادبی دبستان، ادارے، تحریکات اُور رجحانات : مختصر جائزہ

13085CH22

اردو زبان و ادب کے فروغ اور ارتقا میں مختلف دبستانوں، اداروں اور تحریکات و رجحانات کا اہم کردار رہا ہے۔ دبستان، ادارے اور تحریکیں مختلف ادوار میں زبان و ادب کو نئے رویّے، نئے افکار و تصورات اور نئے اسالیب سے متعارف کرانے اور انھیں نئے امکانات اور نئی سمتوں سے روشناس کرانے میں بے حد معاون ثابت ہوئیں۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں ابتدائی دور سے ہی ایسے دبستانوں، اداروں اور تحریکوں کی خدمات اور ان کے کارہائے نمایاں کے شواہد ملتے ہیں۔ ایسے دبستانوں، اداروں اور تحریکوں میں نمایاں طور پر دبستانِ دلّی، دبستانِ لکھنؤ، فورٹ ولیم کالج، قدیم دلّی کالج، سرسید تحریک، انجمن پنجاب، دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ، انجمنِ ترقی اردو، ترقی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق اور جدیدیت اہمیت کے حامل ہیں۔

دبستانِ دہلی :

ماضی میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں بعض شہروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ وہ شہر تھے جہاں بڑی تعداد میں شاعر اور ادیب جمع ہو گئے تھے اور ان کی سرپرستی کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ انھیں ادبی مراکز میں سے ایک دہلی ہے۔ اردو شاعری کے فروغ میں اس شہر کی بڑی اہمیت ہے یہاں تک کہ اسے ایک باقاعدہ ادبی اسکول کی حیثیت حاصل ہے۔ اس ادبی اسکول کو 'دبستانِ دہلی' کہا جاتا ہے۔

شہر دہلی عرصۂ دراز تک ہندوستان کا پایۂ تخت رہا ہے۔ اس کی مرکزیت کی وجہ سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کے ساتھ ساتھ شعرا کی بڑی تعداد بھی یہاں ہر دور میں موجود رہی ہے۔ ان میں مقامی شعرا بھی تھے اور بیرونی بھی۔ اس طرح اردو شعر و ادب کی تاریخ میں دہلی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ مرکزیت کے اظہار کے لیے 'دبستانِ دہلی' یا 'دہلی اسکول' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے یہاں کے مشاہیر شعرا کے نام اس طرح ہیں :

- آرزو، آبرو، ناجی، یک رنگ، مضمون
- مرزا مظہر جانِ جاناں، حاتم
- میر، سودا، درد، قائم، میر حسن
- میر سوز، جرأت، شاہ نصیر
- ذوق، مومن، غالب

دبستانِ دہلی کے نمائندہ شعرا کا امتیاز یہ ہے کہ اپنی بات سیدھے سادے اور دل نشیں انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے یہاں عام طور سے تصنع نہیں پایا جاتا۔ ان کی شاعری میں داخلیت زیادہ ہے، خارجیت کم۔ یعنی وہ اپنے جذبات کے اظہار پر زور دیتے ہیں۔

غزل روزِ اوّل سے حسن و عشق کے معاملات کے اظہار کا ذریعہ رہی ہے۔ دہلی کے شعرا نے بھی محبوب کے حسن کی تعریف کی ہے اور ہجر و وصل کے قصّے سنائے ہیں لیکن انھوں نے جذبۂ عشق کا اظہار مہذّب طریقے سے کیا ہے۔ انھیں وصل سے زیادہ ہجر عزیز ہے۔

مضامینِ تصوّف بھی دہلوی شعرا کو بے حد مرغوب ہیں۔ دہلی علما اور صوفیا کا مسکن تھی۔ بعض شاعر خود بھی صوفی تھے۔ جو عملاً صوفی نہیں تھے، وہ بھی صوفیانہ خیالات کو شعر کے لیے موزوں سمجھتے تھے مثلاً درد صوفی شاعر تھے۔ میر کی بھی اسی فضا میں تربیت ہوئی تھی۔ دلی کی بربادی اور خوف و دہشت کے ماحول نے بھی اردو شاعری میں مضامینِ تصوّف کو فروغ دیا۔

دبستانِ لکھنؤ :

اورنگ زیب کی وفات (1707) کے بعد ان کے وارثین کے درمیان ہونے والی جنگوں، درباری سازشوں اور بیرونی حملوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ مغلیہ سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی۔ دہلی بے رونق ہوئی تو فیض آباد اور پھر لکھنؤ کو عروج حاصل ہوا۔

اودھ کے صوبے دار سعادت خاں نے فیض آباد کو دار السلطنت بنایا اور برہان الملک کا لقب اختیار کیا۔ برہان الملک کے بعد صفدر جنگ اور پھر شجاع الدولہ کے عہد تک فیض آباد اودھ کا صدر مقام رہا۔

آصف الدولہ کے دور میں فیض آباد کے بجائے لکھنؤ دار الحکومت قرار پایا اور آصف الدولہ کی سخاوت اور لکھنؤ کی خوش حالی کا شہرہ ہوا۔ پھر غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کا زمانہ آیا۔ سیاسی اعتبار سے انگریزوں کا عمل دخل بڑھا لیکن لکھنؤ کی گہما گہمی اور رونق میں کمی نہیں آئی۔

سلطنتِ اودھ کی خوش حالی کا شہرہ سن کر دہلی کے متعدد شاعروں نے فیض آباد اور پھر لکھنؤ کا رخ کیا۔ جو شاعر پہلے فیض آباد پہنچے تھے، وہ بھی بعد میں لکھنؤ آ گئے۔ اس طرح لکھنؤ میں ادیبوں اور شاعروں کی ایک دنیا آباد ہوگئی۔ میر ضاحکؔ، میر سوزؔ، سودا، میر حسنؔ وغیرہ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد پہنچ چکے تھے۔ میر تقی میرؔ، جرأتؔ، انشاؔ اور مصحفیؔ آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ پہنچے۔

لکھنؤ میں شعر و شاعری کا آغاز اُن شاعروں کی بدولت ہوا جن کی زندگی کا بڑا حصّہ دہلی میں گزرا تھا۔ وہ شاعری میں اپنی پرانی روش پر قائم رہے۔ لیکن وہ لوگ جو کم عمری میں فیض آباد یا لکھنؤ آئے تھے یا جنھوں نے فیض آباد یا لکھنؤ میں ہی آنکھیں کھولی تھیں، جب انھوں نے شاعری شروع کی تو دہلی کے مقابلے ایک نیا لب ولہجہ، نئی فکر اور نئے اسالیبِ شعر سامنے آئے۔ یہیں سے دبستانِ لکھنؤ کا آغاز ہوتا ہے۔

دبستانِ لکھنؤ کے اہم شاعروں کی فہرست طویل ہے۔ ان میں رنگینؔ، انشاؔ اور جرأتؔ اور ان کے بعد آنے والوں میں آتشؔ اور ناسخؔ اہم ترین ہیں۔ امام بخش ناسخؔ دبستانِ لکھنؤ کے سب سے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان سے دبستانِ لکھنؤ کو استحکام حاصل ہوا۔ اسی دور میں زبان کی اصلاح ہوئی۔ متروکات کی فہرست سازی ہوئی۔ شاعری کے نئے اصول و ضوابط مقرر ہوئے۔ اس ضمن میں ان کے شاگرد علی اوسط رشکؔ کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ رشکؔ کے علاوہ بحرؔ، وزیرؔ، منیرؔ، برقؔ وغیرہ کا شمار ناسخؔ کے مشہور شاگردوں میں ہوتا ہے۔ آتشؔ کے شاگردوں میں پنڈت دیا شنکر نسیمؔ، رندؔ، صباؔ، شوقؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

لکھنؤ کی خوش حالی اور عیش و عشرت کی زندگی نے شعر و ادب کو بھی متاثر کیا۔ شاعری میں نشاطیہ لب ولہجہ عام ہوا۔ داخلیت پر خارجیت کو غلبہ حاصل ہوا۔ اعضاے بدن ہی نہیں، لباس اور زیورات کی تفصیلات بھی رقم ہونے لگیں۔ نازک خیالی اور زبان کی شیرینی پر زور دیا گیا۔ شعری صنعتوں کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہونے لگا اور رعایتِ لفظی کی طرف توجہ زیادہ ہوگئی۔ لکھنؤ میں غزل کے علاوہ جن اصنافِ سخن پر خاطر خواہ توجّہ دی گئی ان میں مرثیہ، مثنوی، قصیدہ، ریختی اور واسوخت قابلِ ذکر ہیں۔

فورٹ ولیم کالج (1800) :

اٹھارھویں صدی کے آخر میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریز جنوبی ہندوستان پر بھی قابض ہوگئے۔ تاجر بن کر آنے والی یہ غیر ملکی قوم پورے ہندوستان پر حکومت قائم کرنے کے منصوبے کے مطابق حکمتِ عملی تیار کرنے لگی۔

انگریز اس حقیقت سے واقف تھے کہ تجارت کے فروغ اور ملک پر حکمرانی کے لیے یہاں کی زبان، طور طریقوں، رسم و رواج اور قاعدے قانون سے واقفیت ضروری ہے۔ اس وقت حکومت کی زبان فارسی تھی۔ لیکن عوامی سطح پر بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو تھی۔ انگریز گورنر جنرل ویلزلی نے یہ محسوس کیا کہ انگلینڈ سے آنے والے نئے حکام اور عام ملازمین دیسی زبانوں سے واقف ہوں تو یہاں کے مالی اور فوجی انتظامات بہتر طور پر سنبھالے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ 4 رمئی 1800 کو ایک مستقل تعلیمی ادارے 'فورٹ ولیم کالج' کا قیام عمل میں آیا۔ ویلزلی نے کالج میں کئی شعبے قائم کیے اور لائق اساتذہ کا تقرر کیا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو ہندوستانی زبان کے شعبے کا صدر منتخب کیا گیا۔ گلکرسٹ نے زبان کے مسائل میں گہری دل چسپی لی۔ انھوں نے نہ صرف خود تصنیف و تالیف کا کام کیا بلکہ اس عہد کے کئی نامور نثر نگاروں کی خدمات حاصل کیں اور ان سے ایسی کتابیں ترجمہ، تصنیف و تالیف کرائیں جن میں سے اکثر آج بھی اہمیت رکھتی ہیں۔

ان نامور قلم کاروں میں میر امّنؔ، حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوانؔ، مرزا علی لطفؔ، شیر علی افسوسؔ، میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خاں ولاؔ اور للّو لال جی قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں کی تصانیف میں میر امّن کی 'باغ و بہار' کا نام سرِ فہرست ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی شائع کردہ کتابوں سے ایک طرف جدید نصابی ضرورتوں کا تصوّر ذہن میں روشن ہوا تو دوسری طرف سادہ اور سلیس نثر لکھنے کی روایت قائم ہوئی۔ اس کی بدولت اردو نثر فارسی آمیز اور پُرتصنع اسلوب سے نکل کر جدید دور میں داخل ہوئی۔ گلکرسٹ نے چھاپے کے لیے اردو ٹائپ کا مطبع قائم کیا جس سے اردو کتابوں کو شائع کرنے کا چلن عام ہوا۔

فورٹ ولیم کالج میں درسی کتابوں کو چھاپتے وقت کتابوں میں مشقیں، فرہنگیں، تعارفی نوٹ اور ضروری حاشیے بھی درج کیے جاتے تھے۔ صحیح تلفّظ کے لیے اعراب یعنی، زبر، زیر، پیش کا استعمال کیا گیا۔ دو لفظوں کے درمیان فاصلہ، دو مصرعوں کی ترتیب، پیراگراف، واوین اور کاما وغیرہ سے فقروں کو واضح کرنے کا طریقہ رائج ہوا۔ کالج نے طباعت و اشاعت میں نئے نئے تجربے کیے۔ نصابی کتابوں کی تیاری، پرانی کتابوں سے انتخاب، املا اور اسلوبِ نثر کی معیار بندی اور صحیح طباعت کی جانب توجہ دی گئی۔ 'باغ و بہار'، 'مثنوی سحر البیان' اور 'کلیاتِ میر' کی طباعت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

میر شیر علی افسوسؔ (1732-1809) : میر شیر علی افسوس نارنول کے رہنے والے تھے، دہلی میں پیدا ہوئے۔ فیض آباد لکھنؤ اور بنارس میں ان کا قیام رہا۔ 1800 میں فورٹ ولیم کالج میں مترجم کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کے ذمے ترجمے کے ساتھ ساتھ مسوّدات کی تصحیح کا کام بھی تھا۔ ان کی مشہور کتابوں میں 'گلستاں' کا اردو ترجمہ 'باغِ اردو' ہے۔ سجان رائے بھنڈاری کی فارسی کتاب 'خلاصۃ التواریخ' کا اردو ترجمہ انھوں نے 'آرائشِ محفل' کے نام سے کیا۔

میر امّنؔ (1750-1837) : ان کا تفصیلی تعارف باب-15 (اردو میں داستان گوئی کی روایت) میں کیا جاچکا ہے۔

میر بہادر علی حسینیؔ : میر بہادر علی حسینی کا تعلق دلّی سے تھا۔ وہ 1801 سے 1808 تک فورٹ ولیم کالج میں رہے۔ گل کرسٹ نے ان کی لیاقت کی بڑی تعریف کی ہے۔ انھوں نے 'نثرِ بے نظیر' کے نام سے 'مثنوی سحرالبیان' کا خلاصہ، 'اخلاقِ ہندی' کے عنوان سے، سنسکرت کی مشہور کتاب 'ہتوپدیش' کا ترجمہ، 'نقلیات' کے نام سے، دو جلدوں میں کہانیوں کا مجموعہ اور 'رسالۂ گل کرسٹ' کے نام سے گل کرسٹ کی قواعد کا اردو میں خلاصہ شائع کیا۔ ان کے علاوہ کئی دوسری کتابوں کی تیاری میں بھی ان کا تعاون شامل رہا ہے۔

گلکرسٹ (1759-1841) : ڈاکٹر جان بارتھ۔ وِک گلکرسٹ جنوبی افریقہ کے شہر ایڈنبرا میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ بعد میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے انھوں نے طِب کی تعلیم حاصل کی۔ روزگار کی تلاش میں پہلے وہ ویسٹ انڈیز گئے جہاں انھوں نے نیل کی کاشت کاری سیکھی اور چند سال وہاں رہ کر 1782 میں ممبئی آ گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت فوجی طِبی عہدے پر ان کا پہلا تقرر سورت میں ہوا۔ ہندوستان آنے کے بعد انھوں نے یہ محسوس کیا کہ مقامی باشندوں کی زبان سے واقفیت کے بغیر وہ اپنی منصبی ذمے داریاں بہ خوبی نہیں نبھا سکتے۔ اپنے اسی احساس کے تحت گلکرسٹ نے پوری توجہ سے ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ کیا۔ جس کی بدولت انھوں نے ایک استاد اور پھر محقق کا درجہ حاصل کر لیا۔

1800 میں گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے صدر مقرر ہوئے۔ انھوں نے ہندوستانی انگریزی لغت، ہندوستانی علم اللسان، اردو صرف و نحو اور مشرقی زبان دانی جیسے موضوعات پر مشتمل تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں لکھی ہیں۔ انھوں نے تصنیف، تالیف، طباعت، ترجمہ اور املا وغیرہ میں جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اردو زبان کو بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کیا۔ 1805 میں وہ انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں بھی انھوں نے اردو درس و تدریس کا کام جاری رکھا۔ ان کا انتقال پیرس میں ہوا۔

حیدر بخش حیدری (1768/69-1813/14) : ان کا تذکرہ باب۔15 میں کیا جا چکا ہے۔

مظہر علی خاں وِلاؔ : مظہر علی دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔فورٹ ولیم کالج میں انھوں نے مادھونل اور کام کنڈلا کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔اس کے علاوہ برج بھاشا سے 'بیتال پچیسی' کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔

قدیم دلّی کالج (1825) :

انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کے بعد انگریزوں کا قائم کردہ دوسرا بڑا تعلیمی و تصنیفی ادارہ 'دلّی کالج' تھا۔فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد انگریز سول اور فوجی ملازمین کو ہندوستانی زبان بالخصوص اردو سکھانا تھا۔اس کے برعکس دلّی کالج ہندوستانی نوجوانوں میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم اور انگریزی زبان کو عام کرنے کے مقصد سے قائم کیا گیا تھا۔1825 میں غازی الدین حیدر کے مدرسے میں 'دلّی کالج' کا قیام عمل میں آیا۔مسٹر ٹیلر اس کے سیکریٹری اور پرنسپل مقرر ہوئے۔

دلّی کالج میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم و تدریس کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔کئی لائق اور باصلاحیت اساتذہ رکھے گئے تھے۔تین سال بعد انگریزی کا شعبہ قائم ہوا۔1830 میں جب اعتمادالدولہ نے ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی رقم اس کالج کے لیے وقف کی تو اس کی ترقی کا نیا دور شروع ہوا۔نئے نصاب مرتّب ہوئے۔درسی کتابیں تیار کی گئیں۔ترجمے کے کام میں تیزی آئی۔طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوا۔کچھ ہی برسوں میں دلّی کالج نے ایک اہم تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل کر لی۔

اس دور کے کئی نامور ادیب اور شاعر اس سے وابستہ ہو گئے۔ان میں مولانا صدرالدین آزردہؔ اور امام بخش صہبائیؔ بھی شامل تھے۔ان ادیبوں نے دلّی کالج کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لیا۔سالانہ مشاعرے کا انعقاد اور ادبی بحث و مباحثہ کا دور شروع ہوا۔یہ کالج اجمیری دروازے کے پاس واقع تھا۔

اس کالج کو کئی مخلص اور لائق پرنسپل بھی ملے۔ان میں مسٹر ٹیلر، بوترو اور ڈاکٹر اشپرنگر کے نام بے حد اہم ہیں۔ کالج کے قیام کے ساتھ ہی اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اعلیٰ درجے کی علمی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔اس مقصد کے تحت 1843 میں 'دہلی ورنا کیولر سوسائٹی' قائم ہوئی۔اس سوسائٹی نے سائنس، ریاضی، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات سے متعلق انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے کرائے۔اصطلاح سازی اور ترجمے کے اصول مرتّب کیے گئے۔

کالج کے اساتذہ نے اپنی علمی وادبی سرگرمیوں کو کالج تک محدود نہ رکھا بلکہ اخبارات اور رسائل کے ذریعے ملک بھر میں پھیلایا۔ کالج کے لائق استاد ماسٹر رام چندر کی ادارت میں نکلنے والے اخبار 'فوائدالناظرین' اور رسالہ 'محبِّ ہند' میں مختلف مضامین کے ساتھ یورپ کی ترقیات اور ایجادات کی تفصیلات بھی شائع ہوتی تھیں۔ اخبار میں جدید تقاضوں کے تحت ادبی، سیاسی، سماجی اور اصلاحی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

دلّی کالج کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور سائنس، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، قانون، طب، منطق فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اس کی بدولت اردو کے علمی وادبی سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ اردو زبان میں نئی نئی اصطلاحات اور الفاظ شامل ہوئے۔ دلّی کالج نے کئی روشن خیال علمی وادبی شخصیتوں کو پیدا کیا۔ ان میں ماسٹر رام چندر، مولانا امام بخش صہبائی، مولوی مملوک علی نانوتوی، پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، مولوی ضیاء الدین، سید ناصر علی اور مدن گوپال کے نام قابل ذکر ہیں۔

1857 میں کالج کا پہلا دور ختم ہوگیا۔ اسی بنا پر اسے 'قدیم دلّی کالج' کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں اس کالج کو 'اینگلو عربک کالج' کے نام سے دوسری زندگی ملی۔ آزادی کے بعد 1948 میں اسے پھر 'دہلی کالج' کا نام دیا گیا۔ موجودہ دور میں اس کا نام 'ذاکر حسین دہلی کالج' ہے۔

انجمنِ پنجاب (1865) :

1857 میں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور سارے ملک پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ دہلی اور لکھنو کے اجڑنے کے بعد بعض ادیب وشاعر ہجرت کرکے لاہور پہنچے۔ ان میں محمد حسین آزادؔ، منشی پیارے لال آشوبؔ، مولوی سید احمد دہلوی، مولوی کریم الدین اور خواجہ الطاف حسین حالی بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

لاہور اس وقت علم وادب کی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل جی۔ ڈبلو لائٹنر (Dr. G. W. Lietnor) مشرقی علوم میں گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے حکومتِ پنجاب کے ایما پر پنڈت من پھول کی صدارت میں 21؍جنوری 1865 کو 'انجمنِ مطالبِ مفیدۂ پنجاب' قائم کی جسے عام طور پر 'انجمنِ پنجاب' کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر کو اس کا صدر بنایا گیا۔ انجمن کے سرپرست اور محرّک اصلاً کرنل ہالرائڈ تھے لیکن ان کے منصوبوں کو عملی شکل ڈاکٹر لائٹنر نے عطا کی۔ انجمنِ پنجاب کے درجِ ذیل مقاصد تھے :

- قدیم مشرقی علوم کی ترویج و اشاعت — دیسی زبان کے ذریعے عوام میں تعلیم کا فروغ
- صنعت اور تجارت کی ترقی — معاشرتی، ادبی، سائنسی اور عام دلچسپی کے سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال کرنا اور حکومت کے تعمیری کاموں کو مقبول بنانا۔
- صوبے کے با اثر اہلِ علم اور افسروں کے درمیان رابطہ قائم کرنا۔
- انگریزوں کی بابت ہندوستانی عوام میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنا۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے مدرسوں اور کتب خانوں کا قیام عمل میں آیا۔ ادیبوں نے مختلف سماجی، تہذیبی علمی، ادبی، تعلیمی اور اخلاقی موضوعات پر مضامین لکھے۔ لیکچرز کا اہتمام کیا گیا اور بحث و مباحثے کا نیا دور شروع ہوا۔ لائٹنر نے کئی اہلِ قلم کو اس انجمن سے وابستہ کیا۔ ان میں محمد حسین آزادؔ سرِ فہرست تھے۔ محمد حسین آزاد لاہور کے ادبی حلقوں میں مشہور ہو چکے تھے۔ انھوں نے انجمن کے جلسے میں نئی شاعری کے عنوان سے ایک عالمانہ مقالہ پڑھا جسے لائٹنر نے بے حد پسند کیا اور لکچرر کے منصب پر ان کا تقرر کر دیا۔

محمد حسین آزاد کی وابستگی کے بعد انجمن پنجاب کو نئی تحریک اور توانائی ملی۔ لائٹنر کے بعد آزادؔ کو انجمن کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ کرنل ہالرائڈ، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، پنجاب کی کوششوں سے 8 مئی 1874 کو ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس میں حالؔی کا تعاون بھی شامل تھا۔ یہ مشاعرہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا۔ اس میں مصرعۂ طرح کے بجائے کوئی موضوع دیا جاتا تھا۔ اس کے تحت پہلا مشاعرہ 'برسات' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ اس قسم کے مشاعروں کا یہ سلسلہ کافی عرصے تک پابندی سے جاری رہا۔ حالؔی کی 'برکھارت'، 'نشاطِ امّید'، 'حبِّ وطن' اور 'مناظرۂ رحم و انصاف' وغیرہ نظمیں انجمن پنجاب ہی کی یادگار ہیں۔

انجمن نے ملک کی تعلیمی ضرورتوں کے پیشِ نظر تصنیف و تالیف اور ترجمے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس سے اردو نظم نگاری میں ایک نئے رجحان کی ابتدا ہوئی۔ ادب اور زندگی کے رشتوں کا احساس پیدا ہوا۔ اس انجمن نے اردو شاعری کو ایک نئی فکر دی جو بعد میں جدید شاعری کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی۔

سرسیّد تحریک:

1857 کے ہنگامے کے نتیجے میں جو افراتفری اور انتشار برپا ہوا تھا، انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں وہ کافی حد تک رفع ہو گیا تھا اور ایک نئے نظام کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ حکمرانِ وقت یعنی انگریزوں کی زبان، ان کا طرزِ معاشرت، طریقۂ تعلیم اور نصابِ تعلیم، سیاست نیز کھیل کود کے مقابلے بھی ہندوستانی اپنانے لگے تھے۔ وطن

سے محبت، آزادی کی لگن، آزادیِ فکر، آزادیِ نسواں، جمہوری نظامِ حکومت، فنونِ لطیفہ، سائنسی نقطۂ نظر، غرض اس نوع کی تمام باتوں کو ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ قبول کر رہا تھا۔ سیاسی اور نیم سیاسی ادارے وجود میں آ رہے تھے۔ اسی پس منظر میں مسلمانوں کی سماجی و اخلاقی اصلاح اور شعوری بیداری کے لیے سر سیّد احمد خاں نے 'تعلیمی تحریک' کا آغاز کیا۔ انھوں نے اپنی اس تحریک کا دائرہ صرف تعلیم تک محدود نہ رکھا بلکہ اسے ادب، مذہب وعقائد اور تہذیب و معاشرت تک وسعت دی۔ سر سیّد کی ان کوششوں کو 'سر سید تحریک' یا 'علی گڑھ تحریک' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سر سید تحریک کا سب سے اہم مقصد جدید تعلیم کا فروغ تھا۔ انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کی ترقی کا واحد ذریعہ جدید تعلیم ہے۔ انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ انگلینڈ کی یونیورسٹیوں کے طرز پر ہندوستان میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کریں۔ چنانچہ انھوں نے انگلینڈ کے اپنے سفر کے دوران کیمبرج اور آکسفورڈ کے تعلیمی نظام، طلبا کے طرزِ رہائش اور تعمیرات وغیرہ کا بہ غور جائزہ لیا۔ وہاں سے لوٹ کر 1875 میں علی گڑھ میں 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' (ایم۔ اے۔ او کالج) کی بنیاد ڈالی۔ 1920 میں اس کالج نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لیا۔ اب اس ادارے کا نام 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' ہے۔

سر سیّد کی علمی تحریک کا سلسلہ 'سائنٹفک سوسائٹی' سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سوسائٹی 1864 میں غازی پور میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف مغربی علوم کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ جدید علوم سے واقفیت عام ہو سکے۔ سوسائٹی نے پندرہ کتابوں کے اردو ترجمے شائع کیے۔ اس کے علاوہ ایک اخبار 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نام سے جاری کیا۔ جب کالج کے کاموں میں سر سید زیادہ مصروف ہو گئے تو سوسائٹی کی سرگرمیاں بھی کم ہوتی گئیں۔ آخر اسے کالج کمیٹی میں ضم کر دیا گیا۔ سر سیّد تحریک کے ضمن میں اس سوسائٹی کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

مسلمانوں کی فلاح اور ترقی کے لیے سر سید جدید تعلیم کے حصول کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے مسلمان تعلیمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے 1886 میں 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' قائم کی۔ ملک کے مختلف شہروں میں اس کے جلسے ہوا کرتے تھے جن میں جدید تعلیم کے حصول پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ ادارہ اب بھی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے خدمات انجام دے رہا ہے۔

سر سید تحریک کا دوسرا اہم مقصد معاشرے کی اصلاح تھا۔ چنانچہ سر سیّد نے حصولِ تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے پر بھی زور دیا۔ انگلینڈ کے اپنے سفر کے دوران وہ انگریزوں کی شائستگی اور تہذیب

سے بہت متاثر ہوئے۔ یہاں انھیں معلوم ہوا کہ انگلینڈ کے باشندے بھی پہلے طرح طرح کی معاشرتی برائیوں میں مبتلا تھے۔ تاہم رچرڈ اسٹیل اور ایڈیسن نام کے دو صاحبِ نظر حضرات نے دو رسالے 'ٹیٹلر' اور 'اسپیکٹیٹر' جاری کیے اور اپنے معاشرے کی اصلاح میں کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ سرسید نے طے کیا کہ وہ بھی اسی طرح اپنے ملک میں اصلاحِ معاشرہ کی خدمت انجام دیں گے۔ ہندوستان واپس آکر انھوں نے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا اور اس میں معاشرتی و اصلاحی موضوعات پر مضامین لکھے جانے لگے۔

سرسید کی ان تعلیمی اور اصلاحی خدمات سے اردو زبان و ادب کو بھی فیض پہنچا۔ سرسید کے عہد سے پہلے علمی موضوعات پر اظہارِ خیال کے لیے یا تو فارسی زبان استعمال کی جاتی تھی یا اردو کی دقیق اور پیچیدہ نثر۔ سرسید نے اردو میں سادہ اور بے تکلف علمی نثر کو رواج دیا۔ 'تہذیب الاخلاق' میں جن علمی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی موضوعات پر مضامین لکھے گئے، وہ اردو میں نئے تھے۔ ان مسائل و مباحث کے لیے ایک نئے طرز اور نئے اسلوب کی بھی ضرورت تھی۔ سرسیّد نے اس نئے اندازِ تحریر کو خود ایجاد کیا۔ سادگی اور بے تکلفی اس طرزِ تحریر کی خوبی ہے۔ سرسید کی بدولت اردو نثر علمی اور سائنسی موضوعات پر اظہارِ خیال کے قابل بن گئی۔

سرسید کو اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کے ضمن میں ایسے باکمال رفیق اور ساتھی ملے جنھوں نے اردو نثر کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے استحکام بخشا۔ ان میں مولانا الطاف حسین حالؔی، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزادؔ، مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور مولوی ذکاءاللہ کے نام شامل ہیں۔

ان اہلِ قلم نے اردو زبان و ادب کی توسیع میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مغربی ادب کی بعض نئی اصناف سے بھی متعارف کرایا۔ ہمارے قدیم ادب میں یا تو ان کا سرے سے وجود ہی نہ تھا یا اگر تھا تو ان کی شکل مختلف تھی۔ ان میں بعض نئے رجحانات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں مثلاً 'نیچرل شاعری کی تحریک' جسے آزادؔ اور حالؔی نے فروغ دیا۔ نیچرل شاعری سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے، وہ فطری جذبے کے تحت فطری انداز سے لکھا جائے۔ قدیم طرز کی شاعری سے انحراف بھی اسی تحریک کا ایک جُز ہے۔ اردو میں جدید تنقید کا آغاز بھی سرسید اور رفقائے سرسید سے ہوتا ہے۔ ان کے رفیقوں میں حالؔی اور شبلی نے اردو تنقید کو بلند مقام پر پہنچایا۔ انھوں نے سوانح نگاری کے فن کو بھی فروغ دیا۔ تاریخ نگاری کا علمی انداز بھی اسی دور میں شروع ہوا۔ اس ضمن میں شبلی، عبدالحلیم شررؔ اور ذکاءاللہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اردو میں نئے طرز کے قصّے لکھ کر ناول کو مقبول بنایا۔ اس عہد میں مقالہ نگاری کا رواج بھی عام ہوا۔ محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، شبؔلی، اور حالؔی کے مقالے اردو ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔

سرسید تحریک کی خدمات تاریخی، سماجی اور ادبی ارتقا کی راہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس تحریک نے بیداری کے اس دور کا آغاز کیا جس کی بدولت ادب کا رشتہ زندگی سے مستحکم ہو گیا نیز صحت منداور توانا اسالیب وجود میں آئے۔ ادب، سماج اور تہذیب کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ بن گیا۔

انجمن ترقّی اردو (ہند) (1903) :

اردو کی علمی اور ادبی حیثیت کو جن اداروں نے فروغ بخشا ان میں انجمن ترقی اردو خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ انجمن شروع میں 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' کی ایک ضمنی شاخ تھی جس نے ایک مستقل ادارے کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس کے پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ اور نائب صدور ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ اور مولانا حالی تھے۔ شبلی نعمانی اس انجمن کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ انجمن کے مقاصد درج ذیل تھے :

- اصلاحِ زبان یعنی غیر مانوس، اجنبی الفاظ و محاورات کو رفع کرنا اور ان سے بچنا اور صحیح اور فصیح زبان کو رواج دینا۔
- ہندوستان کے جن اضلاع میں اردو کا رواج نہیں ہے یا کم ہے ان میں اردو زبان کو رواج دینے کی کوشش کرنا۔
- قدیم ادبی تصانیف کو ضائع ہونے سے بچانا اور جدید کو ترقی دینا۔
- علمی کتب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اصطلاحات مرتّب کرنا۔

شروع میں انجمن کا دفتر علی گڑھ میں تھا۔ 1912 میں جب مولوی عبدالحق سکریٹری منتخب ہوئے تو انجمن کا دفتر اورنگ آباد منتقل ہو گیا۔ جو اس زمانے میں ریاست حیدرآباد کا ایک حصّہ تھا۔ یہاں انجمن کو پھلنے پھولنے کا بھرپور موقع ملا۔ کچھ عرصے بعد یہ محسوس ہوا کہ انجمن کا دفتر کسی مرکزی مقام پر ہونا چاہیے تاکہ اردو کی اشاعت و ترقی کا کام ملک گیر پیمانے پر کیا جا سکے اس لیے نومبر 1938 میں اسے دہلی منتقل کر دیا گیا۔

'بابائے اردو' کی کوششوں سے انجمن نے علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت کے علاوہ اردو تحریک کو فروغ دینے میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ ابتدا میں انجمن نے خالص علمی اور ادبی ادارے کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیے۔ انجمن کی سرپرستی میں کتب خانے قائم کیے گئے۔ مختلف زبانوں کی کتابوں کے تراجم ہوئے۔ 'اردو' اور 'سائنس' جیسے رسالوں کا اجرا عمل میں آیا۔ اپریل 1939 میں 'ہماری زبان' جاری ہوا۔ انجمن نے اردو ادب کی کئی قدیم اور نایاب کتابیں اور شعرا کے دیوان شائع کیے۔

انجمن ترقی اردو نے علمی و ادبی خدمات کے ساتھ سماجی اور سیاسی سطح پر اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف عملی جدوجہد میں بھی حصّہ لیا۔ اردو کے تحفظ اور فروغ کے لیے کئی اردو مراکز کا قیام عمل میں آیا۔ انجمن کی کوششوں سے کئی اسکولوں، کالجوں اور مدرسوں میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ انجمن کے ذریعے ملک کی آزادی تک تقریباً دوسو کتابیں شائع ہوچکی تھیں۔ ان میں ادب، تاریخ، تذکرے، سیاسیات، فلسفہ، قانون، قواعد وغیرہ جیسے اہم موضوعات سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ آزادی کے بعد بھی انجمن ترقی اردو (ہند) کا علمی و ادبی سفر جاری ہے جس کا مرکزی دفتر دہلی میں ہے۔

دارالمصنفین، اعظم گڑھ (1915) :

دارالمصنفین ملک کا مشہور تحقیقی و تصنیفی ادارہ ہے۔ اس کا خاکہ مولانا شبلی نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں تیار کرلیا تھا، مگر اس کا قیام ان کی وفات (1914) کے بعد ان کے عزیز شاگردوں مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعودعلی ندوی کے ہاتھوں 1915 میں عمل میں آیا۔ دارالمصنفین کے قیام کے بعد مولانا مسعودعلی ندوی اس کے انتظامی امور کے سربراہ، مولانا سید سلیمان ندوی تحقیقی و تصنیفی امور کے ناظم اور مولانا عبدالسلام ندوی اس کے رفیقِ تصنیف وتالیف مقرر ہوئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی باہر رہ کر اس کے عمومی وانتظامی امور میں معاون رہے۔ 1916 میں سید سلیمان ندوی کی ادارت میں دارالمصنفین سے رسالہ 'معارف' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کی اشاعت کا سلسلہ اب بھی قائم ہے۔ اس کا شمار ملک کے بلند پایہ علمی وتحقیقی رسائل میں کیا جاتا ہے۔ سید سلیمان ندوی کے بعد بالترتیب شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا ضیاءالدین اصلاحی ناظمِ دارالمصنفین اور مدیرِ 'معارف' رہے۔ سید نجیب اشرف ندوی بھی ایک عرصے تک اس ادارے سے وابستہ رہے ہیں۔ دارالمصنفین کے مقاصد حسب ذیل تھے :

- ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہلِ قلم کی جماعت پیدا کرنا۔
- بلند پایہ کتابوں کا ترجمہ۔
- تصنیف شدہ کتابوں اور دیگر علمی و ادبی کتابوں کی طبع واشاعت۔

یہ ادارہ اگرچہ دینی علوم اور تاریخ کے تعلق سے جدید تحقیق وتصنیف کو فروغ دینے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا لیکن یہاں اردو زبان وادب سے متعلق کتابوں کی تصنیف اور تحقیق وتدوین کی جانب بھی توجہ دی گئی۔

دارالمصنفین نے اب تک دوسو سے زیادہ علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ان میں سات جلدوں پر مشتمل 'سیرت النبیؐ'، 'سیر الصحابہؓ' اور 'تاریخِ اسلام' کو بہت مقبولیت ملی۔'الفاروق'، 'شعر العجم'، 'خطباتِ مدراس'، 'سیرتِ عائشہؓ'، 'خیّام'، 'عرب و ہند کے تعلقات'، 'اُسوۂ صحابہؓ'، 'موازنۂ انیس و دبیر' اور 'اقبالِ کامل' جیسی کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ دارالمصنفین سے وابستہ اہلِ قلم میں سب سے نمایاں شخصیت مولانا سید سلیمان ندوی کی ہے۔

ادبِ لطیف :

سرسیّد اور حالؔی کی اصلاحی تحریک کے بعد اردو ادب میں ایک نئے رجحان کو مقبولیت حاصل ہوئی۔نثر میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد پڑی جسے 'ادبِ لطیف' کہا جاتا ہے۔ادبِ لطیف کے نمائندوں نے ایک ایسے اسلوبِ نثر کو رواج دینے کی کوشش کی جس کی پہچان شعریت اور جذباتیت سے وابستہ تھی۔ یہ کوشش کسی منظّم تحریک کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس نے مختلف ادیبوں کے نثری اسلوب میں ایک حاوی رجحان کی صورت اختیار کر لی تھی اس لیے اس اسلوب کو کبھی رومانی اسلوب کا نام دیا گیا، کبھی ادبِ لطیف کے نام سے یاد کیا گیا۔اب اسے ادبِ لطیف ہی کی ذیل میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ان ادیبوں پر محمد حسین آزاد کی شگفتہ نثر کا گہرا اثر تھا۔آزاد کی نثر کو بھی رومانی نثر کہا جاتا ہے۔یہ ادیب جمالیاتی قدروں کے پاسدار اور حسن کے پرستار تھے۔ادبِ لطیف کے لکھنے والوں نے عام طور پر حسنِ فطرت اور حسن و عشق کے معاملات کو اپنا موضوع بنایا۔یہ ادیب رابندر ناتھ ٹیگور کی نثر سے بھی متاثر ہوئے۔عبدالحلیم شرؔر، میر ناصر دہلوی، خلیق دہلوی، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوشؔ، ل احمد وغیرہ کی نثر کو ادبِ لطیف کی نمائندہ نثر سے منسوب کیا جاتا ہے۔

دارالترجمہ عثمانیہ، حیدرآباد (1917) : دارالترجمہ عثمانیہ، حیدرآباد کا شمار بیسویں صدی کے اہم تصنیفی اداروں میں ہوتا ہے۔اس کے قیام کا بنیادی مقصد سائنس اور دوسرے علوم وفنون کی نصابی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔

نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی کے بعد 'حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس' کی بنیاد رکھی گئی۔سر اکبر حیدری کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔اس کانفرنس کی علمی و ادبی کوششوں سے ایک نیا شعور پیدا ہوا۔نظام نے علم و ادب کی ترقی میں خاص دل چسپی لی۔اس وقت حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو تھی اس لیے ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کی

ضرورت محسوس کی گئی جہاں اردو میں اعلیٰ تعلیم دی جا سکے۔ سب سے بڑا مسئلہ اردو میں نصابی کتابوں کی دستیابی کا تھا۔ اسی مقصد کے تحت عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے 1917 میں تالیف و ترجمہ کا شعبہ قائم کیا گیا جسے 'دارالترجمہ' کہتے ہیں۔ دارالترجمہ میں اصطلاحات اور ترجمے کے کام کو بخوبی انجام دینے اور نصابی کتب کی تیاری کے لیے کئی کمیٹیاں بنائی گئیں جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے :

- **مجلسِ وضعِ اصطلاحات:**

  اس کمیٹی کا کام انگریزی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کرنا اور اردو میں نئی اصطلاحات وضع کرنا تھا۔

- **مجلسِ اہلِ علم وفن:**

  یہ مجلس مختلف علوم کے ماہرین پر مشتمل تھی جن سے وضع اصطلاحات کے سلسلے میں مشورہ لیا جاتا تھا۔

- **مجلسِ انتخابِ نصابات:**

  یہ مجلس درس و تدریس کے لیے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا انتخاب کرتی تھی۔

- **مجلسِ نظرِ ثانی:**

  ترجمہ شدہ کتابوں اور وضع کردہ اصطلاحات پر یہ کمیٹی نظرِ ثانی کرتی تھی۔

- ادبی نقطہ نظر سے ترجموں کو دیکھنے والی کمیٹی
- مذہبی نقطۂ نظر سے ترجموں پر غور کرنے والی کمیٹی۔

دارالترجمہ سے علی حیدر نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، مولوی وحیدالدین سلیم، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی اور جوش ملیح آبادی جیسی شخصیتیں وابستہ تھیں۔ ان میں وحیدالدین سلیم کا نام سب سے نمایاں ہے۔

دارالترجمہ میں پہلے ابتدائی سے ثانوی جماعتوں تک کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ 1919 میں جب عثمانیہ یونیورسٹی وجود میں آئی تو اعلیٰ درجات کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے اور اصطلاحات وضع کی گئیں۔ ان میں آرٹس، سائنس، کامرس کے علاوہ قانون، میڈیکل اور انجینئرنگ کی کتابیں بھی اردو میں تیار کی گئیں۔ دارالترجمہ میں مختلف علوم وفنون کی 465 کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ اس ادارے نے 1917 سے 1948 تک اپنی عظیم الشان روایات کو برقرار رکھا۔ 1950 میں عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دے دیا گیا۔

ترقی پسند تحریک (1936) :

بیسویں صدی کا ہندوستان سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے کئی طرح کے مسائل سے دو چار تھا۔ ملک میں ان کے حل کے لیے طرح طرح کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ ادیبوں نے بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصّہ لیا۔ اس طرح کی کوششوں میں ترقی پسند تحریک کا نام سرفہرست ہے۔ اردو ادب میں سرسید تحریک کے بعد یہ سب سے بڑی ادبی تحریک تھی جس کا مقصد ادب کو سماج سے جوڑنا تھا۔ لندن میں مقیم چند نوجوان ہندوستانی طلبا نے 1935 میں 'ترقی پسند مصنفین کی انجمن' قائم کی۔ ملک راج آنند کو اس انجمن کا صدر مقرر کیا۔ تحریک کا ایک منشور تھا جس پر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے۔ ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس سنہا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے دستخط کیے تھے۔ اس منشور میں یہ کہا گیا تھا کہ ''ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، پُرانے خیالات اور معتقدات کی جڑیں ہلتی جارہی ہیں اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیئت کا لباس دیں اور ملک کو ترقی کے راستے پر لگانے میں ممدّ و معاون ہوں۔''

ان نوجوانوں میں بدلتے ہوئے دور کا احساس پہلے ہی سے موجود تھا۔ 1932 میں 'انگارے' نام کی کتاب شائع ہوئی جس کے افسانوں میں توہم پرستی، بداعتقادی، اندھی تقلید اور رجعت پسندی کے خلاف احتجاج تھا۔ یکم اپریل 1936 کو لکھنؤ میں ترقی پسند ادبی تحریک کی پہلی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت پریم چند نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے جو خطبہ دیا، وہ بہت مشہور ہوا۔ اس موقعے پر اپنے خطبے میں انھوں نے ترقی پسندی کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا :

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حُسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سُلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''

اس تحریک نے جہاں ادب کے معیار کو بدلا اور بلند کیا، وہیں اس نے سماج سے گہرے رشتے بھی استوار کیے۔ غریبوں، مظلوموں، سماج کے دبے کچلے لوگوں کے استحصال اور ان کی حق تلفی کے خلاف آواز بلند کی۔ ملک کی آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اردو نظم کو نئی منزلوں اور بلندیوں تک پہنچایا۔ ناول، افسانہ اور ڈراما جیسی اصناف میں کئی نئے انقلابی مسائل اور موضوعات کو جگہ دی۔ اس طرح ہمارے ادب کے سرمایے میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

ترقی پسند شعرا میں فیض احمد فیضؔ، مخدومؔ محی الدین، سردارؔ جعفری، کیفیؔ اعظمی، مجروحؔ سلطانپوری، جاں نثار اختؔر اور احمد ندیم قاسمی کے نام اہم ہیں۔ فکشن نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس کی خاص اہمیت ہے۔ سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد اور انتظار حسین کے افسانوی فن کی شناخت اسی دور میں قائم ہوئی لیکن اپنے رویوں میں یہ ترقی پسند نہیں تھے۔

حلقۂ اربابِ ذوق (1939):

حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام 16/ اکتوبر 1939 کو لاہور میں عمل میں آیا۔ پہلے اس کا نام 'بزمِ داستان گویاں' تھا۔ اس کے تحت ادبی نشستیں منعقد ہوتی تھیں جن میں شعری اور افسانوی ادب پر جدید مغربی تنقیدی تصورات کے تحت بحث کی جاتی تھی۔ اس بزم کے ادبی گروہ میں دن بہ دن اضافہ ہوتا رہا اور بعد میں اس بزم کا نام 'حلقۂ اربابِ ذوق' ہو گیا۔ 'ترقی پسند تحریک' اور 'حلقۂ اربابِ ذوق' دونوں تنظیمیں ایک ہی دور میں ادبی منظر نامے پر ظاہر ہوئیں۔ اپنے ادبی نظریات کے اعتبار سے یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ترقی پسند تحریک 'ادب برائے زندگی' پر زور دیتی ہے جب کہ 'حلقۂ اربابِ ذوق'، 'ادب برائے ادب' پر اصرار کرتا ہے۔

حلقے کی بنیاد ڈالنے والوں میں حفیظ ہوشیارپوری، شیر محمد اختؔر، تابشؔ صدیقی، محمد افضل اور سید نصیر احمد شاہ کے نام اہم ہیں۔ بعد میں میراجی اور ن م راشد حلقے میں شامل ہوئے۔ ان دونوں نے مل کر 'حلقۂ اربابِ ذوق' کے اغراض و مقاصد طے کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ یہ حضرات مغربی ادیبوں کے علاوہ فرائڈ اور یونگ کے نظریات سے متاثر تھے۔ میراجی نے علامتی زبان پر زور دیا۔ موضوع کے برخلاف ہیئت کے تجربے کو اہمیت دی۔ اسی دور میں آزاد نظم کی بنیادیں مستحکم ہوئیں اور غیر رسمی زبان کو فروغ ملا۔ میراجی اور ن م راشد کے علاوہ جن لوگوں نے 'حلقۂ اربابِ ذوق' کے مقاصد عام کرنے میں اہم رول ادا کیا ان میں قیوم نظر، مختاؔر صدیقی، یوسف ظفر اور ضیاؔ جالندھری وغیرہ کی خاص اہمیت ہے۔ لاہور کے بعد 'حلقۂ اربابِ ذوق' کی دوسری شاخ 1941 میں ضیا جالندھری کے ایما پر دہلی میں قائم ہوئی جس کی نشست ہر ہفتے اینگلو عربک کالج میں ہوا کرتی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد ملک و بیرون ملک کے کئی شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں اور اس کی تشہیر کے لیے رسالے بھی نکالے گئے۔ حلقے نے شعر و ادب کے جن نئے تصورات کی بنیاد رکھی تھی، ان میں سے بعض تصورات کو نمائندہ ادیبوں نے بھی برقرار رکھا۔ موجودہ ادوار میں بھی کسی حد تک ان کی معنویت قائم ہے۔

جدیدیت :

جدیدیت ایک رجحان ہے۔ بعض نقادوں نے اسے تحریک بھی کہا ہے۔ جدیدیت کو ایک مسلسل میلان کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ہر دور میں اس کی پہچان کے عناصر مختلف ہوتے ہیں۔ جدیدیت کے اوّلین سرے علامت نگاری کے اس رجحان سے ملتے ہیں جس کے آغاز وارتقا کا تعلق مغرب میں انیسویں صدی کے نصفِ آخر سے ہے۔ علامتی رجحان نے تخلیقی زبان کا ایک نیا تصور دیا تھا۔ روایت شکنی بھی کی گئی اور روایت کو نئے معنی بھی دیے گئے۔ اسلوب و ہیئت کی نئی صورتیں وضع ہوئیں جو انفرادی تجربے کی مظہر تھیں۔ یہ سلسلہ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل تک بڑے زور وشور کے ساتھ جاری رہا۔ جب کہ ہمارے یہاں اس کے آثار 1955 کے بعد سے ملتے ہیں۔ جدیدیت نے صرف شاعری، افسانوی ادب اور ڈراما وغیرہ ہی پر گہرے اثرات قائم نہیں کیے بلکہ مصوّری، موسیقی اور عمارت سازی جیسے فنون پر بھی اُس نئے تخلیقی ذہن کی کارکردگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے جسے جدید کہا جاتا ہے اور جس کی حسیت بھی جدید کہلاتی ہے۔

جدیدیت نے ہیئت و موضوع کی وحدت پر زور دیا اور اس امر پر بھی اصرار کیا کہ تخلیقی زبان کثرتِ معنی کی حامل ہوتی ہے۔ اور کثرتِ معنی سے ابہام پیدا ہوتا ہے۔ ابہام، حیرت ہی کا موجب نہیں ہوتا، مزید جاننے کے لیے ہماری جستجو کو سرگرم بھی رکھتا ہے۔ جدیدیت کے فکری سلسلے وجودیت سے ملتے ہیں۔ جدیدیت نے ذات کے تجربے، فرد کی اہمیت اور انفرادی آزادی جیسے تصورات وجودیت ہی سے اخذ کیے ہیں۔ اجنبیت، بے گانگی اور تنہائی کے احساس نے ذات کے اسی تجربے سے نمو پائی ہے۔ اکثر ادیبوں نے قدروں کے بحران کو بھی خاص عنوان دیا ہے۔

جدید ادب میں یہ موضوعات حاوی رجحان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، عمیقؔ حنفی، شفیق فاطمہ شعریٰؔ، قاضی سلیم، محمد علویؔ، بلراج کوملؔ، شہریارؔ، عادل منصوریؔ، زبیر رضویؔ، ندؔا فاضلی، باقؔر مہدی اور وحیدؔ اختر کی شاعری نئے انسان کے باطنی اضطراب کی مظہر ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جو جدیدیت کی نمائندہ کہلاتے ہیں۔

پاکستان میں وزیر آغا، جیلانی کامران، محمد سلیم الرّحمٰن، محمد صفدر، ساقؔی فاروقی، شکیب جلالی، شہزؔاد احمد، ظفؔر اقبال، احمد مشتاق اور افتخار جالبؔ نے شاعری میں جدیدیت کے رجحان کو فروغ دیا اور ایک نئی تخلیقی زبان پر ترجیح رکھی۔ خواتین میں کوثر ناہید، فہمیدہ ریاض، عذرا عباس، نسرین انجم بھٹی، شائستہ حبیبؔ، پروین شاکرؔ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

اردو افسانوی ادب میں سریندر پرکاش، غیاث احمد گدّی، جوگندر پال، اقبال مجید، اقبال متین، بلراج مین را کا فن نئے طرزِ احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان فن کاروں نے اُن محسوسات کو بھی زبان دینے کی کوشش کی ہے

جنھیں مبہم کہا جاتا ہے۔ اکثر کرداروں کو نام دینے کے بجائے اسمائے ضمیر سے کام لیا گیا یا 'میں' کو ترجیح دی گئی۔ واقعے سے گریز برتا گیا۔ پلاٹ کی رسمی تنظیم سے بھی انحراف کی کوشش کی گئی۔ اس قسم کے بعض تجربے اہم بھی ہیں۔ انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کا دور بھی جدیدیت کے عہدِ عروج سے تعلق رکھتا ہے لیکن انھیں جدیدیت کا نمائندہ نہیں کہا جاتا کیوں کہ 1960 سے قبل ہی ان کی انفرادیت قائم ہو چکی تھی۔

مابعدِ جدیدیت :

ادبی رجحانات کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ادب کا شعبہ ہمیشہ نت نئی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ تبدیلی زندگی ہی نہیں، ادب کا بھی تقاضا ہے۔ ادب میں جب کوئی چھوٹی یا بڑی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی محض یک طرفہ یا ادب ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ علم اور زندگی کے دوسرے بہت سے شعبوں میں بھی اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جدیدیت بھی ایک ثقافتی صورتِ حال تھی جس نے لفظ و معنی اور ان کے باہمی رشتے پر نئے سرے سے غور کرنے پر اُکسایا تھا۔ اردو میں 60-1955 سے تقریباً 85-1980 تک جدیدیت ایک حاوی رجحان کی حیثیت سے تخلیقی فن کاروں کی دل چسپی کا خاص موضوع تھا۔ دراصل مابعدِ جدیدیت بھی ایک نئی ثقافتی صورتِ حال کی مظہر ہے۔ مثلاً

- الیکٹرونک میڈیا (برقیاتی ذرائع) اور انفرمیشن ٹکنولوجی (اطّلاعاتی تکنیک) میں غیر معمولی ترقی۔
- ایک نئی صارفی تہذیب کے تحت بازار کا ایک بڑی قوت کے طور پر نمودار ہونا۔
- بازار محض چیزوں کی خرید و فروخت تک محدود نہیں ہے بلکہ علم، لفظ، معنی اور دماغ نے بھی خرید و فروخت کی اشیا کی صورت اختیار کر لی۔
- سرمایہ داری کا غیر معمولی طور پر فروغ جس نے زر پرستی کو ہوا دی۔ معاشی مقصد نے تمام دوسرے مقاصد پر سبقت حاصل کر لی۔
- عالمی سطح پر مذہبی و تہذیبی سخت گیری، نسل پرستی، فرقہ واریت اور آپسی منافرت کے جذبوں نے ان اعلیٰ انسانی قدروں کو پیچھے دھکیل دیا جو عمومی فلاح و خیر خواہی کی مظہر تھیں۔

درج بالا صورت حال کے پہلو بہ پہلو جس ادبی تھیوری کو مابعد جدید کہا جاتا ہے اور اس کا اصرار جن امور پر ہے، انھیں اس صورت میں ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

- لفظ کسی منطقی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ وہ من مانے ہوتے ہیں۔ یعنی لفظ کا اس کے معنی سے کوئی منطقی رشتہ نہیں ہوتا۔

- لفظ کے معنی بھی مستقل نہیں ہوتے۔ ان کا کوئی مرکز نہیں ہوتا۔ یعنی لفظ کے معنی گھڑی کے پنڈولم کی طرح ڈولتے رہتے ہیں اسی لیے ادب کی تفہیم ہمیشہ جاری رہنے والا عمل ہے۔
- معنی بھی بڑھتے اور پھیلتے ہیں، یعنی معنی کی افزائش کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔
- معنی قائم کرنے والا مصنف نہیں، قاری ہوتا ہے۔
- معنی ہی نہیں ہر شئے، ہر نظریہ، ہر حقیقت مرکز گریز ہے۔ انتشار اور بکھراؤ ہی مابعدِ جدیدیت کی پہچان ہے۔
- جدیدیت کی طرح مابعدِ جدیدیت بھی 'کیا' کے بجائے 'کیسے' کو خاص اہمیت دیتی ہے اسی لیے کسی بھی فن پارے کے پیچھے کارفرما اُن قاعدوں کی جستجو کرنا چاہیے جن سے اس نے تشکیل پائی ہے۔
- مابعد جدیدیت استناد (authority) اور روایتی قوانین و معیار (Canons) کو حتمی قرار نہیں دیتی۔ وہ ہر اس قدر، صداقت، اصول، قانون اور روایت کو سوال زد کرتی ہے جسے عمومی کسوٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
- کوئی تخلیق یا کوئی بھی متن معصوم اور بے میل نہیں ہوتا۔ دوسرے بہت سے متون کا وہ زائدہ ہوتا ہے۔ مابعد جدید تھیوری اسی کو بین المتونیت سے تعبیر کرتی ہے۔
- زبان شفّاف میڈیم نہیں ہے اسی لیے ادبی تفہیمات و تعبیرات میں اختلاف کی گنجائش قایم رہتی ہے۔ یہ اختلاف ہی اس بات کا مظہر ہے کہ معنی واحد ہے نہ خود مکتفی۔
- پس ساختیات (ردِ تشکیل)، ساختیاتی تحلیلِ نفسی، نَو مارکسیت، نَو تاریخیت، ثقافتی مطالعات، تانیثیت، پس نَو آبادیات جیسے تصورات کا بھی مابعدِ جدید تھیوری میں خاص درجہ ہے۔

اردو میں جن نقادوں نے خاص اہمیت کے ساتھ اس تھیوری کو اپنی تنقید کا سرگرم موضوع بنایا ان میں گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، فہیم اعظمی، قمر جمیل، ضمیر علی بدایونی، وہاب اشرفی اور قاضی افضال حسین کی تحریریں خاص وقعت رکھتی ہیں۔

غالب اکیڈمی (دہلی) (1969) :

اردو کے ممتاز شاعر مرزا غالب کی یاد میں غالب اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ اس اکیڈمی کے بانی معروف طبیب حکیم عبدالحمید تھے۔ علم و ادب سے دلی شغف اور غالب سے تعلقِ خاص نے انھیں غالب صدی کے موقع پر اس ادارے کے قیام پر آمادہ کیا۔ 'غالب اکیڈمی' غالب سوسائٹی کے زیرِ اہتمام کام کرتی ہے۔ جس کی عمارت اور دفتر بستی حضرت نظام الدین (ویسٹ) نئی دہلی میں واقع ہے۔ غالب اکیڈمی کی عمارت غالب کے مزار کے قریب ہے۔ اس

اکیڈمی کے زیرِ اہتمام غالب میوزیم، لائبریری اور آرٹ گیلری، تحقیقی گوشہ، اشاعتی شعبہ، بک سنٹر اور سیل کاونٹر کے علاوہ ایک آڈیٹوریم بھی ہے۔

اس ادارے کے زیرِ اہتمام غالب اور ان کے عہد و معاصرین پر بے شمار کتابوں کے علاوہ بڑی تعداد میں اردو زبان و ادب سے متعلق کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ایک رسالہ 'غالب' بھی اس ادارے کی جانب سے شائع کیا جاتا ہے۔ غالب اکیڈمی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کے ایک اہم مرکز کے طور پر قومی سطح پر اپنی اہمیت رکھتی ہے۔

غالبؔ انسٹی ٹیوٹ (1971) :

1969 میں غالبؔ صدی تقریبات کے موقع پر سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی اور فخر الدین علی احمد کی سربراہی میں غالبؔ میموریل کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس کی کوششوں سے 1971 میں غالبؔ کی یاد میں ایک اہم ادارہ 'غالب انسٹی ٹیوٹ' کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کی عمارت اور دفتر ماتا سندری لین، نئی دہلی میں واقع ہے۔ 'غالب انسٹی ٹیوٹ' غالبؔ اور معاصرین غالب کے علاوہ اردو کی ممتاز شخصیتوں اور دیگر موضوعات پر کتابیں شائع کرتا ہے۔

اس ادارے کے ذریعے اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف موضوعات و مسائل پر سمیناروں اور مذاکروں کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ ان میں غالب پر منعقد کیا جانے والا سالانہ بین الاقوامی سمینار خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس سمینار میں ملک اور بیرونِ ملک کے کئی بلند پایہ نقاد اور اسکالرس شرکت کرتے ہیں۔ اس ادارے کے زیرِ اہتمام ایک ششماہی رسالہ 'غالب نامہ' بھی شائع کیا جاتا ہے۔ ادارے کی عمارت میں سمینار ہال، لائبریری اور غالب میوزیم کے علاوہ 'ایوانِ غالب' کے نام سے ایک بڑا آڈیٹوریم بھی ہے جس میں مختلف مواقع پر ادبی و ثقافتی پروگراموں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ 'غالب انسٹی ٹیوٹ' کا شمار ملک کے اہم اردو اداروں میں ہوتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (نئی دہلی) (1996) :

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا قیام 1996 میں عمل میں آیا۔ اس ادارے کی حیثیت اردو زبان کے فروغ کے لیے قومی نوڈل ایجنسی کی ہے۔ اس سے قبل اس کا نام 'ترقی اردو بیورو' تھا جسے اردو زبان کے فروغ کے لیے مرکزی وزارت تعلیم و ثقافت نے قائم کیا تھا۔ 'قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان' ایک خود مختار ادارہ ہے لیکن اس کا انتظام و انصرام مرکزی حکومت کی 'وزارت فروغِ انسانی وسائل' کے ذمّے ہے۔

'قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان' کا موجودہ دفتر فروغ اردو بھون، جسولا وہار، نئی دہلی میں واقع ہے۔ اس ادارے کے تحت اردو زبان وادب کے فروغ سے متعلق مختلف سطحوں پر اقدامات کیے جاتے رہے ہیں۔ مختلف اسکیموں کے تحت بڑی تعداد میں ادبی، لسانی، تاریخی، تکنیکی اور دیگر موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کے علاوہ مصنفین کی جانب سے کتابوں کی اشاعت، مالی تعاون، کتابوں کی خریداری، یونیورسٹیوں اور کالجوں ودیگر اداروں کو سمیناروں اور مذاکروں کے انعقاد کے لیے مالی امداد دینے جیسے اقدامات اس ادارے کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ کونسل کے ذریعے ملک کے مختلف حصوں میں غیر سرکاری تنظیموں کے اشتراک سے کمپیوٹر سینٹرس بھی چلائے جاتے ہیں۔ ادارے کے زیرِ اہتمام 'فکر وتحقیق' اور 'اردو دنیا' کے نام سے دو رسالے بھی شائع ہوتے ہیں۔ کونسل بچوں کے ادب میں ترقی کے لیے ایک رسالہ 'بچوں کی دنیا' کے نام سے شائع کرتی ہے۔ اس طرح ایک قومی ادارے کی حیثیت سے کونسل اردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

مندرجہ بالا اداروں کے علاوہ ملک میں بہت سے ایسے سرکاری وغیر سرکاری ادارے قائم ہیں جو اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے کوشاں ہیں۔ ایسے اداروں میں این سی ای آر ٹی دہلی، ساہتیہ اکادمی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ دہلی، اردو اکادمی دہلی، فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ کے علاوہ مختلف ریاستی سرکاروں کے ذریعے قائم کردہ اردو اکادمیاں ہیں جو اردو کے فروغ سے متعلق مختلف قسم کے اقدامات کر رہی ہیں۔ ان اکادمیوں میں خاص طور سے اتر پردیش اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، ہریانہ اردو اکادمی، آندھرا پردیش اردو اکادمی، کرناٹک اردو اکادمی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، مہاراشٹر اردو اکادمی، گجرات اردو اکادمی قابلِ ذکر ہیں۔

باب 23

آزادی کے بعد کا ادبی منظرنامہ

1857 سے 1947 تک کے طویل دور میں ہماری قومی اور تہذیبی تاریخ اردو ادب کی تاریخ پر تقریباً ہر سطح پر اثر انداز ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں تسلسل اور تحرک پایا جاتا ہے۔ آزادی سے قبل کا اردو ادب آزادی کے نغموں سے معمور ہے۔ اُردو شاعری اور صحافت نے آزادی کی تحریک کو زبردست تقویت بخشی تھی۔ ہمارے قومی شعور کی تربیت میں بھی ان کا اہم حصّہ ہے۔ آزادی سے قبل 'ترقی پسند تحریک' اور 'حلقۂ اربابِ ذوق' نے جن نظریات کو بنیاد بنایا تھا ان کا تعلق نئے فلسفیانہ تصورات سے تھا۔ فن کی سطح پر بھی غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ روایت سے گریز کرنے کی کوشش کی گئی اور روایت کو از سرِ نو قبول کرنے کی طرف بھی رغبت پیدا ہوئی۔ آزادی کے بعد کے اردو ادب میں اسے واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ہمارا ملک 1947 میں آزاد ہوا۔ آزادی کے حصول کے لیے ہم نے ہزاروں قیمتی جانوں کی قربانی دی تھی۔ آزادی کے ساتھ ہی ہمیں تقسیمِ وطن کے سانحے سے بھی گزرنا پڑا۔ یہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ تھا، جو اردو ادیبوں پر شدّت کے ساتھ اثر انداز ہوا۔ اردو ادب میں یہ المیہ ایک ذاتی واردات کے طور پر نمایاں ہوا ہے۔ اس موضوع کے علاوہ اور بھی ایسے بہت سے موضوعات ہیں جنھیں مختلف ادیبوں نے اپنے اپنے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

غزل:

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ آزادی سے قبل فانؔی بدایونی، شاؔد عظیم آبادی، حسرؔت موہانی، اصغرؔ گونڈوی، یاسؔ یگانہ چنگیزی، جگؔر مرادآبادی اور فراؔق گورکھپوری نے ایسے دور میں غزل کی روایت کو قائم رکھا جب نظم گو شعرا کی آوازیں چاروں طرف گونج رہی تھیں اور غزل کو سخت مخالفت کا سامنا تھا۔ یہ غزل نئے مضامین سے آراستہ تھی لیکن اسے کلاسیکی غزل کی روایت ہی سے وابستہ کر کے دیکھنا چاہیے۔ 1947 کے آس پاس ترقی پسند شعرا میں فیض احمد فیضؔ اور مجروحؔ سلطان پوری کی غزلوں میں ایک نیا رنگ ملتا ہے۔ ان کے لہجے میں تیکھا پن اور ایک خاص قسم کی طرح داری تھی۔ معین احسن جذبی کی غزل ان کے نرم لہجے سے پہچانی جاتی ہے۔

جدید رنگ کی غزل کا آغاز ابنِ انشا، ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی سے ہوتا ہے۔ اس غزل کا آہنگ دھیما اور طرزِ احساس نیا تھا۔ 1960 کے بعد جدیدیت کے زیرِ اثر غزل میں زبان و بیان کے بہت سے تجربے ہوئے۔ بانی، محمد علوی، زیب غوری، عادل منصوری، شہریار، حسن نعیم، عرفان صدّیقی، خورشید احمد جامی اور مخمور سعیدی ایسے بہت سے نام ہیں جن کے یہاں غزل کے روایتی مضامین اور لفظیات سے دامن بچانے کی کوشش ملتی ہے۔ اس غزل میں نئے انسان کی ذہنی تشکیک، بے گانگی اور بے چینی کے موضوعات کو خصوصی طور پر برتا گیا ہے۔

پاکستان میں ابنِ انشا اور ناصر کاظمی کے علاوہ منیر نیازی، سلیم احمد، ظفر اقبال، احمد مشتاق اور شہزاد احمد کی غزلیں نئے مفاہیم و مضامین اور گوناگوں اسالیب کی حامل ہیں۔

نظم :

بیسویں صدی کا آغاز علاّمہ اقبالؔ کی نظم نگاری سے ہوتا ہے۔ جس طرح غالب نے گہری سنجیدگی اور گہری فکر سے غزل کو داخلی سطح پر وسعت بخشی تھی، یہی کام اقبال نے نظم میں انجام دیا۔ اقبال وہ پہلے شاعر ہیں جن کی فکر ہمہ گیر ہے اور جنھیں آفاقی شاعر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اقبال کے بعد جوشؔ ایک انقلابی شاعر کے طور پر نمودار ہوتے ہیں۔ انھوں نے انقلاب اور آزادی کے موضوع پر کئی اعلیٰ درجے کی نظمیں کہیں۔ 'ترقی پسند تحریک' اور 'حلقۂ اربابِ ذوق' سے وابستہ شعرا نظم کی طرف زیادہ مائل تھے۔ آزادی کے بعد بھی ان کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ اکثر شعرا کی بہترین نظمیں آزادی کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ترقی پسند شعرا نے اپنے عہد کے بعض اہم سیاسی اور سماجی موضوعات و مسائل کی طرف خاص توجہ دی۔ مجازؔ، فیضؔ، مخدومؔ، سردارؔ جعفری، کیفیؔ اعظمی، جاں نثار اخترؔ اور ساحرؔ لدھیانوی کا تخلیقی سفر آزادی کے بعد بھی جاری رہا۔ ن۔م۔ راشد اور میراجی نے آزاد نظم کو فروغ دیا۔ ان کی نظمیں نئی حسّیت کی ترجمان ہیں۔ میراجی بنیادی طور پر تجربہ پسند تھے۔ انھوں نے تخلیقی زبان کے جس تصور کو فروغ دینے کی کوشش کی تھی، اس کی سب سے پہلی عملی صورت بھی انھیں کی نظموں میں ملتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی سطح پر جو سیاسی انقلابات رونما ہو رہے تھے، راشد نے ان کے اثرات کو بھی اپنے خاص اسلوب میں پیش کیا ہے۔ راشد نے نئے انسان کی ذہنی اور نفسیاتی ناآسودگیوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ اختر الایمان نے اپنی نظموں میں اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کو خاص اہمیت کے ساتھ پیش کیا۔ اظہار کے طریقوں میں جو اختصار و توازن

اختر الایمان کی نظموں میں ملتا ہے، کم و بیش یہی صورت مجید امجد اور منیب الرحمٰن کی نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کے موضوعات اور مسائل فلسفیانہ نوعیت کے ہیں۔

1960 کے بعد جدیدیت کے رجحان کو فروغ حاصل ہوا۔ ہندوستان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، عمیق حنفی، بلراج کومل، محمد علوی، شہریار، وحید اختر، شاذ تمکنت، کمار پاشی، مخمور سعیدی، عادل منصوری، زبیر رضوی اور شمس الرحمٰن فاروقی کی نظمیں اسی رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر شعرا اپنی نظم ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان شعرا نے ہیئت اور اسلوب کے تجربے کیے۔ وجودی فکر کو موضوع بنایا اور علامتی اور تخلیقی زبان استعمال کی۔ پاکستان میں جیلانی کامران، زاہد ڈار، عباس اطہر، وزیر آغا، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کی نظمیں نئے طرزِ احساس کی مظہر ہیں۔ اردو نظم کو نیا رنگ و آہنگ عطا کرنے میں ان کے تجربات کو خاص وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

ناول:

آزادی سے قبل پریم چند نے دیہات کے دبے کچلے عوام کی زندگی کو موضوع بنایا تھا۔ پریم چند کے فوراً بعد عزیز احمد، کرشن چندر اور عصمت چغتائی نے اپنے ناولوں کے ذریعے عصری زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ یہ سلسلہ آزادی کے بعد بھی جاری رہا۔

آزادی کے بعد عزیز احمد کے ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی'، 'شبنم'، قرۃ العین حیدر کا 'میرے بھی صنم خانے' اور 'سفینۂ غمِ دل' منظرِ عام پر آئے۔ 'آگ کا دریا' کی اشاعت 1959 میں ہوئی، جس نے اردو ناول کی تاریخ کا رُخ ہی موڑ دیا۔ یہ ڈھائی ہزار برسوں پر پھیلی ہوئی ہندوستان کی تہذیبی تاریخ ہے۔ اِسے انسان کی تاریخ بھی کہا جا سکتا ہے جو ہر دور میں وقت کے جبر کا شکار رہا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناولوں میں 'آخر شب کے ہم سفر' 'کارِ جہاں دراز ہے'، 'گردشِ رنگِ چمن'، اور 'چاندنی بیگم' کے علاوہ 'چار ناولٹ' بھی ہیں۔ یہ ناول قرۃ العین حیدر کے گہرے تاریخی، سیاسی اور تہذیبی شعور کے مظہر ہیں۔ نئے لکھنے والوں پر ملک کی تقسیم، فسادات اور تہذیبی بحران کا شدّت سے اثر ہوا۔ اردو فکشن نے ہجرت کے المیے کو خاص طور پر موضوع بنایا۔ اردو ناول کا یہ ایسا حاوی موضوع تھا جس کا اثر مدّتوں قائم رہا۔

اس کے علاوہ انسانی رشتوں کی شکست وریخت، انسانی قدروں کی پامالی، اخلاقی اور تہذیبی کشاکش، سیاسی بےحسی اور صارفیت سے پیدا ہونے والے خطرات اور مسائل کو بھی موضوع بنایا گیا۔ پاکستان کے بعض ناولوں میں آمرانہ اور جاگیردارانہ نظام کے ظلم وستم کی تصویر کشی ملتی ہے۔

آزادی کے بعد لکھے گئے چند اہم ناولوں کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ ان کے علاوہ شوکت صدیقی کا 'خدا کی بستی'، راجندر سنگھ بیدی کا 'ایک چادر میلی سی'، جمیلہ ہاشمی کا 'تلاشِ بہاراں' اور 'آتشِ رفتہ'، خدیجہ مستور کا 'آنگن'، عبداللہ حسین کا 'اداس نسلیں' انتظار حسین کا 'بستی'، قاضی عبدالستار کے ناول 'شب گزیدہ' اور 'شکست کی آواز'، جیلانی بانو کا 'ایوانِ غزل'، احمد داؤد کا 'رہائی'، اعجاز راہی کا 'معتوب' اور مستنصر حسین تارڑ کا 'بہاؤ' بھی اس دور کے اہم ناول ہیں۔

ہندوستان میں 1980 کے بعد بعض اہم ناول منظر عام پر آئے۔ مثلاً عبدالصمد کا 'دو گز زمین'، پیغام آفاقی کا 'مکان'، حسین الحق کا 'فرات'، علی امام نقوی کا 'تین بتّی کے راما'، غضنفر کا 'پانی'، الیاس احمد گدّی کا 'فائر ایریا'، سید محمد اشرف کا 'نمبردار کا نیلا' اور شمس الرحمٰن فاروقی کا 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' وغیرہ۔

افسانہ:

آزادی کے بعد اردو افسانے کو بے حد فروغ ملا۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر جن افسانہ نگاروں کے نام آتے ہیں، ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس اور احمد ندیم قاسمی قابلِ ذکر ہیں۔ کرشن چندر کا افسانوی فن حقیقت اور رومان کا سنگم کہلاتا ہے۔ بیدی نفسِ انسانی کی باریکیوں کے رمز شناس تھے۔ انھیں افسانے کے فن پر غیر معمولی قدرت تھی۔ احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کی زندگی کے دُکھ سکھ اور تلخ وشیریں کو بڑے مؤثر ڈھنگ سے افسانوی پیرایہ عطا کیا ہے۔ عصمت چغتائی ایک بے باک افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اُن رسوم و رواج کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے جو انسان کی فطری آزادیوں پر قدغن لگاتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے اکثر افسانے طبقاتی اونچ نیچ کے محور پر گشت کرتے ہیں۔ بعض افسانے تکنیک کے اعتبار سے فن کا عمدہ نمونہ ہیں۔ حیات اللہ انصاری کا شمار بھی اس دور کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

1947 کے آس پاس سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور غلام عباس کے افسانے اپنے منفرد اسلوب اور تکنیک کے لحاظ سے متوجہ کرنے لگے تھے۔ ان افسانہ نگاروں نے جدیدیت سے قبل نئے افسانے کے لیے فضا سازی کا کام کیا تھا۔ 1955-60 کے بعد بلراج مین را، سریندر پرکاش، خالدہ حسین، انور سجّاد، جوگندر پال،

غیاث احمد گدّی، الیاس احمد گدّی، اقبال مجید، کلام حیدری، انور عظیم، ضمیرالدین احمد، رتن سنگھ، عابد سہیل، جدید انسان کی بے چینیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ علامتی اور تجریدی افسانوں کے ابتدائی نقوش بھی انھیں افسانہ نگاروں کے یہاں ملتے ہیں۔ نیّر مسعود کے افسانے تجرید کے بجائے تکنیک کی سطح پر پیچیدگی کا احساس دلاتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانے اپنی فضا اور اسلوب کے لحاظ سے ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں فنکاری کے ساتھ تہذیبی زندگی کی بڑی عمدہ مرقع کشی کی گئی ہے۔ قاضی عبدالستار، رام لعل اور جیلانی بانو نے زندگی کو اپنے اپنے طور پر معنی دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے فن کا خاص وصف توازن ہے۔

جدیدیت نے اردو افسانے میں علامتی اور تجریدی اسلوب کو رواج دیا تھا۔ ان افسانہ نگاروں کی ترجیح حقیقت نگاری کے مخصوص تصوّر کے برخلاف ذات اور وجود کا تجربہ تھی۔ کرداروں کی شناخت غائب ہو گئی تھی جس کے باعث ابہام کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ 1980 کے بعد پروان چڑھنے والی نسل نے بیانیے کی روایت کو دوبارہ رائج کرنے کی کوشش کی۔ یہ نسل اسلوب سے زیادہ تکنیک کے تجربے کی طرف مائل ہے۔ صارفیت کے بڑھتے ہوئے فروغ کے باعث انسانی رشتوں میں جس قسم کا انتشار پایا جاتا ہے، نئے افسانہ نگاروں نے اسے بھی موضوع بنایا ہے۔ اس نسل کے چند نمائندہ نام یہ ہیں:

سلام بن رزاق، انور خاں، انور قمر، شموئل احمد، عبدالصمد، ذکیہ مشہدی، شوکت حیات، شفق، سید محمد اشرف، مشرف عالم ذوقی، طارق چھتاری وغیرہ۔

ڈراما:

آزادی کے بعد دیگر اصناف کی طرح ڈرامے کا فن بھی ترقی کرتا رہا۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری اور بلراج ساہنی کے ڈراموں میں ترقی پسند نظریے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ محمد حسن کے ڈرامے 'محل سرا'، 'فٹ پاتھ کے شہزادے'، 'کہرے کا چاند'، 'مٹی جاگتی ہے'، 'ضحاک' وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ حبیب تنویر کے 'آگرہ بازار' ایک کامیاب ترین اسٹیج ڈراما ہے جس نے کافی شہرت پائی۔ ابراہیم یوسف کے ڈرامے 'پرچھائیوں کا پیچھا'، 'کاغذ کی دھجی'، 'الجھاوے'، 'زمرّد کا گلوبند'، 'گرتی برف'، 'ٹیپو سلطان' وغیرہ کا شمار بھی اسٹیج ڈراموں میں ہوتا ہے۔ ان ڈراموں کا پس منظر آزادی کے بعد کی وہ زندگی ہے جسے اپنے خوابوں کی تعبیر ابھی تک نہیں مل سکی ہے۔ ان ڈراموں میں آزادی کے بعد کی سماجی اور تہذیبی زندگی کے نشیب و فراز کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ڈرامے اپنی فکر کے لحاظ ہی سے نہیں، فن کے لحاظ سے بھی متوجہ کرتے ہیں۔

1960 کے بعد بعض ایسے ڈرامے بھی تخلیق ہوئے جنھیں فنی اعتبار سے تجرباتی کہا جاتا ہے۔ ان میں انور عظیم کا 'آوازوں کا قیدی' کمار پاشی کا 'جملوں کی بنیاد'، شمیم حنفی کا 'پانی۔ پانی' زاہدہ زیدی کا 'چٹان' اور 'دوسرا کمرہ'۔ عتیق اللہ کا 'پیچھے کوئی ہے' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان ڈراموں پر سیموئل بیکٹ، آئنسکو اور ژان ژینے کا گہرا اثر ہے۔ ان ڈراموں کا خاص موضوع انسان کی داخلی بے چینی ہے۔ انسان اپنی ذات میں تنہا اور بے یار و مددگار ہے۔ ڈراما اکثر ایسے وقوعوں Happenings سے گزرتا ہے جنھیں عجیب وغریب ہی نہیں مضحک بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے ڈراموں کے برعکس فضل تابش، اقبال مجید، ظہیر انور، شاہد انور، سعید عالم، انیس اعظمی، اقبال نیازی اور رشید انجم نے ہمارے عہد کی ذہنی اور تہذیبی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ ان نئے ڈراما نگاروں نے اسٹیج کی ضروریات اور اسٹیج کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا ہے۔ آزادی سے قبل بھی اردو اسٹیج ڈراموں کی مقبول زبان تھی اور اب بھی اردو ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے جارہے ہیں۔

تنقید:

'تنقید' لغت میں اچھے برے کی پہچان اور پرکھ کو کہتے ہیں۔ ادب میں 'تنقید' کا مطلب ہوتا ہے کسی فن پارے کو پڑھ کر اس پر اپنی رائے دینا۔ لیکن یہ رائے رواروی میں نہیں دی جاتی بلکہ اس کے کچھ اصول اور قاعدے ہوتے ہیں۔ انھی کے تحت کسی فن پارے پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ تنقید میں مہارت رکھنے والے کو 'تنقید نگار' یا 'نقاد' کہتے ہیں۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عام آدمی ادب کا مطالعہ صرف لطف اندوزی کے لیے کرتا ہے۔ وہ مطالعے کے بعد اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار بھی کرسکتا ہے لیکن یہ رائے بہت محدود ہوتی ہے مثلاً یہ کہ مجھے یہ افسانہ پسند ہے یا ناپسند۔ یہ نظم اچھی ہے یا اچھی نہیں ہے لیکن وہ اپنی پسند یا ناپسندیدگی کے اسباب پر تفصیلی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اس کے برخلاف نقّاد ماہرفن ہوتا ہے اس لیے وہ فن پارے پر اپنی رائے کا اظہار ماہرِ فن کی طرح کرتا ہے۔

تنقید نگار یا نقاد کے دو اہم منصب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زیرِ بحث فن پارے کی تشریح و تفسیر کرے مثلاً پہلے یہ بتائے کہ وہ جس کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے اس میں کن مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ ان میں کیا باریکیاں اور نکتے ہیں اور لکھنے والے کا مدّعا کیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تنقید کا مطالعہ کرنے والا عام قاری بھی ان مسائل کی باریکیوں سے واقف ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد نقاد کا دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ فن پارے کا تجزیہ کرکے یہ بتائے کہ

شاعر یا ادیب اپنی تخلیق میں کس حد تک کامیاب ہے۔ مواد اور ہیئت میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے یا نہیں؟ وہ تخلیق جس صنف ادب سے تعلق رکھتی ہے، اس کے تقاضوں کو اس میں ملحوظ رکھا گیا ہے یا نہیں۔ اگر فن کار نے کوئی نیا تجربہ کیا ہے تو وہ تجربہ ہمیں کن نئی جہتوں سے آشنا کراتا ہے۔ نقاد ان مسائل سے بحث کرتے ہوئے اصول و قواعد کے حوالے دیتا ہے۔ پھر کبھی ان سے موافقت کا اظہار کرتا ہے اور کبھی اختلاف کرتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی ہمارے پرانے مفروضات کو رد کرتا اور ہمیں غور و فکر کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

آزادی کے بعد ان نقادوں نے بھی اپنا سفر جاری رکھا جو آزادی سے قبل اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ ان میں کلیم الدین احمد، احتشام حسین، ممتاز حسین اور محمد حسن عسکری تھے۔ آزادی کے بعد جن نقادوں نے تنقید کو کئی نئی جہتوں سے آشنا کیا ان میں بیش تر وہ ہیں جن کا تعلق جدیدیت کے مکتبِ فکر سے تھا۔ بعض نقادوں کے یہاں ترقی پسند تصورِ فن اور جدیدیت کا امتزاج ملتا ہے۔ بعض ناقدین مابعدِ جدید تصورات کے حامل ہیں۔ ان میں وزیر آغا، محمد حسن، گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی اور قاضی افضال کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

انشائیہ:

کہا جاتا ہے کہ ادب لفظوں کا کھیل ہے۔ کسی دوسری ادبی صنف کے بارے میں شاید یہ خیال صحیح نہ ہو لیکن انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس میں انشائیہ نگار زیادہ سے زیادہ آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ لفظوں سے کھیلتا ہے۔ ذہن کی آزادرَو پر وہ کوئی حد قائم نہیں کرتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی سنجیدگی کب غیر سنجیدگی میں بدل جائے اور غیر سنجیدگی، سنجیدگی میں۔ کبھی وہ دوسروں کی حماقتوں پر ہنستا اور ہنساتا ہے، کبھی خود اپنی حماقتوں پر دوسروں کو ہنسنے کا موقع دیتا ہے۔

ایک اچھے انشائیے میں اکثر بیان کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ پہلی سطح پر وہ ہمیں فرحت مہیا کرتا ہے۔ دوسری سطح پر ممکن ہے کوئی سنجیدہ اور گہری بات چھپی ہو جو ایک دم انکشاف کی صورت میں عیاں ہو کر ہمیں بصیرت بھی بخش سکتی ہے۔ بہر حال انشائیے کا بنیادی مقصد لطف اندوزی ہے شاید اسی لیے کسی نے اسے 'خیال کی ترنگ' کا نام دیا ہے۔

آزادی کے بعد جن ادیبوں نے انشائیہ نگاری کو فروغ دیا ان میں فرقت کاکوروی، کنھیا لال کپور، مرزا محمود بیگ، تخلّص بھوپالی، شوکت تھانوی، وزیر آغا، مشتاق احمد یوسفی، فکر تونسوی، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھرا اور شفیقہ فرحت کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

صحافت :

آزادی کے بعد اردو کو درپیش مشکلات کے باوجود اردو صحافت بدستور فروغ پاتی رہی۔ اس نے ملک اور قوم کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے۔ چنانچہ اردو اخبارات و رسائل کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق 1996 میں اُردو کے روزانہ، سہ روزہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ اخباروں اور رسالوں کی مجموعی تعداد 1567 تھی۔ اب اردو اخبارات کی طباعت کا معیار بھی بلند ہو گیا ہے۔ خبر رسانی کے ذرائع نے بھی غیر معمولی ترقی کر لی ہے جن سے اردو اخبارات پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دیدہ زیب طباعت اور مختلف النوع مسائل اور مضامین کی بنا پر اردو قارئین کا حلقہ بھی کافی وسیع ہو گیا ہے۔ انقلاب، اردو ٹائمز، سیاست، منصف، قومی آواز، راشٹریہ سہارا، آزاد ہند، سالار اردو کے مقبول ترین روز نامے ہیں۔ ان میں سے بعض اخبارات بیک وقت کئی شہروں سے شائع ہو رہے ہیں۔ ماہانہ رسالوں میں 'شب خون' (الہ آباد)، 'شاعر' (ممبئی)، 'معارف' (اعظم گڑھ)، 'نیا دور' (لکھنؤ)، 'سب رس' (حیدرآباد)، 'آج کل' (دہلی)، 'ایوانِ اُردو' (دہلی)، 'کتاب نما' (دہلی)، اردو دنیا (دہلی)، سہ ماہی رسالوں میں 'اثبات' (ممبئی)، 'اردو ادب' (دہلی)، 'فکر و نظر' (علی گڑھ)، 'جامعہ' (دہلی)، 'فکر و تحقیق' (دہلی)، 'ذہنِ جدید' (دہلی)، 'نیا ورق' (ممبئی)، 'محاسبہ' (پٹنہ)، 'نئی کتاب' (دہلی) اور ہفت روزہ جرائد میں 'ہماری زبان' (دہلی)، 'عالمی سہارا' (دہلی) اور 'اخبارِ نو' (دہلی) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

سرحد کے اس پار سے نکلنے والے رسائل اور اخبارات میں 'نگار'، 'نقوش'، 'فنون'، 'اوراق'، 'سویرا'، 'ادبِ لطیف'، 'مکالمہ'، 'آج'، 'دنیا زاد' اور روز ناموں میں 'مشرق'، 'جنگ'، 'نوائے وقت' وغیرہ بھی معروف ہیں۔

خاکہ نگاری:

خاکہ نہ تو سوانحی مضمون ہوتا ہے اور نہ محض تاثراتی تحریر۔ ایک اچھے خاکے میں خاکہ نگار متعلقہ شخصیت کے کچھ واقعاتِ زندگی، اس کی سیرت کے کچھ پہلوؤں اور اپنے تاثرات کے امتزاج سے ایک جیتی جاگتی تصویر بناتا ہے۔ یہی تصویر ادبی اصطلاح میں خاکہ کہلاتی ہے۔ اردو میں خاکہ نگاری کی روایت 'آبِ حیات' کے قلمی مرقعوں سے شروع ہوتی ہے۔

آزادی کے بعد اس صنف کے معروف لکھنے والوں میں عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر اعجاز حسین، سعادت حسن منٹو، سردار دیوان سنگھ مفتوں، عصمت چغتائی، محمد طفیل، انتظار حسین، بیگم صالحہ عابد حسین، علی جواد زیدی، کرشن چندر، ظ۔ انصاری، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، یوسف ناظم، تخلّص بھوپالی، سید حامد حسین، سید ضمیر حسین دہلوی، نورالحسن نقوی، اسلم پرویز، خلیق انجم اور مجتبیٰ حسین وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

رپورتاژ :

رپورتاژ ایک نئی صنف ہے۔ یہ لفظ رپورٹ کا فرانسیسی تلفظ ہے۔ رپورٹ کے ایک معنی روداد کے ہیں۔ روداد کسی واقعے کا بیان ہوتی ہے۔ ادب میں کسی جلسے، مذاکرے یا سیمینار کی ایسی تفصیلی روداد کو رپورتاژ کہا جاتا ہے جس کی زبان افسانوی ہوتی ہے۔ رپورتاژ نگار اپنی روداد کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کے لیے ایک ایک جُز کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ شرکائے جلسہ کی تحریروں کے بارے میں وہ اپنی اور دوسروں کی رائے شامل کر کے اس روداد کو دلچسپ بناتا ہے۔

اردو کے اوّلین رپورتاژ نگاروں میں حمید اختر، کرشن چندر اور سجّاد ظہیر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آزادی کے بعد جن ادیبوں نے رپورتاژ لکھے، ان میں بیشتر افسانہ نگار تھے۔ ان کی روداد میں افسانویت کے ساتھ ڈرامائیت بھی پائی جاتی ہے۔ عادل رشید، سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، فکر تونسوی، پرکاش پنڈت وغیرہ کے رپورتاژ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مہجری ادب (Urdu Diaspora) :

ہجرت، عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنیٰ ہیں اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے وطن میں سکونت اختیار کرنا لیکن ہجرت کے اصطلاحی معنی میں بڑی وسعت ہے۔ ایک خاص اور بنیادی معنی تو ہجرتِ نبویؐ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض وجوہ سے جب حضورؐ اور دیگر صحابہ کرامؓ پر مکّے کی زمین تنگ ہوگئی تو انھوں نے دارالامان کے طور پر مدینے کی سرزمین کو اپنی جائے پناہ ہونے کا اعزاز بخشا۔ عالمی تاریخ میں عدم تشدد کی یہ ایک گراں قدر مثال ہے۔

ہجرت یا ترکِ وطن کے پیچھے ہمیشہ سیاسی جبر ہی کام نہیں کرتا بلکہ ایک خوش حال اور بہتر زندگی کا تصور بھی ترکِ وطن کے لیے تحریک کا باعث بن سکتا ہے۔ بیسویں صدی میں کاروبار کی توسیع یا روزگار جیسی اغراض نے انفرادی طور پر نئی نسلوں کو ترکِ وطن کی طرف مائل کیا۔ اس طرح موجودہ عہد میں ہجرت کے پیچھے معاشی اسباب کی زیادہ کارفرمائی ہے۔

اردو کے مہاجر ادیب و شاعر دنیا کے کئی ملکوں میں بسے ہوئے ہیں۔ ان میں کینیڈا، شمالی امریکہ، برطانیہ، ناروے، سویڈن، جرمنی، روس، آسٹریلیا اور مشرقِ وسطیٰ کے کئی ممالک شامل ہیں۔ ان مہاجر ادبا و شعرا نے دیارِ غیر میں بعض ادبی ادارے بھی قائم کیے ہیں۔ ان اداروں کو سرکاری فنڈز بھی ملتے رہے ہیں۔ شمالی امریکہ کا 'اردو انٹرنیشنل' ایک فعال ادارہ ہے۔ اردو ادب اور اردو تہذیب سے رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے ان مہاجر ادیبوں نے بعض ممالک سے اردو جریدے بھی شائع کیے ہیں۔ ان میں مقصود الٰہی شیخ کا 'مخزن' (بریڈفورٹ۔ برطانیہ) ساحر شیوی کا 'سفیرِ اردو' (لندن) اور جرمنی سے شائع ہونے والا حیدر قریشی کا رسالہ 'جدید ادب' برصغیر میں بھی مقبول ہیں۔ ان رسائل کے علاوہ اخبارات بھی شائع ہوتے ہیں جن میں ان نئی بستیوں کے ادیبوں کی تخلیقات ہی شائع نہیں ہوتیں بلکہ برصغیر ہندو پاک کے اکثر شاعروں اور افسانہ نگاروں کی نگارشات بھی ان میں شامل ہوتی ہیں۔ اردو کے ان مہاجر ادیبوں

کے ادبی اثاثے میں شعری و افسانوی مجموعوں کے علاوہ تنقید، تحقیق، صوتیات، سوانح عمریاں، سفر نامے، لغت و منقبت اور شکاریات پر بھی کتابیں شامل ہیں۔ شمالی امریکہ میں پروفیسر مامون ایمن، نیر جہاں اور صفوت علی صفوت اردو کی شعری روایات کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ کینیڈا میں اشفاق احمد، پروین شیر، سید تقی عابدی اور ستیہ پال آنند کے نام ان کے گونا گوں ادبی کارناموں کی وجہ سے بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔ سید تقی عابدی نے دبیر، غالب اور فیض کے تعلق سے تحقیق کے نئے گوشوں پر توجہ کی ہے۔ اشفاق احمد کی نئی تصنیف 'مسیحا فیض' فیض شناسی میں ایک گراں قدر کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ستیہ پال آنند جدید اردو نظم کا جانا پہچانا نام ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ برطانیہ میں مقصود الٰہی شیخ 'مخزن' کے مدیر ہیں۔ وہ خود ایک لائق افسانہ نگار ہیں۔ ساقی فاروقی ایک منفرد اسلوب کے شاعر ہیں۔ لندن میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی سوانح 'آپ بیتی / پاپ بیتی' کے نام سے شائع کی ہے۔ الٰہی بخش اختر اعوان بھی لندن میں رہتے ہیں۔ علاقائی زبانوں پر اردو کے اثرات اور ان کے تقابلی مطالعے پر ان کا کام اہمیت رکھتا ہے۔ فیض احمد فیض، افتخار عارف اور عادل منصوری کی زندگی کا ایک بڑا عرصہ مغربی ممالک میں گزرا۔ ن۔ م۔ راشد کی شاعری کا بیش تر حصّہ ترکِ وطن کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ احمد مشتاق جیسے اہم غزل گو شاعر کا قیام بھی لندن میں ہے۔ افتخار نسیم بھی منفرد لہجے کے شاعر تھے۔ ضیاء الدین شکیب نے تحقیق کے وقار کو ان بستیوں میں قائم رکھا۔ ڈاکٹر احمد سہیل مابعدِ جدید نقاد کی حیثیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

قیصر تمکین اور اکبر حیدر آبادی برطانیہ میں سکونت پذیر ہیں۔ 'شعر و نظر' اور 'تنقید کی موت' قیصر تمکین کی تنقیدی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی کہانیوں کے پانچ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اکبر حیدر آبادی شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے ہیں۔

سائیں سچا، جمشید مسرور، ہر چرن چاولہ، یہ تینوں افسانہ نگار قطب شمالی کے پڑوسی ممالک میں سکونت پذیر ہیں۔ ادب میں ان کے افسانوں کا خاص مقام ہے۔ ان لوگوں نے اردو ادب کو وہاں کی مقامی زبانوں میں ڈھالا اور مقامی ادب کو اردو میں پیش کیا۔ آسٹریلیا میں معمر ادیبہ، ساوتری گوسوامی آج بھی افسانے لکھ کر اردو کے چراغ کو آسٹریلیا میں روشن کیے ہوئے ہیں۔ جرمنی میں حیدر قریشی، نعیمہ ضیا وغیرہ اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ عرب امارات میں ع۔ م۔ سلیم، حنیف ترین وغیرہ کی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

اس طرح ساری دنیا میں اردو کے مہاجر ادبا و شعرا اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح یہ کوششیں اردو سے ان کے دلی لگاؤ کی مظہر بھی ہیں اور غیروں کی تہذیب کے درمیان اردو تہذیب کو زندہ رکھنے کی کوشش کی علامت بھی۔

اُردو زبان واَدب کی تاریخ

ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجات کے لیے درسی کتاب

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

NATIONAL COUNCIL OF EDUCATIONAL RESEARCH AND TRAINING

Urdu Zaban-o-Adab ki Tareekh
for Secondary and Senior
Secondary Stages

ISBN 978-93-5007-216-5

پہلا ایڈیشن

مارچ 2013 پھالگن 1934
مارچ 2019 چیتر 1940

PD 2T SPA

قیمت: 115.00 ₹

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈویژن کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
سری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016

108,100 فٹ روڈ ہوسڈے کیرے ہیلی
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بنگلورو - 560085

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمد آباد - 380014

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکاتہ - 700114

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گوہاٹی - 781021

اشاعتی ٹیم

ہیڈ، پبلی کیشن ڈویژن : محمد سراج انور
چیف ایڈیٹر : شویتا اُپّل
چیف پروڈکشن آفیسر : ارون چتکارا
چیف بزنس منیجر : ابیناش کُلّو
ایڈیٹر : سید پرویز احمد
پروڈکشن آفیسر : عبد النعیم

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ

سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، شری اروندو مارگ نئی دہلی نے ______________
____
میں چھپوا کر پبلی کیشن ڈویژن سے شائع کیا۔

پیش لفظ

’قومی درسیات کا خاکہ — 2005‘ میں سفارش کی گئی ہے کہ بچّوں کی اسکولی زندگی، ان کی باہری زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر کتابی علم کی اُس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں اسکول، گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل رہے ہیں۔ نئے قومی درسیات پر مبنی نصاب اور درسی کتابوں کی تیاری اِسی بنیادی مقصد پر عمل آوری کی ایک کوشش کہی جاسکتی ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امّید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی (1986) میں مذکور تعلیم کے ’طفل مرکوز نظام‘ کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔ اس کوشش کی کامیابی کا انحصار اُن اقدامات پر ہے کہ اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کے سلسلے میں بچوں کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بچّوں کو اگر موقع، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر نئی معلومات مرتّب کرسکتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محلِ وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب، مجوّزہ نصابی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچّوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اُسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچوں کو بہ حیثیت شریکِ کار قبول کریں اور ان سے اُسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقرّرہ معلومات کا جانکار نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے نظام الاوقات (Time - Table) اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روزمرّہ معمولات میں نرمی کی اتنی ہی اہمیت یا ضرورت ہے جتنی کہ سالانہ کیلنڈر کے نفاذ اور محنت کی، تاکہ تدریس کے لیے دستیاب مدّت کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جاسکے۔ تدریس اور اندازِ قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعین ہوگا کہ یہ درسی کتاب بچّوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ پیدا کرنے کے بجائے ان کی اسکولی

زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حد تک موثّر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیلِ نو اور اُسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچوں کی نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجّہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید بہتر بنانے کے لیے یہ درسی کتاب سوچنے اور حیرتوں کو جگائے رکھنے، چھوٹے گروپوں میں بحث و مباحثہ کو فروغ دینے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو اوّلیت دیتی ہے۔

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی کمیٹی برائے 'اردو زبان و ادب کی تاریخ' کی مخلصانہ کوششوں کی شکر گزار ہے۔ کونسل زبانوں کی مشاورتی کمیٹی برائے زبان کے چیئرمین پروفیسر نامور سنگھ اور اس کتاب کے خصوصی صلاح کار پروفیسر شمیم حنفی کی ممنون ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا، ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکر گزار ہیں۔ ہم ان سبھی اداروں اور تنظیموں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے وسائل، مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی پابند ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی تمام مشوروں اور آرا کا خیر مقدم کرتی ہے تاکہ کتاب کو مزید غور و فکر کے بعد اور زیادہ کارآمد اور بامعنی بنایا جاسکے۔

ڈائریکٹر

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

نئی دہلی

اس کتاب کے بارے میں

کسی بھی زبان اوراس کے ادب کی تاریخ مرتّب کرنا بڑی ذمّے داری کا کام ہے۔ این سی ای آر ٹی نے بالخصوص طلبا کی دشواریوں، اُن کی ضروریات نیز ’قومی درسیات کا خاکہ-2005‘ کے رہنما اصولوں کے مطابق زیرِنظر تاریخ تیار کی ہے۔ اس میں طلبا کے درسی تقاضوں اور نصاب کے مشمولات کو خصوصاً ملحوظ رکھا گیا ہے۔ زیرِنظر تاریخ کی ترتیب وتشکیل اپنے مقصد میں دیگر ادبی تاریخوں سے مختلف ہے اس میں صرف اُن پہلوؤں کو شامل کیا گیا ہے جو ہمارے نصاب سے مطابقت رکھتے ہیں اور جن کا علم طلبا کے لیے ضروری ہے۔

ادب کی تاریخوں میں ادب کے تہذیبی، سیاسی اور معاشی پس منظر کو بھی خصوصی جگہ دی جاتی ہے لیکن زیرِنظر ’اُردو زبان واَدب کی تاریخ‘ مکمّل اور توضیحی تاریخ نہیں ہے اس لیے ادب کے خارجی محرّکات کی جستجو کو مقصد نہیں بنایا گیا بلکہ ثانوی اوراعلیٰ ثانوی درجات کے نصاب کو سامنے رکھ کر مختلف عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ تاریخی سطح پر ایک سلسلہ ضرور قائم ہے لیکن ادوار کی تقسیم پر اصرار نہیں کیا گیا ہے۔

اختصار اس تاریخ کی اہم خصوصیت ہے۔ غیرضروری بحث سے گریز کیا گیا ہے، زبان بھی آسان رکھی گئی ہے۔ ادیبوں، تحریکوں اور رجحانات کے بارے میں معروضی طریقۂ کار اختیار کیا گیا ہے۔ تنقید اور تجزیے میں بھی بڑی حد تک محتاط رویّہ اپنایا گیا ہے۔ بنیادی مقصد تنقید کے بجائے تعارف ہے۔ ادبی روایات کو سلسلہ وار پیش کرنے کے بجائے انھیں ادیبوں، شاعروں اور تحریکوں کے ذیل میں جگہ دی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقصد طلبا کو بنیادی معلومات فراہم کرنا ہے۔ بعدازاں وہ اپنے طور پر دوسری مفصّل اور مبسوط تاریخوں سے اپنے علم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔

کتاب میں شامل شعرا اور مصنفین کی ولادت اور وفات کا ایک اشاریہ بھی مع تصاویر آخر میں دیا گیا ہے۔

کمیٹی برائے اُردو زبان واَدب کی تاریخ

خصوصی صلاح کار

شمیم حنفی، پروفیسر ایمریٹس ،شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

چیف کوآرڈی نیٹر

چندرا سدایت، پروفیسر اور ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اراکین

احمد محفوظ، پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اسلم پرویز، ایسوسی ایٹ پروفیسر (ریٹائرڈ)، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

انور پاشا، پروفیسر، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

آفتاب احمد آفاقی، پروفیسر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، اتر پردیش

حنیف احمد نقوی، پروفیسر (ریٹائرڈ)، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، اتر پردیش

خواجہ اکرام الدّین، پروفیسر، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

ڈی جی اے خان، پروفیسر (ریٹائرڈ)، شعبۂ سیاسیات، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، اتر پردیش

راجیش مشرا، پروفیسر، ڈی ای ایس ایس ایچ، آر آئی ای، اجمیر، راجستھان

رضوان الحق، اسسٹینٹ پروفیسر، ڈی ای ایس ایس ایچ، آر آئی ای، بھوپال، مدھیہ پردیش

رضی الرحمٰن، صدر، شعبۂ اردو، ڈاکٹر دین دیال اپادھیائے گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور، اتر پردیش

زماں آزردہ، پروفیسر (ریٹائرڈ)، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، کشمیر
سلیم شہزاد، اردو استاد (ریٹائرڈ)، مالیگاؤں
سید یحییٰ نشیط، پرنسپل (ریٹائرڈ) وسنت راؤ نائک اردو ہائی اسکول، گل گاؤں، مہاراشٹر
شمیم احمد، اسسٹینٹ پروفیسر، شعبۂ اردو و فارسی، سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
ظفر احمد صدیقی، پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش
ظفر اسلم، اسسٹینٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈاکٹر مختار انصاری انٹر کالج، غازی پور، اتر پردیش
عبدالحق، پروفیسر (ریٹائرڈ)، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
عتیق اللہ، پروفیسر (ریٹائرڈ)، دہلی یونیورسٹی، دہلی
فیروز عالم، اسسٹینٹ پروفیسر، ڈی ڈی ای، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، آندھرا پردیش
قاسم خورشید، صدر، ایس سی ای آر ٹی، مہیندرو، پٹنہ، بہار
قمرالہدیٰ فریدی، پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش
محمد ظفرالدین، پروفیسر، ٹرانسلیشن ڈویژن، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد، آندھرا پردیش
محمد نفیس حسن، لکچرار اردو، گورنمنٹ بوائز مڈل اسکول (اردو میڈیم)، اجمیری گیٹ، دہلی
مظفر شہمیری، پروفیسر، سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد، آندھرا پردیش
نورالحق، صدر، شعبۂ اردو، بریلی کالج، بریلی، اتر پردیش
نسیم احمد، پروفیسر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، اتر پردیش
یعقوب یاور، پروفیسر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، اتر پردیش

ممبر کوآرڈی نیٹر

دیوان حنّان خاں، پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی
محمد نعمان خاں، پروفیسر (ریٹائرڈ)، ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اظہارِ تشکّر

اس کتاب کی تیاری میں اسسٹنٹ ایڈیٹر **محمد اکبر**، ڈی ٹی پی آپریٹر **رضوان احمد ندوی**، **ابوذر نوید**، **محمد عارف رضا** اور **محمد ایوب** نے پوری دل چسپی سے حصّہ لیا ہے۔ کونسل ان سب کی شکر گزار ہے۔

ترتیب

اردو شعرا و ادبا کی ولادت اور وفات کا اشاریہ مع تصاویر

الف

ابراہیم عادل شاہ ثانی — **Ibraheem Adil Shah Saani**

پیدائش : 1580، دکن

وفات : 1627

ابراہیم یوسف — **Ibraheem Yusuf**

پیدائش : 1925، بھوپال

وفات : 1999، بھوپال

ابنِ انشا — **Ibne Insha**

پیدائش : 1926، پھِلَور (جالندھر)

وفات : 1978، بیٹن (انگلستان)

اثر دہلوی — **Asar Dehlvi**

پیدائش : 1720/35، دہلی

وفات : 1794/95، دہلی

احتشام حسین — **Ehtesham Hussain**

پیدائش : 1912، ماہُل، اعظم گڑھ

وفات : 1972، الٰہ آباد

احسان دانش — **Ahsan Danish**

پیدائش : 1911/14، کاندھلہ، مظفر نگر

وفات : 1982، لاہور، پاکستان

احمد مشتاق — **Ahmad Mushtaq**

پیدائش : 1933، امرتسر

احمد ندیم قاسمی — **Ahmad Nadeem Qasmi**

پیدائش : 1916، شاہ پور، پاکستان

وفات : 2006، لاہور، پاکستان

اختر حسین رائے پوری — **Akhtar Hussain Raipuri**

پیدائش : 1912، رائے پور

وفات : 1992، کراچی، پاکستان

اختر شیرانی — **Akhtar Shirani**

پیدائش : 1905، ٹونک

وفات : 1948، لاہور، پاکستان

اختر الایمان — **Akhtarul-Iman**

پیدائش : 1915، نجیب آباد

وفات : 1996، ممبئی

اسمٰعیل میرٹھی — **Ismail Meerthi**

پیدائش : 1843/44، میرٹھ

وفات : 1917، میرٹھ

اشرف بیابانی **Ashraf Bayabani**

پیدائش : 1459، دکن

وفات : 1528

اشکؔ، اُپندر ناتھ **Ashk, Upender Nath**

پیدائش : 1910، جالندھر شہر

وفات : 1996، الہ آباد

اصغر گونڈوی **Asghar Gondavi**

پیدائش : 1884، گورکھپور

وفات : 1936، الہ آباد

اعظم کریوی **Azam Karivi**

پیدائش : 1898، کریہ

وفات : 1954

افسر میرٹھی **Afsar Meerthi**

پیدائش : 1895، میرٹھ

وفات : 1974، لکھنؤ

افضل نارنولوی **Afzal Narnolvi**

پیدائش : نارنول، (ہریانہ)

وفات : 1625/26، لکھنؤ

اقبال مجید **Iqbal Majeed**

پیدائش : 1934، سیتاپور

وفات : 2019، بھوپال

اقبال متین، سید **Iqbal Mateen, Syed**

پیدائش : 1924/29، حیدرآباد

وفات : 2015، حیدرآباد

اکبر الٰہ آبادی **Akbar Allahabadi**

پیدائش : 1846، بارہ، الہ آباد

وفات : 1921، الہ آباد

امتیاز علی تاج **Imtiyaz Ali Taj**

پیدائش : 1900، لاہور، پاکستان

وفات : 1970، لاہور، پاکستان

امجدؔ حیدرآبادی **Amjad Hyderabadi**

پیدائش : 1886/88، حیدرآباد

وفات : 1961، حیدرآباد

امیر خسرو **Ameer Khusru**

پیدائش : 1208/09، پٹیالی (ضلع ایٹہ)

وفات : 1325، دہلی

امیر مینائی **Ameeer Meenai**

پیدائش : 1828/29، لکھنؤ

وفات : 1900، حیدرآباد

انتظار حسین Intezar Hussain

پیدائش : 1923، ڈبائی، بلند شہر

وفات : 2016، لاہور، پاکستان

اِنشاءاللہ خاں Insha-ullah Khan Insha

پیدائش : 1752/56، مرشد آباد

وفات : 1817، لکھنؤ

آ

آبرو، شاہ مبارک Aabru Shah Mubarak

پیدائش : 1683/85، گوالیار

وفات : 1733، دہلی

آتش خواجہ حیدر علی Atish, Khaja Hyder Ali

پیدائش : 1768، فیض آباد

وفات : 1847، لکھنؤ

آرزو Aarzu

پیدائش : 1687/88، آگرہ

وفات : 1756، لکھنؤ

آرزو لکھنوی Aarzu Lukhnavi

پیدائش : 1872/73، لکھنؤ

وفات : 1951، لکھنؤ

آغا حشر کاشمیری Aagha Hashr Kashmiri

پیدائش : 1879، بنارس

وفات : 1935:

آل احمد سرور Aal-e-Ahmad Suroor

پیدائش : 1911، بدایوں

وفات : 2002، علی گڑھ

ب

باقر مہدی Baaqar Mehdi

پیدائش : 1927، ردولی

وفات : 2007، ممبئی

بانی، راجندر منچندا Bani Rajindra Manchanda

پیدائش : 1932، ملتان، پاکستان

وفات : 1981، نئی دہلی

بحرؔی Behri

پیدائش :

وفات : 1717، گوگی ضلع بیجاپور

بلراج کومل Balraj Komal

پیدائش : 1928، سیالکوٹ، پاکستان

وفات : 2013، نئی دہلی

بلراج مینرا Balraj Menra

پیدائش : 1934، ہوشیار پور (پنجاب)

وفات : 2016، دہلی

بلونت سنگھ Balwant Singh

پیدائش : 1921، گجراں والا، پاکستان

وفات : 1986، الہ آباد

بہادر شاہ ظفر Bahadur Shah Zafar

پیدائش : 1775، دہلی

وفات : 1862، رنگون

پروین شاکر Parveen Shakir

پیدائش : 1952، کراچی، پاکستان

وفات : 1994، کراچی، پاکستان

پریم چند Prem Chand

پیدائش : 1880، لمہی، پانڈے پور

وفات : 1936، بنارس

پطرس بخاری Patras Bukhari

پیدائش : 1898، پشاور، پاکستان

وفات : 1958، نیویارک (امریکا)

تلوک چند محرومؔ Tilok Chand Mehroom

پیدائش : 1887

وفات : 1966

جاں نثار اخترؔ Jan Nisar Akhtar

پیدائش : 1914، گوالیار

وفات : 1976، بمبئی

جذبیؔ Jazbi

پیدائش : 1912، مبارک پور، اعظم گڑھ

وفات : 2005، علی گڑھ

جراُتؔ Jur-at

پیدائش : 1748/49، دہلی

وفات : 1809/10، لکھنؤ

جعفر علی حسرت — **Jafar Ali Hasrat**

پیدائش : 1734/35، دہلی

وفات : 1785/86، لکھنؤ

جگر مرادآبادی — **Jigar Muradabadi**

پیدائش : 1890، مرادآباد

وفات : 1960، گونڈہ

جلال لکھنوی — **Jalal Lakhnavi**

پیدائش : 1830/31، لکھنؤ

وفات : 1909، لکھنؤ

جمیل مظہری — **Jameel Mazhari**

پیدائش : 1904، پٹنہ

وفات : 1979/80، بھیکن پور

جوشؔ ملیح آبادی — **Josh Maleehabadi**

پیدائش : 1896/98، ملیح آباد

وفات : 1982، اسلام آباد (پاکستان)

جوگندر پال — **Jogender Pal**

پیدائش : 1925، سیالکوٹ، پاکستان

وفات : 2016، دہلی

جیلانی بانو — **Jeelani Bano**

پیدائش : 1936، بدایوں

چ

چکبست لکھنوی — **Chakbast Lakhnavi**

پیدائش : 1882، فیض آباد

وفات : 1926، رائے بریلی

ح

حاتمؔ — **Hatim**

پیدائش : 1699، دہلی

وفات : 1783، دہلی

حالیؔ، الطاف حسین — **Hali, Altaf Husain**

پیدائش : 1837، پانی پت

وفات : 1914/15، پانی پت

حامدی کاشمیری — **Hamidi Kashmiri**

پیدائش : 1932، بہوری کدال، سری نگر

وفات : 2018، سری نگر

حبیب تنویر — **Habeeb Tanveer**

پیدائش : 1923، رائے پور، چھتیس گڑھ

وفات : 2009، بھوپال

Hasrat Mohani حسرت موہانی

پیدائش : 1880/81، موہان، اناؤ

وفات : 1951، لکھنؤ

Hasan Askari حسن عسکری

پیدائش : 1919، سرادہ، میرٹھ

وفات : 1978، کراچی، پاکستان

Haneef Naqvi حنیف نقوی

پیدائش : 1936، سہسوان (اترپردیش)

وفات : 2012، سہسوان (اترپردیش)

Hafeez Jalandhari حفیظ جالندھری

پیدائش : 1900، جالندھر

وفات : 1982، لاہور، پاکستان

Hayatullah Ansari حیات اللہ انصاری

پیدائش : 1911، لکھنؤ

وفات : 1999

Haideri,Hyder bakhsh حیدری، حیدر بخش

پیدائش : 1768/69، دہلی

وفات : 1813/14، بنارس

خ

Khadeeja Mastoor خدیجہ مستور

پیدائش : 1927، لکھنؤ

وفات : 1982، لاہور، پاکستان

Khaleeq Anjum خلیق انجم

پیدائش : 1935، دہلی

وفات : 2016، دہلی

Khaleelur Rehman Azami خلیل الرحمٰن اعظمی

پیدائش : 1927، سرائے میر، اعظم گڑھ

وفات : 1978، علی گڑھ

Khwaja Ahmed Abbas خواجہ احمد عباس

پیدائش : 1914، پانی پت

وفات : 1987، ممبئی

Khwaja Banda Nawaz Gesu Daraaz خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

پیدائش : 1321، دکن، گلبرگہ

وفات : 1422، دکن، گلبرگہ

Khwaja Ghulamus Syedain خواجہ غلام السیدین

پیدائش : 1904، پانی پت

وفات : 1971، نئی دہلی

Khursheed-ul-Islam خورشید الاسلام

پیدائش : 1919، امری، بجنور

وفات : 2006/07، علی گڑھ

د

Dagh Dehlvi داغ دہلوی

پیدائش : 1831، دہلی

وفات : 1905، حیدرآباد

Dard Dehlvi درد دہلوی

پیدائش : 1721، دہلی

وفات : 1785، دہلی

Dilawar Figar دلاور فگار

پیدائش : 1928، بدایوں

وفات : 1991، کراچی، پاکستان

ڈ

Deputy Nazeer Ahmad ڈپٹی نذیر احمد

پیدائش : 1836، ریہڑ، بجنور

وفات : 1912، دہلی

ذ

Zakir Hussain Khan ذاکر حسین خاں

پیدائش : 1897، حیدرآباد

وفات : 1969، دہلی

Zauq Shaikh Mohd. Ibrahim ذوق، شیخ محمد ابراہیم

پیدائش : 1788/90، دہلی

وفات : 1854، دہلی

ر

Rajender Singh Bedi راجندر سنگھ بیدی

پیدائش : 1915، لاہور، پاکستان

وفات : 1984، ممبئی

Rashidul Khairi راشد الخیری

پیدائش : 1868، دہلی

وفات : 1936، دہلی

Ratan Singh رتن سنگھ

پیدائش : 1927، سیالکوٹ، پاکستان

Rajab Ali Beg Suroor رجب علی بیگ سرور

پیدائش : 1786، لکھنؤ

وفات : 1869، بنارس

رسؔوا، مرزا محمد ہادی **Ruswa, Mirza Mohd.Hadi**

پیدائش : 1857/58، لکھنؤ

وفات : 1931، حیدرآباد

رشید احمد صدیقی **Rasheed Ahmad Siddiqi**

پیدائش : 1892/96، مریاہو، جونپور

وفات : 1977، علی گڑھ

رشید حسن خاں **Rasheed Hasan Khan**

پیدائش : 1925/30، شاہجہاں پور

وفات : 2006

رضا نقوی واہی **Raza,Naqvi Wahi**

پیدائش : 1939، امروہہ

وفات : 2002

رفیق حسین **Rafeeq Hussain**

پیدائش : 1894/5، لکھنؤ

وفات : 1946، پٹنہ

رنگین، سعادت یار خاں **Rangeen, Saadat Yar Khan**

پیدائش : 1758/63، سرہند

وفات : 1834/35، دہلی

رواںؔ، اناّوی **Rawaan, Unnavi**

پیدائش : 1889، سیتاپور (یوپی)

وفات : 1934، اُنّاؤ

ریاض خیرآبادی **Riyaz Khairabadi**

پیدائش : 1852/53، خیرآباد

وفات : 1934، خیرآباد

ز

زبیر رضوی **Zubair Rizwi**

پیدائش : 1936، امروہہ

وفات : 2016، دہلی

زٹلی، محمد جعفر **Zatalli, Mohd. Jafar**

پیدائش : 1659، نارنول

وفات : 1713

زیب غوری **Zaib Ghauri**

پیدائش : 1926، کانپور

وفات : 1985، کراچی، پاکستان

س

ساحر لدھیانوی **Sahir Ludhyanvi**

پیدائش : 1921، لدھیانہ

وفات : 1980، ممبئی

Satyarthi, Devendra ستیارتھی، دیویندر

پیدائش : 1908/26، بدھوڑ (پٹیالہ)

وفات : 2003، دہلی

Sarshar, Pandit Ratan Nath

سرشار، پنڈت رتن ناتھ

پیدائش : 1846، لکھنؤ

وفات : 1902/03، حیدرآباد

Sajjad Ansari سجاد انصاری

پیدائش : 1884، بارہ بنکی

Suroor Jahanabadi سرور جہاں آبادی

پیدائش : 1873، پیلی بھیت

وفات : 1910، جہاں آباد

Sajjad Zaheer سجاد ظہیر

پیدائش : 1905، مچھلی شہر ضلع جونپور

وفات : 1973، نئی دہلی

Surender Prakash سریندر پرکاش

پیدائش : 1930، لائل پور

وفات : 2001/2002، ممبئی

Sudarshan, Badri Nath سدرشن، بدری ناتھ

پیدائش : 1896، سیالکوٹ، پاکستان

وفات : 1967، ممبئی

Sultan Haider Josh سلطان حیدر جوشؔ

پیدائش : 1886، بدایوں

وفات : 1953، دہلی

Siraj Aurangabadi سراج اورنگ آبادی

پیدائش : 1712، اورنگ آباد

وفات : 1764، اورنگ آباد

Salam Machli Shehri سلامؔ مچھلی شہری

پیدائش : 1921، مچھلی شہر

وفات : 1973

Sir Syed, Ahmed Khan سرسیّد، احمد خاں

پیدائش : 1817، دہلی

وفات : 1898، علی گڑھ

Sauda, Mirza Mohd. Rafi سوداؔ، مرزا محمد رفیع

پیدائش : 1706/07، دہلی

وفات : 1780/81، لکھنؤ

سوزؔ، میر Soz, Meer

پیدائش : 1721، دہلی

وفات : 1798/99، شاہجہاں پور

سہیل عظیم آبادی Suhail Azimabadi

پیدائش : 1911، پٹنہ

وفات : 1979، الہ آباد

سید سلیمان ندوی Syed Sulaiman Nadvi

پیدائش : 1884، دسنہ (بہار)

وفات : 1953، کراچی، پاکستان

سید ضمیر جعفری Syed Zameer Jafri

پیدائش : 1916، جہلم، پاکستان

وفات : 1999، اسلام آباد، پاکستان

سید عابد حسین Syed Abid Hussain

پیدائش : 1896، بھوپال

وفات : 1978، نئی دہلی

سید محمد جعفری Syed Mohd. Jaafri

پیدائش : 1907، پہرسر (بھرت پور)

وفات : 1976، کراچی، پاکستان

سیماب اکبرآبادی Seemab Akbarabadi

پیدائش : 1880/82، آگرہ

وفات : 1951، کراچی، پاکستان

ش

شاد عارفی Shad Arifi

پیدائش : 1900/03، لوہارو

وفات : 1964، رام پور

شادؔ عظیم آبادی Shad Azimabadi

پیدائش : 1846، پٹنہ

وفات : 1927، پٹنہ

شاکر ناجی Shakir Naji
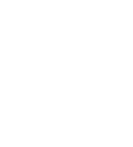
پیدائش : 1690، دہلی

وفات : 1747، دہلی

شان الحق حقّی Shanul Haq Haqqi

پیدائش : 1917، دہلی

وفات : 2005، کناڈا

شاہ امین الدین اعلیٰ Shah Aminuddin Ala

پیدائش : 1599، دکن

وفات : 1674

شاہ عالم ثانی **Shah Alam Sani**

پیدائش : 1727/28، دہلی

وفات : 1806، دہلی

شاہ نصیر **Shah Naseer**

پیدائش : 1760-61

وفات : 1838، حیدرآباد

شبلی نعمانی **Shibli Naumani**

پیدائش : 1857، بندَوَل (اعظم گڑھ)

وفات : 1914، اعظم گڑھ

شرر، عبدالحلیم **Sharar, Abdul Haleem**

پیدائش : 1860، لکھنؤ

وفات : 1926، لکھنؤ

شفیع الدین نیّر **Shafiuddin Nayyar**

پیدائش : 1903، اترولی، ضلع علی گڑھ

وفات : 1978، نئی دہلی

شفیع جاوید **Shafi Javed**

پیدائش : 1935، مظفر پور، بہار

شفیق فاطمہ شعریٰ **Shafiq Fatima Shera**

پیدائش : 1930، ناگپور

وفات : 2012

شمس الرحمٰن فاروقی **Shamsur Rehman Farooqi**

پیدائش : 1935، پرتاپ گڑھ

شمیم حنفی **Shameem Hanfi**

پیدائش : 1939، سلطان پور، اتر پردیش

شوکت تھانوی **Shaukat Thanvi**

پیدائش : 1904/05، بندرابن (متھرا)

وفات : 1963، لاہور

شوق مرزا **Shauq, Mirza**

پیدائش : 1782، لکھنؤ

وفات : 1871، لکھنؤ

Shahriyar, Kunwar Akhlaq Mohd. Khan

شہریار، کنور اخلاق محمد خان

پیدائش : 1936، آنولہ، بریلی

وفات : 2012، علی گڑھ

شیفتہ وحسرتی — **Shefta and Hasrati**

پیدائش : 1806، دہلی

وفات : 1869، دہلی

ص

صالحہ عابد حسین — **Saliha Abid Hussain**

پیدائش : 1913، پانی پت

وفات : 1988، نئی دہلی

ض

ضیا جالندھری — **Zia Jalendhari**

پیدائش : 1923، جالندھر، پاکستان

وفات : 2012، اسلام آباد، پاکستان

ظ

ظریف لکھنوی — **Zareef Lakhnavi**

پیدائش : 1870، لکھنؤ

وفات : 1937، لکھنؤ

ظفر اقبال — **Zafar Iqbal**

پیدائش : 1933، اوکاڑہ، مغربی پنجاب

ع

عادل منصوری — **Adil Mansoori**

پیدائش : 1936، احمد آباد، گجرات

وفات : 2008، امریکہ

عبدالحق، مولوی — **Abdul Haq, Maulavi**

پیدائش : 1870 ہاپوڑ

وفات : 1961، کراچی، پاکستان

عبدالعلیم — **Abdul Aleem**

پیدائش : 1905، غازی پور

وفات : 1976، نئی دہلی

عبدالغفار قاضی — **Abdul Ghaffar Qazi**

پیدائش : 1889/90، مرادآباد

وفات : 1956، علی گڑھ

عبدالقوی دسنوی — **Abdul Qavi Desnavi**

پیدائش : 1930، دسنہ، بہار

وفات : 2011، بھوپال

عبدالماجد دریابادی — **Abdul Majid Dariyabadi**

پیدائش : 1892، دریاباد

وفات : 1977، لکھنؤ

عتیق اللہ **Ateequllah**

پیدائش : 1942، اُجّین

عزیز احمد **Aziz Ahmad**

پیدائش : 1914، حیدرآباد

وفات : 1978، کناڈا

عصمت چغتائی **Ismat Chughtai**

پیدائش : 1915، جودھ پور، راجستھان

وفات : 1991، ممبئی

عظیم بیگ چغتائی **Azeem Beg Chughtai**

پیدائش : 1895، آگرہ

وفات : 1941، جودھپور

علامہ محمد اقبال **Allama Iqbal**

پیدائش : 1873/77، سیالکوٹ

وفات : 1938، لاہور، پاکستان

علی سردار جعفری **Ali Sardar Jafri**

پیدائش : 1913، بلرامپور

وفات : 2000، ممبئی

علی عادل شاہ ثانی شاہی **Ali Adil Shah Saani Shahi**

پیدائش : 1628، دکن

وفات : 1762

علی عباس حسینی **Ali Abbas Husaini**

پیدائش : 1897، بارہ، غازی پور

وفات : 1969، لکھنؤ

عمیق حنفی **Ameeq Hanfi**

پیدائش : 1928/29، مہو چھاؤنی، اندور

وفات : 1988، دہلی

عیسوی خاں **Isvi Khan**

پیدائش :

وفات : 1750، دہلی

غ

Ghalib, Mirza Mohd. Asadullah Khan

غالبؔ، مرزا محمد اسداللہ خان

پیدائش : 1797، آگرہ

وفات : 1869، دہلی

غیاث احمد گدّی **Ghayas Ahmad Gaddi**

پیدائش : 1928، جھریا، دھنباد

وفات : 1986

ف

فانی بدایونی **Fani Badayuni**

پیدائش : 1879، اسلام نگر، بدایوں

وفات : 1941، حیدرآباد

فائز دہلوی **Faiz Dehlvi**

پیدائش : 1690/91، دہلی

وفات : 1738، دہلی

فراق گورکھپوری **Firaq Gorakhpuri**

پیدائش : 1896، گورکھپور

وفات : 1982، نئی دہلی

فرحت اللہ بیگ **Farhatullah Beg**

پیدائش : 1883/84، دہلی

وفات : 1946/47، حیدرآباد

فرقت کاکوروی **Furqat Kakorvi**

پیدائش : 1910/14، لکھنؤ

وفات : 1973، بنارس

فضلِ حق خیرآبادی **Fazle Haq Khairabadi**

پیدائش : 1797، خیرآباد

وفات : 1861، انڈمان، پورٹ بلیئر

فغاںؔ **Fughan**

پیدائش : 1725-26

وفات : 1772-73، دہلی

فیض احمد فیض **Faiz Ahmed Faiz**

پیدائش : 1911، سیالکوٹ

وفات : 1984، لاہور

ق

قاضی عبدالستار **Qazi Abdus-sattar**

پیدائش : 1930/33، مچھرہٹا، سیتاپور

وفات : 2018، علی گڑھ

قاضی سلیم **Qazi Saleem**

پیدائش : 1927، اورنگ آباد، مہاراشٹر

وفات : 2005

قاضی عبدالودود **Qazi Abdul Wadood**

پیدائش : 1896، کاکو، گیا (بہار)

وفات : 1984، پٹنہ

قائم **Qaim**

پیدائش : 1722/25، چاندپور، بجنور

وفات : 1793/94، رام پور

قرۃ العین حیدر **Qurratul Ain Haider**

پیدائش : 1926/27، علی گڑھ

وفات : 2007، دہلی

قلی قطب شاہ **Quli Qutub Shah**

پیدائش : 1565، دکن

وفات : 1611

قمر رئیس **Qamar Rais**

پیدائش : 1932، شاہجہاں پور

وفات : 2009، دہلی

قیوم نظر **Qayyum Nazar**

پیدائش : 1914، لاہور، پاکستان

وفات : 1989، لاہور، پاکستان

کرشن چندر **Krishan Chandra**

پیدائش : 1914، وزیر آباد، پاکستان

وفات : 1977، ممبئی

کلیم الدین احمد **Kaleemuddin Ahmad**

پیدائش : 1908/09، پٹنہ

وفات : 1983، پٹنہ

کمار پاشی **Kumar Pashi**

پیدائش : 1935، بہاولپور

وفات : 1992

کنھیا لال کپور **Kanhayya Lal Kapoor**

پیدائش : 1910، لائل پور (پنجاب)

وفات : 1980، پونہ

کیفی اعظمی **Kaifi Aazmi**

پیدائش : 1918/24، مجھواں، اعظم گڑھ

وفات : 2002، ممبئی

گ

گلکرسٹ، جان **Gilchrist, John**

پیدائش : 1789، اڈنبرا

وفات : 1841، پیرس

گوپی چند نارنگ **Gopi Chand Narang**

پیدائش : 1931، دُکی، بلوچستان

گیان چند جین **Gyan Chand Jain**

پیدائش : 1923، سیوہارہ، بجنور

وفات : 2007، کیلی فورنیا، امریکہ

ل

Lam. Ahmad Akbarabadi **ل۔احمداکبرآبادی**

پیدائش : 1885، آگرہ

وفات : 1980، آگرہ

م

Maalik Ram **مالک رام**

پیدائش : 1906،پھالیہ،ضلع گجرات(پاکستان)

وفات : 1993، دہلی

Majaz, Asrarul Haque **مجازؔ، اسرارالحق**

پیدائش : 1911، ردولی، بارہ بنکی

وفات : 1955، لکھنؤ

Majrooh Sultanpuri **مجروح سلطان پوری**

پیدائش : 1915، اعظم گڑھ

وفات : 2000، ممبئی

Majnoo Gorakhpuri **مجنوںؔ گورکھپوری**

پیدائش : 1904، پلڈہ، بستی

وفات : 1988، کراچی، پاکستان

Mujtaba Hussain **مجتبیٰ حسین**

پیدائش : 1936، گلبرگہ

Mohsinul Mulk **محسن الملک**

پیدائش : 1817/37، اٹاوہ

وفات : 1907، علی گڑھ

Mohsin Kakorvi **محسن کاکوروی**

پیدائش : 1826/27، کاکوروی

وفات : 1905، مین پوری

Mohammad Hasan **محمد حسن**

پیدائش : 1925/26، مرادآباد

وفات : 2010، دہلی

Mohd. Hussain Azad **محمد حسین آزادؔ**

پیدائش : 1830، دہلی

وفات : 1910، لاہور

Mohd. Azmatullah Khan **محمد عظمت اللہ خاں**

پیدائش : 1887، دہلی

وفات : 1927، حیدرآباد

Mohammad Mujeeb **محمد مجیب**

پیدائش : 1902، بہلول گڑھی، بارہ بنکی

وفات : 1985، نئی دہلی

Mehmood Sheerani

پیدائش : 1880، ٹونک (راجستھان)

وفات : 1946، ٹونک

محمد علوی — **Mohd Alvi**

پیدائش : 1927، احمد آباد، گجرات

وفات : 2018

پیدائش : 1917، لائل پور (پنجاب)

وفات : 1972، پونہ

مخدوم محی الدین — **Makhdoom Mohiuddin**

پیدائش : 1908، سنگاریڈی، آندھرا پردیش

وفات : 1969، حیدرآباد

مرزا دبیر — **Mirza Dabeer**

پیدائش : 1803، دہلی

وفات : 1875، لکھنؤ

مشتاق احمد یوسفی — **Mushtaq Ahmad Yusufi**

پیدائش : 1925، راجستھان

وفات : 2018، کراچی، پاکستان

Mushafi

پیدائش : 1747/50، امروہہ

وفات : 1824/25، لکھنؤ

مضمون — **Mazmun**

پیدائش : 1689، اکبرآباد، آگرہ

وفات : 1734/35

مظفر حنفی — **Muzaffar Hanfi**

پیدائش : 1936، کھنڈوہ (مدھیہ پردیش)

مظہر علی خاں ولا — **Mazhar Ali Khan Wala**

پیدائش : دہلی

مظہر امام — **Mazhar Imam**

پیدائش : 1928، مونگیر، بہار

وفات : 2012، دہلی

مظہر جانِ جاناں — **Mazhar Jane Jana**

پیدائش : 1699/1700، کالاباغ

وفات : 1781، دہلی

ملّا رموزی **Mullah Rumoozi**

پیدائش : 1896/99، بھوپال

وفات : 1952، بھوپال

ملّا وجہی **Mulla Wajhi**

پیدائش : 1562

وفات : 1659

ممتاز شیریں **Mumtaz Sheereen**

پیدائش : 1924، میسور

وفات : 1973، اسلام آباد، پاکستان

ممتاز حسین **Mumtaz Hussain**

پیدائش : 1918، غازی پور

وفات : 1992

منٹو **Manto**

پیدائش : 1912، سرالہ، لدھیانہ

وفات : 1955، لاہور، پاکستان

مولانا ابوالکلام آزاد **Maulana Abul Kalam Azad**

پیدائش : 1888، مکہ

وفات : 1958، دہلی

مولانا امتیاز علی خان عرشی **Maulana Imtiyaz Ali Khan Arshi**

پیدائش : 1904، رامپور

وفات : 1981، رامپور

مولوی ذکاء اللہ **Maulvi Zakaullah**

پیدائش : 1832، دہلی

وفات : 1910، دہلی

مؤمن **Momin**

پیدائش : 1800/01، دہلی

وفات : 1852، دہلی

مہدی افادی **Mehdi Afadi**

پیدائش : 1868/70، گورکھپور

وفات : 1921، لکھنؤ

میر امّن **Meer Amman**

پیدائش : 1750، دہلی

وفات : 1837

میرا جی، ثناء اللہ خاں ڈار **Miraji, Sanaullah Khan Dar**

پیدائش : 1912، لاہور، پاکستان

وفات : 1949، ممبئی

میرانیس Meer Anees

پیدائش : 1802/03، فیض آباد

وفات : 1874، لکھنؤ

میراں جی شمس العشاق Miraji Shamsul Ushaaq

پیدائش : 1407، دکن

وفات : 1496

میر تقی Meer Taqi

پیدائش : 1723/24، اکبرآباد (آگرہ)

وفات : 1810، لکھنؤ

میر شیر علی افسوس Meer Sher Ali Afsos

پیدائش : 1732

وفات : 1809

میر حسن Meer Hasan

پیدائش : 1740/41، دہلی

وفات : 1786، لکھنؤ

میر ناصر علی Meer Nasir Ali

پیدائش : 1847، دہلی

وفات : 1933، دہلی

ن

ناسخ Nasikh

پیدائش : 1772/76، فیض آباد

وفات : 1838، لکھنؤ

ناصر کاظمی Nasir Kazmi

پیدائش : 1925، انبالہ، پنجاب

وفات : 1972/74، لاہور

نسیم Naseem

پیدائش : 1811، لکھنؤ

وفات : 1845، لکھنؤ

نصیر الدین ہاشمی Naseeruddin Hashmi

پیدائش : 1895، حیدرآباد

وفات : 1964

نظم طباطبائی، سید علی حیدر Nazam Tabatabai, Syed Ali Haider

پیدائش : 1852/53، لکھنؤ

وفات : 1933، حیدرآباد

نظیر اکبرآبادی Nazeer Akbarabadi

پیدائش : 1735/40، دہلی

وفات : 1830، آگرہ

نیاز فتح پوری Niyaz Fateh Puri

پیدائش : 1884، فتح پور

وفات : 1966، کراچی، پاکستان

ن۔م۔راشد N.M. Rashid

پیدائش : 1910، علی پور جٹھ، گوجرانوالہ

وفات : 1975، برطانیہ

و

وارث علوی Waris Alvi

پیدائش : 1928، احمد آباد

وفات : 2014، احمد آباد

وامق جون پوری Wamiq Jaunpuri

پیدائش : 1912/13

وفات : 1998

وحیدالدین سلیمؔ Waheeduddin Saleem

پیدائش : 1869، پانی پت

وفات : 1928، ملیح آباد

وزیر آغا Wazeer Agha

پیدائش : 1922، وزیرکوٹ، ضلع سرگودھا

وفات : 2010

وہاب اشرفی Wahab Ashrafi

پیدائش : 1936، بی بی پور (کاکو، ضلع گیا، بہار)

وفات : 2012

ولی دکنی Wali Dakni

پیدائش : 1668، اورنگ آباد

وفات : 1707، احمد آباد

ہ

ہاجرہ مسرور Haajra Masroor

پیدائش : 1929، لکھنؤ

وفات : 2012

ی

یقین Yaqeen

پیدائش : 1727، دہلی

وفات : 1755، دہلی

یکرنگؔ Yakrang

پیدائش :

وفات : 1737/49

یگانہ چنگیزی Yagana Changezi

پیدائش : 1883/84، عظیم آباد، پٹنہ

وفات : 1956، لکھنؤ

یلدرمؔ Yaldaram

پیدائش : 1880/82، نہٹور (بجنور)

وفات : 1943، لکھنؤ